اسلام اور مستشرقین

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

دار المصنفین ، شبلی اکیڈمی ، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)

اسلام اور مستشرقین

جلد چہارم

اسلام اور شارع اسلام علیہ السلام و تاریخِ اسلام پر مستشرقین
کے اعتراضات کے جواب میں مولانا شبلیؒ نے جو مستقل مضامین
لکھے ہیں اور اپنی بعض تصانیف میں جا بہ جا جو کچھ لکھا ہے،
وہ اس میں مرتب طور پر جمع کر دیا گیا ہے۔

مرتبہ
مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم
(سابق رفیق دارالمصنفین)

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ یوپی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۱۵۵

کتاب : اسلام اور مستشرقین جلد چہارم

مصنف : عبدالرحمن پرواز اصلاحی

صفحات : ۲۹۸

طبع جدید : نومبر ۲۰۰۳ء

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین جلد چہارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلمان ندویؒ کی ''حیاتِ شبلیؒ'' کا مطالعہ جن ناظرین نے کیا ہوگا، اس کے دیباچہ سے اندازہ ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے مستشرقین کا مقابلہ کس طرح کیا، اس میں یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ یورپ والوں کا جب مسلمانوں کے ملکوں پر تسلط ہوا تو انہوں نے اپنے محکوم ملکوں کی درس گاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا، تا کہ ان کو اپنے مذہبی، تمدنی، سیاسی اور قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں، جس کے بعد ان کی روح ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جاتی ہے، انہوں نے اپنی اس مطلب برآری کے لیے سب سے پہلے خود سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ مبارک کو چنا، پھر خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور سلاطین اسلام کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا، ان کی حکمرانی کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہ کیا، مولانا شبلیؒ کے زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ ڈاکٹر اسپرنگر، اور یو، پی، کے گورنر سرولیم نے ہندوستان میں یہ مہم چلا رکھی تھی، ہندوستان سے باہر ڈاکٹر جے، اے، مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھالمی، رینان، سینٹ ہلیر، نولدیکی، ولہاوسن، گولڈزیہر وغیرہ یورپ میں اس قسم کی فتنہ انگیزیوں میں مشغول تھے اور جب انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ اٹھے تو مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جس میں سب سے زیادہ بدنام ''الہلال'' کا ایڈیٹر جرجی زیدان تھا، ایسے لوگوں کا شمار اہل نظر محققوں میں کیا جاتا ہے، مگر ان کے سامنے اغراضِ فاسدہ ہوتے ہیں، جن پر وہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھالیا کرتے تھے، اور مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لیتے تھے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں کہ ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے

لیے ساری دنیائے اسلام سے جو شیر دل اسلام کی صف سے پہلے نکلا، وہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، جنہوں نے ان ہی کے طریقہ سے ان ہی کے اسلوب میں جواب دینا شروع کیا، اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فیض بخش ہواؤں نے دنیائے علم وتمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا، اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیوں کر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی۔ (حیات شبلیؒ ص ۲۵)

مولانا شبلی نے شیر دل بن کر مستشرقین کی تدلیسات، تلبیسات، تحریفات، دوراز کار قیاسات، غلط قسم کے معلومات اور غیر مستند معلومات کی پردہ دری اچھی طرح کی جیسا کہ اس مجموعہ کے مطالعہ سے ناظرین کو اندازہ ہوگا۔

مولانا نے ان مستشرقین کی قسمیں بتا کر ان سے چوکنا رہنے کی بھی تلقین کی، ان کے لکھنے کے بہ موجب ایک قسم تو وہ ہے جو عربی زبان سے بالکل ناواقف ہے، مگر اپنی فریب کارانہ ذہانت اور محنت سے دوسروں کے سرمایۂ معلومات اور تصنیفات کا سہارا لے کر اپنے میلان طبع کے مطابق اپنی تحریروں کی عمارت کھڑی کر دیتی ہے، دوسری قسم میں وہ ہیں جو عربی زبان، عربی تاریخ اور عربی فلسفہ وغیرہ سے واقف ہیں، مگر شارع اسلام ﷺ کے متعلق دیدہ دلیری سے مسلمانوں کے دلوں کو تکلیف پہنچانے کی خاطر ناروا باتیں لکھتے رہتے ہیں، اور تیسری قسم ایسے لوگوں کی ہے جن کا حال یہ ہے کہ:

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مولانا شبلی نعمانیؒ نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ یورپین مورخوں کے اعتراضات اگرچہ پادر ہوا ہوتے ہیں، اس لیے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے، لیکن بایں ہمہ جواب دینے والا مشکل میں پڑ جاتا ہے، یورپین مورخین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو غلط ہوتا ہے پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے، تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے، وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ

نمایاں ہوتا ہے، مسلسل دروغ بیانیوں اور افترا پردازیوں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے اور بہ جائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اس واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ (مضامین عالم گیر باب عالم گیر اور ہندو)

مولانا شبلیؒ نے ایسے حریفوں کے اعتراضات کے جوابات دینے میں طیش و غضب سے کام نہیں لیا، بلکہ بہت ہی ٹھنڈے طریقہ سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں ان کی تلبیسات، تدلیسات اور اعتراضات کا رد کیا ہے، جیسا کہ اس مجموعہ کے تمام مضامین سے ظاہر ہوگا۔

اس میں مولانا کی تصنیفات کے کچھ اقتباسات ہیں، اور کچھ وہ مضامین ہیں جو ان کے مقالات کے مجموعوں میں شایع ہو چکے ہیں، ان کو ایک علاحدہ جلد میں شایع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا یک جا مطالعہ کرنے سے مستشرقین کی گم راہ کن تحقیقات و استدلالات کا صحیح اندازہ ہو جایے گا، یہ تحریریں بہت پہلے لکھی گئی ہیں لیکن ان کی تازگی اور شادابی میں کوئی فرق نہیں ہوا ہے، یہ مولانا کی زبان اور طرز ادا کی خوبی ہے۔

اس مجموعہ کی ترتیب جناب مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم نے دی تھی، افسوس کہ اس کی طباعت اور اشاعت سے پہلے اللہ کو پیارے ہوگیے، ناظرین ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں، یہی ان کی اس محنت کا بڑا صلہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے آسمان سے ان کی لحد پر اپنی برکتوں کی شبنم افشانی کرتے رہیں۔ آمین!

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۱۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہارونؒ الرشید خلیفہ عباسیؒ

پر

پامر کا الزام اور اس کی تردید

یورپین مصنفین تاریخی تصنیفات میں ہمیشہ بادشاہان اسلام پر ایسے طریقہ سے حملے کرجاتے ہیں جس کی اصلی زد اسلام پر پڑتی ہے، ناواقف مؤرخین تو ایک طرف رہے، مسٹر پامر صاحب جن کی عربیت کا ہم کو بھی اعتراف ہے، اور جن کی نظم و نثر عربی و فارسی کا مجموعہ حال میں چھاپا گیا ہے، تاریخ ہارون الرشید کے صفحہ ۲۲۴ میں لکھتے ہیں کہ "اس کے بے ہودہ درباریوں نے یہ بات اس کے ذہن نشین کردی تھی، بلکہ کل پیروانِ اسلام اس بات کو اس وقت میں، اور کچھ مسلمان اب بھی سمجھتے ہیں کہ کافر کو خدا کی مخلوق ہی نہیں کہا جاسکتا"

ہم نہیں جانتے پامر صاحب کو ایسے محیط اور عام اتہام کی جرأت اپنی عامیانہ تاریخ دانی پر کیونکر ہوئی، جس تاریخ پران کو ناز ہے، وہ ہمارے سامنے موجود ہے، پامر صاحب اگر یہ بات یاد رکھتے تو اچھا ہوتا کہ جب خدا کی دنیا مسلمان فتمندوں کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی، تو جن لوگوں نے ہزاروں لاکھوں چرچ اور گرجوں کی حفاظت کا قطعی معاہدہ لکھ دیا، وہ خلفائے راشدین تھے، جو ہر زمانہ میں مسلمانوں کے رہنمائے کل مانے گئے ہیں، کیا عمرؒ بن عبدالعزیز جنہوں نے دمشق کے عامل کو فرمان بھیجا کہ ولید نے گرجے کو توڑ کر مسجد میں جو اضافہ کرلیا تھا، وہ ڈھا دیا جائے، اور عیسائیوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہاں پھر اپنا گرجا بنالیں، (فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۲۵) عمر ثانی تسلیم نہیں کیے گئے ہیں؟ اور کیا وہ لاکھوں کروروں مسلمانوں کے جائز قائم مقام نہ تھے؟ کیا خاص دولت عباسیہ کے عہد میں

دارالخلافت بغداد میں سیکڑوں ہزاروں عالیشان نئے گرجے نہیں تعمیر ہوئے، جہاں نہایت آزادی سے ہر ایک قسم کی مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں؟ ہم پامر صاحب کے ہم خیال مصنفین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر ان کو شبہ ہو تو دیر الروم، دیر اشمونی، دیر الثعالب، دیر درشا، دیر دتاس، دیر سمالو، دیر عذاری، دیر العاصیہ، دیر الزربقیہ، دیر آندرود کے حالات معجم البلدان میں پڑھیں، عضدالدولہ دیلمی کہ دیلمی خاندان کا سرتاج اور خلافت بغداد کی قسمت کا مالک تھا۔ اس کا وزیر اعظم نصر بن ہارون ایک عیسائی رئیس زادہ تھا۔ اسی نے عضدالدولہ کی خاص اجازت سے تمام ممالک اسلامی میں چرچ اور گرجے تعمیر کرائے۔ (روضۃ الصفا و حبیب السیر ذکر سلطنت عضدالدولہ)

بے شبہ مسلمانوں میں ایسے بھی تنگ دل لوگ گذرے ہیں، جو دوسرے مذہبوں کی آزادی کو صدمہ پہنچاتے تھے لیکن یہ شخصی حالتیں ہیں، اور ان سے عام رائے کا اندازہ نہیں ہو سکتا، ہم کو معلوم ہے کہ علی بن سلیمان گورنر مصر نے مصر کے تمام گرجے ڈھا دیئے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ہم اس سے بھی واقف ہیں، کہ عیسیٰ بن موسیٰ نے جو خاندان عباسی سے تھا اور ۱۷۱ھ میں مصر کا گورنر مقرر ہوا، خاص سرکاری خزانہ سے کل گرجے نئے سرے سے تعمیر کرائے۔ (دیکھو نجوم ظاہرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ واقعات ۱۷۱ھ)

مسلمانوں کی حکومت میں دوسرے مذہب والوں کو جو ملکی عہدے ملتے رہے ہیں، کون گورنمنٹ اس سے بڑھ کر دے سکتی ہے، تاریخ ابن خلکان و فوات الوفیات میں ہم بہت سے یہودی اور عیسائیوں کے نام پاتے ہیں، جو مختلف وقتوں میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ممتاز رہے ہیں، آغاز اسلام سے عبدالملک بن مروان کی سلطنت تک شام و عراق کا دفتر رومی و فارسی زبان میں رہا، اور اتنی وسیع مدت تک خراج کے محکمہ میں عموماً دوسری ہی قومیں سیاہ و سپید کی مالک تھیں، اکبر و جہانگیر کی فیاضیوں کو تو ہندوستان کا ایک ایک بچہ جانتا ہے، عام میل جول کے لحاظ سے دیکھو تو تاریخ کے ہر صفحہ میں مسلمانوں کی بے تعصبی کی شہادت ملے گی، سیکڑوں عیسائی اور یہودی علماء، جو عباسیوں کے دربار میں تھے، ان سے خلفاء کس بے تکلفی اور یگانگت سے ملتے تھے، جبریل جو ایک عیسائی فاضل تھا، اس کو ہارون الرشید نے علاوہ بے انتہا جاگیروں اور صلوں کے یہ عزت دی تھی کہ دربار میں جو شخص

کوئی حاجت پیش کرنی چاہتا تھا، اس کو پہلے جبریل کی خدمت میں باضابطہ حاضر ہونا پڑتا تھا، اس کا بیٹا بختیشوع جاہ و منزلت کے اس پایہ تک پہونچا کہ لباس و آرایش میں خلیفہ متوکل باللہ کا ہمسر گنا جاتا تھا، (طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعۃ جبریل اور بختیشوع کے حالات میں پڑھو) خلیفہ المعتصم باللہ حکیم سلمویہ کی بیماری میں خود عیادت کو جاتا تھا، اور جب اس نے انتقال کیا، تو ایک دن کھانا نہیں کھایا، اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ دارالخلافۃ میں لاکر رکھا جائے، اور اس کے عزیز بخور و شمع کے ساتھ عیسائیوں کے طریقے کے موافق اس پر نماز پڑھیں،

خلیفہ معتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء، امراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے، صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو جو ایک صابی المذہب عالم تھا بیٹھنے کی اجازت تھی، ایک دن معتضد باللہ اور ثابت بن قرہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہے تھے، کہ دفعۃً معتضد نے ہاتھ کھینچ لیا، ثابت ڈر گیا، معتضد نے کہا، ڈرو نہیں، میرا ہاتھ اوپر تھا، میں نے گستاخی پسند نہ کی، اہل علم کا ہاتھ اوپر چاہیے، ابتدا میں مسلمانوں نے ان ہی قوموں سے علوم و فنون سیکھے، اور جب خود استادی کے رتبہ پر پہنچے تو کس سیر چشمی اور فیاضی سے ان کو علوم و فنون کی تعلیم دے کر شاگردی کا حق ادا کیا، ان کا باہمی اخلاص اور آپس کی دوستانہ گرمجوشیاں آج بھی تعجب کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، علامہ شریف الرضی نے جو مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے کے پیشوائے مذہبی ہیں، ابو اسحٰق صابی کا ایسا حیرت انگیز مرثیہ لکھا کہ اس کا ہم مذہب اور نہایت دلی دوست بھی لکھتا تو اس سے زیادہ دردانگیز اور پُراثر نہ لکھ سکتا، اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ علامہ موصوف جب کبھی ابو اسحٰق صابی کے مزار کی طرف گذرتے تھے تو ہمیشہ اس کی تعظیم کے لیے سواری سے اتر پڑتے تھے، اور اس کی قبر کے سامنے سے پیادہ پا گذرتے تھے، (نامۂ دانشوران ناصری تذکرہ ابو اسحٰق صابی)

(المامون حاشیہ میں صفحہ ۱۵۹ سے صفحہ ۱۶۲ تک)

تراجم

مسلمانوں کو آج کل غیر قوموں سے جو اجتناب ہے، اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے تمام مفید علوم و فنون سے محروم ہیں، اس کے لحاظ سے حقیقت میں مشکل سے قیاس کیا جا سکتا ہے، کہ انہوں نے کسی زمانہ میں غیر زبانوں سے کچھ فائدہ اٹھایا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا، اور اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے۔ چونکہ اس واقعہ سے یورپ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے عیسائی مؤرخوں نے اس امر کی نسبت بہت بحثیں کی ہیں کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں غیر زبانوں پر اس قدر کیوں توجہ کی تھی؟ اور اورینٹل کانفرنس میں ایک فرنچ مضمون نگار نے اس بحث پر ایک آرٹیکل پیش کیا تھا، نوفل آفندی نے جو بیروت کا ایک عیسائی مؤرخ ہے، اور جس نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر صناجۃ الطرب نام ایک مستقل کتاب لکھی ہے، مسلمانوں کی علمی ترقی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

"یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ اہلِ عرب جو ہر قدم پر تہذیب و تمدن کو برباد کرتے جاتے تھے، جنھوں نے حضرت عمرؓ کے اشارے سے اسکندریہ کے کتب خانہ کو برباد کیا، جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے فارس کے علوم و فنون تباہ کر دیئے، جن کے علمِ فتح کے نصب ہوتے ہی انطاکیہ و بیروت کے مدرسے فنا ہو گئے، جنھوں نے ۱۰۱ھ میں دمشق کا کالج برباد کر دیا۔ جنھوں نے مصر کی مشہور یادگاروں اہرام اور ابوالہول کو مٹا دینا چاہا، ان کو غیر قوموں کے علوم و فنون پر کیونکر توجہ ہوئی؟

مصنف مذکور اس عقدہ کو اس طرح حل کرتا ہے، کہ اہل عرب زمانۂ جاہلیت سے نجوم اور پیشین گوئیوں کے معتقد تھے، خلفاء کے دربار میں جو عیسائی اور یہودی طبیب ملازم تھے، انہوں نے خلفاء کو یقین دلایا کہ اگر یونان وغیرہ کی کتابیں ترجمہ ہو جائیں تو علم نجوم کے ذریعہ سے بہت سی باتیں جو پردۂ غیب میں ہیں معلوم ہو جائیں گی، یہ شوق تھا جس نے اہل عرب کو غیر زبانوں کے ترجمہ پر مائل کیا۔"

اس موقع پر ہم مورخ مذکور کی ان پیہم افتراؤں سے بحث نہیں کرتے جس کا اس نے اس موقع پر مینہ برسادیا ہے، البتہ اصل مسئلہ غور کے قابل ہے، اور ہم اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ تعصب اور تنگ حوصلگی سے اس قسم کے قیاسات پیدا کرنے بعید نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جب مسلمان تھے، تو انھوں نے کبھی غیر قوموں اور غیر زبانوں سے کسی قسم کا تعصب نہیں ظاہر کیا، اوروں کا تو کیا ذکر ہے، خود شارع علیہ السلام نے غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند فرمائیں، اور اختیار کیں، جنگ احزاب میں حضرت سلمانؓ فارسی نے جب ایران کے طریقہ کے موافق خندق کھودنے اور طائف کے محاصرہ میں منجنیق کے استعمال کرنے کا مشورہ دیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تکلف منظور فرمایا، اور اس پر عمل کیا، ملکی انتظامات میں بھی آپؐ نے غیر قوموں کے اصول و آئین پسند فرمائے، اور اختیار کیے، شاہ ولی اللہ صاحب جن سے بڑھ کر محدث اور اسرار شریعت کا نکتہ شناس کون ہوگا؟ تحریر فرماتے ہیں کہ وکان قباد و ابنہ نوشیروان وضعا علیہم الخراج و العشر فجاء الشرع بنحو من ذالک[1] یعنی قباد اور اس کے بیٹے نوشیروان نے لوگوں پر خراج اور عشر لگایا تھا، تو شریعت اسلامی نے بھی اس کے قریب قریب حکم دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہودیوں سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی اس لیے آپؐ نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا، اور انھوں نے عبرانی زبان سیکھ لی،[2] حضرت زیدؓ نے اسی قسم کی ضرورتوں سے سریانی زبان بھی سیکھ لی تھی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب فتوحات کو نہایت ترقی ہوئی تو ولید بن ہشام نے کہا کہ میں نے شام کے سلاطین کو دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج اور خزانہ کا جداگانہ دفتر مرتب رہتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی اصول کے موافق

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۱۱، [2] فتوح البلدان ص۴۷۹ و ص۴۸۰۔

فوج اور خزانہ کا دفتر قائم کیا، یہاں تک کہ نام بھی وہی عجمی یعنی دیوان رکھا، جو بعینہٖ فارسی لفظ ہے، صحابہؓ میں سے بہتوں نے فارسی زبان سیکھ لی تھی، چنانچہ ہرمزان جو عجم کا ایک رئیس تھا، جب حضرت عمرؓ کے دربار میں آیا تو مغیرہ نے فارسی میں اس سے سوال وجواب کیے[1]

غرض یہ امر محتاجِ شہادت نہیں کہ قرن اول کے مسلمانوں نے جب موقع اور ضرورت ہوئی، تو معاشرت اور تمدن کے متعلق بے تکلف غیر قوموں کے اصول اور آئین اختیار کیے، البتہ تاریخی طور سے یہ امر بحث طلب ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے علوم وفنون پر کس زمانہ میں توجہ کی اور کن اسباب سے کی،

اصل یہ ہے کہ ابتدا ہی میں مسلمانوں کی فتوحات کی وسعت کی وجہ سے مختلف قوموں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا، اور جس قدر یہ روابط بڑھتے گئے، اسی قدر ان کو دوسری قوموں کے علوم وفنون اور خیالات سے زیادہ واقفیت ہوتی گئی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر فتح ہوا، تو وہاں وہ یونانی مشہور فلاسفر موجود تھا، جس کو انگریزی میں جان اور عربی میں یحییٰ نحوی کہتے ہیں،[2] وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عمرو بن العاصؓ نے اس کی نہایت قدر وعزت کی، چنانچہ وہ اکثر ان سے ملتا رہتا تھا، اور یہ اس کی علمی تقریریں سن کر محظوظ ہوتے تھے،[3] امیر معاویہؓ نے اپنے عہد حکومت میں غیر قوموں کو زیادہ دخل دیا، ان سے پہلے کسی خلیفہ نے دفتر خراج کے سوا عیسائیوں اور یہودیوں کو کوئی ملکی خدمت نہیں دی تھی، انھوں نے ایک عیسائی کو دربار کا میر منشی مقرر کیا، اور ابن آثال ایک عیسائی کو ضلع حمص کی کلکٹری کی خدمت دی، ابن آثال طبیب بھی تھا، اس نے امیر معاویہؓ کے لیے طب کی بعض کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں، اور گویا یہ ترجمہ کے رواج کا پہلا دیباچہ تھا،

اگرچہ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی علوم وفنون یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، انساب، اس حد تک پہونچ گئے تھے، کہ سیکڑوں آدمی ان کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے، اور بجز اس کے کہ تصنیف وتالیف کا رواج نہیں ہوا تھا، تعلیم وتعلم میں اور کسی بات کی کمی نہ تھی، لیکن اب تک اہل عرب نے غیر قوموں کے

---

[1] فتوح البلدان ص۴۶۴، [2] اس کا مفصل حال اور اس کی تصنیفات کا ذکر آگے آئے گا، [3] کتاب الفہرست ص۲۵۴ وطبقات الاطباء ذکر یحییٰ نحوی،

علوم وفنون حاصل کرنے کی طرف خاص توجہ نہیں کی تھی، امیر معاویہ کا پوتا خالد جو اسلامی علوم وفنون میں یکتا تھا، اس نے فن طب اور کیمیا میں کمال پیدا کرنا چاہا، اور چونکہ اس وقت علمی طور سے اس فن کے ماہر عیسائی یا یہودی تھے، خالد کو عیسائی طبیبوں کی شاگردی کرنی پڑی، اس تعلق سے اس نے غیر قوموں کے اور علوم سے بھی واقفیت حاصل کی، ایک یونانی رہبان سے جس کا نام مریانس تھا، اس نے علم کیمیا سیکھا، اور خود اس فن میں تین مختصر کتابیں لکھیں، ایک کتاب میں اس نے مریانس سے تعلیم پانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، خالد کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بڑے حوصلہ کے ساتھ غیر زبانوں کے ترجمہ پر توجہ کی، اس زمانہ میں فلسفہ وغیرہ کی تعلیم یونان سے منتقل ہو کر مصر میں آگئی تھی، اور یونانی نسل کے بڑے بڑے حکما، اور اہل فن یہیں کے مدرسوں میں پڑھتے پڑھاتے تھے، اور چونکہ مصر جس دن سے اسلام کے قبضہ میں آیا تھا، اسی وقت سے وہاں عربی زبان رواج پانے لگی تھی، یہاں تک کہ تھوڑے دن کے بعد کل مصر کی زبان قبطی کے بجائے عربی ہوگئی، اسی لیے ان حکما میں بہت سے ایسے بھی تھے جو عربی زبان لکھ پڑھ سکتے تھے، خالد نے ان لوگوں کو بلا کر یونانی اور قبطی زبان کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا[1] علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے، کہ اسلام میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا، خالد کے عہد کا مشہور مترجم اصطفن تھا، معلوم ہوتا ہے کہ خالد کی اس کوشش کا اور لوگوں پر بھی اثر ہوا، اور خود سلطنت کو اس کام کی طرف توجہ ہوئی، چنانچہ مروان بن الحکم جو سلطنت بنی امیہ کا پہلا تاجدار ہے، اس کے دربار کے ایک مشہور یہودی طبیب نے جسکا نام ماسرجیس تھا، بشپ اہرن کی قرابادین کا سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا، اور یہ ترجمہ شاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا،

علامہ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ کے جس قدر قرابادین ہیں یہ سب سے بڑھ کر ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے عہد خلافت میں اس کو خزانہ شاہی سے نکلوا کر بہت سی نقلیں کرائیں، اور عام طور پر شایع کیں، حضرت عمر بن عبد العزیز کو ایک بڑی وجہ یونانی

---

[1] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۴۲ و ابن خلکان تذکرہ خالد بن یزید،

معلومات کی طرف رغبت کی یہ تھی، کہ جب وہ سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں مصر کے گورنر تھے، تو اسکندریہ کی یونانی تعلیم کا پروفیسر اور افسر کل ابن ابجر نام ایک حکیم تھا، معلوم نہیں کن اسباب سے وہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ پر اسلام لایا، جب یہ خلیفہ ہوئے، تو انھوں نے اس کو اپنے دربار میں بلا لیا، اور طبی صیغہ کی افسری اس کو دی[1] مؤرخوں نے لکھا ہے کہ عمر بن عبد العزیز کی تخت نشینی کے سال یونانی تعلیم اسکندریہ سے انطاکیہ و حران کو منتقل ہو گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اسکندریہ میں جس کے دم سے یہ تعلیم قائم تھی، (یعنی ابن ابجر) وہ عمر بن عبد العزیز کے پاس چلا آیا،

بعض ملکی ضرورتوں نے بھی ترجمہ کے رواج میں مدد دی، اس وقت تک مالگذاری اور خراج کے جس قدر دفتر تھے سب غیر زبانوں میں تھے، چنانچہ عراق کا دفتر فارسی میں، شام کا لاطینی میں، مصر کا قبطی میں تھا، اور اسی وجہ سے دفتر خراج کے جس قدر عہدہ دار تھے، سب مجوسی یا عیسائی تھے، حجاج بن یوسف کے زمانہ میں دربار کا میر منشی ایک مجوسی تھا، جس کا نام فرخ تھا، اس نے ایک موقع پر یہ دعویٰ کیا کہ میرے بغیر دفتر خراج کا کام انجام نہیں پا سکتا، وہ تو ایک ہنگامہ میں اتفاق سے مارا گیا، لیکن اس مغرورانہ دعویٰ کی خبر حجاج کو پہنچی، اتفاق یہ کہ حجاج کے دربار میں صالح بن عبد الرحمٰن ایک شخص موجود تھا، جو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کمال رکھتا تھا، حجاج نے اس کو حکم دیا کہ خراج کا جس قدر دفتر ہے فارسی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ کر دیا جائے، دربار میں جو پارسی موجود تھے، ان کو نہایت اضطراب پیدا ہوا کہ اتنا بڑا محکمہ ہمارے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے، چنانچہ انھوں نے صالح کے پاس رشوت کے ایک لاکھ درہم پیش کیے، کہ تم حجاج سے کہدو کہ عربی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا، لیکن صالح نے نہ مانا، اور ۷۸ھ میں عراق کا تمام دفتر عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا، اس کے بعد ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں ۸۷ھ میں عبد اللہ بن عبد الملک کی کوشش سے مصر کا دفتر عربی زبان میں منتقل ہوا، پھر ہشام بن عبد الملک نے شام کا دفتر عربی میں ترجمہ کرایا، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی

[1] طبقات الاطبا، جلد اول ص ۱۱۷،

ہجری کے اخیر تک مسلمانوں میں بہت سے آدمی پیدا ہو گئے تھے، جو فارسی، لاطین، قبطی وغیرہ زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے،

ہشام بن عبدالملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، حکومت بنوامیہ کا گلِ سرسبد تھا، اس کے عہد میں ملکی انتظامات کے نظم ونسق کے ساتھ علوم وفنون کو بہت ترقی ہوئی، اور غیر قوموں کے معلومات وخیالات سے واقفیت کے نئے سامان پیدا ہو گئے، سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہشام نے خالد بن عبداللہ قسری کو عراق کا گورنر مقرر کیا، جو بے تعصبی اور علمی فیاضی میں یگانۂ روزگار تھا، فرقہ مانویہ جس کے پیشوا مانی کو شہنشاہ ایران نے قتل کرادیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ اس فرقہ کا ایک شخص بھی دنیا میں زندہ نہ رہنے پائے، عجم کے اخیر سلطنت تک مارا مارا پھرتا تھا، اسلام کی حکومت میں اُن کو امن حاصل ہوا، اور خالد نے ان کے ساتھ اس قدر مراعات کی کہ درحقیقت ان کا مربی بن گیا[1]، ہشام کا میر منشی جس کا نام سالم تھا، مشہور صاحب قلم اور فصیح و بلیغ تھا، اس کے ساتھ غیر زبانوں میں نہایت مہارت رکھتا تھا، اس نے ارسطو کے رسالوں کا جو سکندر کے نام تھے، عربی زبان میں ترجمہ کیا[2]، اس کا بیٹا جبلہ فارسی زبان میں کمال رکھتا تھا، چنانچہ اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں[3]، جن میں سے جنگ رستم واسفندیار و داستان بہرام چوبین کا ذکر علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے، سالم کی ترغیب اور فیاضی سے اور لوگوں نے بھی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں،

ہشام کو خود اس کام کے ساتھ نہایت شوق وشغف تھا، شاہان عجم کے علمی ذخیرے جو ہاتھ آئے تھے، ان میں ایک نہایت مبسوط تاریخ تھی، جس میں تمام شاہان عجم کی سوانحعمریاں، قواعد سلطنت تعمیرات علوم وفنون تفصیل سے درج تھے، اور ایک خاص بات یہ تھی کہ جس بادشاہ کا حال تھا اس کی تصویر بھی تھی، تصویروں میں حلیہ اور لباس و وضع کو اصلی طور سے دکھایا تھا، ہشام نے اس کتاب کے ترجمہ کا حکم دیا، اور ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ تیار ہو کر مرتب ہوا، مورخ مسعودی نے لکھا ہے[4] کہ "میں نے ۳۰۳ھ

---

[1] کتاب الفہرست ص ۳۳۷، [2] ایضاً ص ۱۱۷، [3] کتاب الفہرست ص ۲۴۴، [4] کتاب التنبیہ للاشراف للمسعودی ص ۱۰۶،

میں بمقام اصطخر یہ کتاب مع تصاویر دیکھی، سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں قدیم فارسی میں موجود ہیں، کوئی اس سے مفصل اور مبسوط نہیں ہے، ہشام بن عبد الملک نے ۱۲۵ھ میں وفات پائی، اور اس کی وفات کے ساتھ گویا حکومت بنی امیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا،

دولت عباسیہ کا پہلا تخت نشین سفاح تھا، جس نے صرف دو ڈھائی برس حکومت کی، پھر منصور مسند آرا ہوا، اور دولت عباسیہ کا آغاز بھی اسی وقت سے کیا جاتا ہے، منصور خود بہت بڑا عالم اور صاحب فضل و کمال تھا، اسی کی حوصلہ افزائی نے علوم و فنون کا دریا بہا دیا، اس کا مبارک عہد تھا کہ اسلامی علوم کی تدوین شروع ہوئی، یعنی امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کو مدون کیا، ابن اسحٰق نے غزوات نبوی لکھے، امام مالکؒ، اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں، منصور کا مذاق اتفاق سے عجمی واقع ہوا تھا، وہ ہر ہر بات میں اہل عجم کی تقلید کرتا تھا، یہاں تک کہ دربار کا لباس بھی عجمی رکھا، منصور ہی پہلا شخص تھا، جس نے عرب کے زور گھٹانے کے لیے عجمیوں کا رسوخ بڑھایا، اور تمام بڑے بڑے عہدے ان کے ہاتھ میں دیدیئے، اگرچہ منصور کی یہ کارروائی پولیٹکل حیثیت سے نہایت خراب تھی، لیکن اس غلطی سے اتنا فائدہ ہوا، کہ عرب میں فلسفہ کی بنیاد قائم ہوئی، اور آج مسلمانوں میں عقلی علوم کا جو کچھ رواج ہے، وہ اسی غلطی کی بدولت ہے، منصور نے جن عجمیوں کو دربار میں رسوخ دیا، وہ عموماً صاحب فضل و کمال تھے، اور اس وجہ سے انہوں نے طب و فلسفہ کی نادر نادر کتابیں منصور کے لیے بہم پہونچائیں، اور ان کے ترجمے کیے، ان میں ایک عبد اللہ بن المقفع تھا، جس کی نسبت ہمارے علمائے عربیت نے تسلیم کیا ہے، کہ شروع اسلام سے آج تک عربی زبان میں ایسا فصیح و بلیغ مقرر اور صاحب قلم نہیں گذرا، چنانچہ اس کی کتاب "یتیمۃ" کو ملحدوں نے (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کیا ہے، وہ مجوسی تھا اور اس کی مادری زبان فارسی تھی، اسلام قبول کرکے اس نے عربی زبان میں کمال پیدا کیا، اور منصور نے اس کو دربار کا میر منشی مقرر کر دیا، چونکہ وہ مختلف زبانوں کا ماہر تھا، اور اس کے ساتھ نہایت فصیح و بلیغ تھا، اس کے ترجمے نہایت اعلیٰ درجہ کے خیال کیے جاتے ہیں، ان میں سے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ آج بھی یادگار ہے، اور چھپ کر شایع ہو چکا ہے، اس نے یونانی زبان کی کتابیں بھی ترجمہ کیں مثلاً قاطیغوریاس،

پارمیناس، انالوطیقا وغیرہ، فرفوریوس مصری کی کتاب ایساغوجی کا ترجمہ بھی اسی[1] نے کیا، فارسی زبان اس کی مادری زبان تھی، اس لیے اس زبان کی کتابیں کثرت سے ترجمہ کیں، ان میں سے خدائی نامہ، آئین نامہ، یزدک نامہ، نوشیرواں نامہ، جو تاریخ کی نادر کتابیں ہیں، زیادہ مشہور ہوئیں، پارسیوں کی علم الاخلاق کی دو بڑی کتابیں جو اس نے ترجمہ کیں، وہ الادب الکبیر، اور الادب الصغیر کے نام سے مشہور ہیں، چنانچہ ان کتابوں کا ذکر علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے،

اہل عجم میں سے ایک اور بڑا صاحب اثر شخص جو منصور کے دربار میں تھا، نوبخت نام ایک آتش پرست تھا، وہ منصور کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا، اور دربار میں اس کو وہ جاہ و اقتدار حاصل تھا کہ اکابر دولت میں گنا جاتا تھا، اس کا خاندان ایک مدت تک علم و فضل کا سرپرست رہا، اور ان کی وجہ سے فارسی زبان کے بہت سے ذخیرے عربی میں آئے، ابوسہل اور حسن بن موسیٰ جو بڑے پایہ کے متکلم تھے، اور جن کے ہاں مترجمین کا جمگھٹا رہتا تھا، اسی نوبخت کے خاندان سے تھے[2]۔

انہی عجمیوں میں سے جارج بن جبریل بھی تھا، جو مشہور مترجم گذرا ہے، یہ جندی سابور میں افسر الاطباء کے منصب پر ممتاز تھا، ۱۴۸ھ میں منصور نے اس کو علاج کے لیے طلب کیا، اور پھر اس کا تمام خاندان دربار میں داخل ہو گیا، منصور نے اس کی یہ قدردانی کی کہ باوجود اس کے کہ اس نے اپنے مذہب کو نہیں بدلا تھا، دربار کا طبیب مقرر کیا، اور جب مرض الموت کی بیماری میں اس نے وطن کو واپس جانا چاہا تو سفر خرچ کے لیے پچاس ہزار روپئے عنایت کیے، جارج پہلا شخص ہے جس نے دولت عباسیہ میں طب کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کیں[3] اس کی کوشش سے طب کا بڑا ذخیرہ عربی زبان میں فراہم ہوا، اس نے خود بھی ایک نہایت مفصل اور عمدہ تجربیات کی کتاب سریانی زبان میں لکھی، جس کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی میں کیا، منصور کے عہد سے لیکر ۴۵۰ھ تک یہ خاندان قائم رہا، اور دولت عباسیہ کے اخیر عہد ترقی تک یہ خاندان برابر علوم طبیہ کا سرپرست

---

[1] عبد اللہ بن المقفع کے لیے دیکھو کتاب الفہرست ص ۱۱۸ و طبقات الاطباء ج اول ص ۳۰۸، [2] کتاب الفہرست ص ۱۷۶، ۱۷۷، ۲۴۴ و مروج الذہب ذکر خلافت ہارون الرشید، [3] جارج کے لیے دیکھو طبقات ص ۱۲۳ و ۲۰۳،

علم و فضل کا حامی، اور دربار کا زیب و زینت رہا،

طب کی کتابوں کا ایک اور مشہور مترجم جو منصور کے دربار میں تھا، بطریق نام ایک عیسائی تھا اس نے منصور کے حکم سے یونان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کے جو ترجمے اس نے کیے، ساتویں صدی ہجری تک متداول رہے[1]۔

منصور کے ذوق علمی کا یہ حال تھا کہ یونان کے علوم و فنون کا جو سرمایہ خود اس کے ملک میں بہم پہنچ سکتا تھا، اس پر اکتفا کر کے قیصر روم کو خط لکھا، چنانچہ اس کی درخواست کے موافق قیصر نے فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منصور کے پاس روانہ کیں۔

منصور کے ذوق کا یہاں تک چرچا پھیلا کہ دور دراز ملکوں سے ہر قوم و ملت کے اہل کمال نے اس کے دربار کا رخ کیا، ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں عالم بغداد میں آیا، اور سنسکرت کی مشہور زیچ جس کا نام سدھانتا ہے، اور جس کے متعلق آگے چل کر ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھیں گے، منصور کی خدمت میں پیش کی، محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے اس کا ترجمہ کیا، مامون الرشید کے زمانہ تک اعمالِ کواکب میں اسی زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا[2]،

مذاہب کی تحقیقات کے لیے منصور نے اجازت دی کہ تمام مختلف فرقوں کی مذہبی کتابیں ترجمہ کی جائیں، اس وقت ایران میں جس مذہب کا بہت چرچا تھا، وہ مانی کا مذہب تھا، مانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور چند کتابیں پیش کی تھیں، کہ خدا کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہیں، بادشاہ وقت نے اس کو قتل کرادیا، اور حکم دیا کہ اس کے پیرووں میں سے ایک متنفس بھی زندہ نہ رہنے پائے، چنانچہ عجم کی اخیر سلطنت تک اس فرقے والے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے، لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا، تو اس نے تمام مذہب کو آزادی دی، اس وقت یہ فرقہ بھی عراق کو واپس آیا، اور چونکہ خالد بن عبداللہ قسری گورنر عراق نے ان پر خاص توجہ کی[3] وہ امن و اطمینان کے ساتھ اپنے مذہب کی ترویج میں مصروف ہوئے۔ عباسیہ کا عہد آیا، تو مانی کی تمام تصنیفات ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، عبداللہ

[1] بطریق کے لیے دیکھو طبقات ص۲ [2] جامع القصص الهندیہ مطبوعہ فرانس [3] کتاب الفہرست ص۳۳۷،

ابن المقفع اور دوسرے مترجموں نے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، مانی کے سوا مجوسیوں کے اور بانیان مذاہب مثلاً دیسان مرقون کی کتابوں کے ترجمے ہوئے، اور یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مذہب اور مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل ہوئی، اگرچہ اول اول اس کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں میں اعتدال سے زیادہ مذہبی آزادی آگئی، اور بعض لوگ الحاد کی طرف مائل ہوگئے، یہاں تک کہ ابن ابی العرجاء حماد عجرد، یحییٰ بن زیاد، مطیع بن ایاس نے مانی وغیرہ کی تائید میں کتابیں لکھیں[1]، تاہم منصور نے آزادی کے لحاظ سے کچھ روک نہیں کی، اور سچ پوچھو تو اس سے بڑا نفع یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک نیا علم جو علم کلام کہلاتا ہے، پیدا ہوا، جسکی وجہ سے ہمیشہ کیلئے الحاد و زندقہ کا راستہ رُک گیا۔

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ مانی وغیرہ کی کتابوں کے پھیلنے سے جب الحاد کی ہوا چلی تو منصور کے فرزند خلیفہ مہدی نے اپنے عہد حکومت میں اس آگ کو آب تیغ سے بجھانا چاہا، چنانچہ سیکڑوں ہزاروں آدمی قتل کرادیئے، لیکن خیالات کی آزادی جبر و تعدی سے رُک نہیں سکتی تھی، آخر اس نے علمائے اسلام کو حکم دیا، کہ ملحدوں کے رد میں کتابیں لکھیں، اس طرح علم کلام کی بنیاد پڑی، ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ مخالفوں کے مذہب اور خیالات کے رد کرنے کے لیئے ان کی مذہبی تصنیفات سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور اس وجہ سے خواہ مخواہ غیر زبانوں کے سیکھنے اور ترجمہ کرنے کی ضرورت کا زیادہ تر رواج ہوا،

مہدی کے بعد جب ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا تو اس وقت تک یونانی، فارسی، سریانی، ہندی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، ہارون الرشید نے ان کو منتظم صورت میں رکھنے کے لیئے ایک عظیم الشان محکمہ قائم کیا، جس کا نام بیت الحکمۃ رکھا، اور اس میں ہر زبان اور ہر مذہب کے ماہرین فن ترجمہ کے کام پر مامور کیئے، ان میں فضل بن نوبخت مجوسی بھی تھا، اور وہ خاص فارسی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھا، رشید کے دور میں فلسفہ کا بڑا سرمایہ ایک خاص وجہ سے ہاتھ آیا، شاہان روم کا معمول تھا کہ خلافت عباسیہ کو سالانہ نذرانہ بھیجا کرتے تھے، نائس فورس جو رشید کے عہد میں روم کے

[1] مروج الذہب ذکر خلافت قاہر باللہ،

تخت سلطنت پر بیٹھا، اس نے نذرانہ بھیجنے سے انکار کیا، اور رشید کو گستاخانہ خط لکھا، اس کے انتقام میں رشید نے ایشیائے کوچک پر جو اس وقت رومیوں کا پائے تخت تھا، پے درپے حملے کیے، اور دار السلطنت ہرقلہ کو برباد کردیا، یونان کے بعد یونانی فلسفہ کی تعلیم و تعلم انہی ممالک میں منتقل ہوکر آگئی تھی، چنانچہ رشید نے انگوریہ اور اموریہ وغیرہ کو فتح کیا، تو بے شمار یونانی کتابیں ہاتھ آئیں، رشید نے ان کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا، اور اس زمانہ کے مشہور مترجم کو جس کا نام یوحنا بن ماسویہ تھا، ان کے ترجمہ پر مامور کیا[۱]، یہ تمام کتابیں خزانۃ الحکمۃ میں داخل کی گئیں، اور یوحنا خزانۃ الحکمۃ کا افسر مقرر کیا گیا۔

سنسکرت کی علمی تصنیفات اگرچہ منصور کے عہد میں بغداد پہنچ چکی تھیں، لیکن اس زمانہ میں اور نئے سامان پیدا ہوگئے، ہارون الرشید ایک دفعہ سخت بیمار پڑا، اور گو بغداد طبیبوں سے معمور تھا، تاہم اس کو کسی کے علاج سے شفا نہیں ہوئی، اس وقت ہندوستان کا ایک طبیب جو فلاسفر بھی تھا، شہرت عام رکھتا تھا، اور چونکہ دربار خلافت اور فرمانروایان ہندوستان سے دوستانہ مراسم قائم تھے اور باہم خط و کتابت رکھتے تھے، سب نے اس کے بلانے کی رائے دی، غرض وہ طبیب طلب کیا گیا، اور بغداد میں برامکہ کا جو ہسپتال تھا اس کا مہتمم اور افسر مقرر کیا گیا، سنسکرت کی علمی کتابیں اکثر اسی سے ترجمہ کرائیں، چنانچہ ششرت کی کتاب جو دس بابوں میں ہے، اور سامیکا جس میں زہروں کے علاج کا بیان ہے، اس نے ترجمہ کی[۲] رشید کے دربار میں اور بھی ہندو طبیب تھے، جن کی وجہ سے ویدک کی معلومات عربی زبان میں منتقل ہوئیں، ان میں سے صالح (اصلی نام سالی ہوگا) کا حال علامہ ابن ابی اصیبعہ نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

ہارون کے بعد مامون کا دور آیا، اور اس کی بدولت عربی زبان تمام دنیا کے علوم و فنون سے مالا مال ہوگئی، مامون کی شہزادگی اور ابتدائی خلافت کا زیادہ زمانہ مرو میں گذرا، مامون ماں کی طرف سے عجمی نژاد تھا، اور عجم کی صحبت میں رہ کر خود بھی عجمی بن گیا تھا، ہر ہر بات میں وہ شاہان عجم کی

---

[۱] طبقات ص ۱۷۵، [۲] طبقات ج ۲ ص ۳۳ و کتاب الفہرست ص ۳۰۳ و ۲۴۵،

تقلید کرتا تھا، اور اردشیر کا آئین سلطنت اس کا دستور العمل تھا[۱]، دربار میں جس قدر وزرا اور امرا تھے مجوسی النسل تھے، جن میں سے اکثر اس کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے تھے، ان باتوں کے ساتھ چونکہ وہ علوم قدیمہ کا نہایت شائق تھا، اس لیے فارسی لٹریچر اور علوم و فنون کا بے انتہا سرمایہ اس کے خزانہ میں جمع ہو گیا، سنہ ۲۰۴ھ میں وہ خراسان سے بغداد میں آیا، یہاں یونانی فلسفہ کا زور تھا، اس نے اس میں بھی کمال بہم پہنچایا، اور خزانۃ الحکمۃ کو زیادہ وسعت دی، فلسفہ کے ساتھ اس کی شیفتگی اس حد تک پہونچی، کہ ایک دن خواب میں دیکھا، کہ ایک شخص جس کا یہ حلیہ ہے، سفید رنگ، کشادہ پیشانی، پیوستہ ابرو، آنکھوں میں سیاہی کے ساتھ نیلا پن، تخت پر بیٹھا ہے، مامون نے حیرت زدہ ہو کر نام پوچھا، اس نے کہا، ارسطو، مامون خوشی سے بھڑک اٹھا، اور اس سے سوال و جواب کیے، اس خواب نے مامون کو فلسفہ کا اور دلدادہ بنا دیا، چنانچہ سنہ ۲۱۰ھ میں[۲] قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو وغیرہ کی جس قدر کتابیں بہم پہنچ سکیں، پہنچائی جائیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ خلفائے عباسیہ کے خطوط قیصر روم پر فرمان کا اثر رکھتے تھے، قیصر تعمیل ارشاد پر آمادہ ہوا، اور کتابوں کے بہم پہنچانے کی کوشش کی، ایک عیسائی خانقاہ نشین نے پتہ دیا، کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل چلا آتا ہے، قسطنطین نے اس میں فلسفہ کی کتابیں اس خیال سے بند کرا دی تھیں، کہ فلسفہ سے مذہب عیسوی کو ضرر پہنچتا ہے، قیصر کے حکم سے یہ مکان کھولا گیا، تو بہت سی کتابیں نکلیں، قیصر کو حسد ہوا کہ یہ گنجینہ بہا مسلمانوں کے ہاتھ میں جاتا ہے، لیکن درباریوں نے تسکین کر دی کہ یہ بلا (فلسفہ) جہاں جائیگی آفت لائیگی، غرض پانچ اونٹ پر لدکر یہ کتابیں دار الخلافۃ کو روانہ کی گئیں[۳]۔

مامون نے اپنے قاصدوں کے ساتھ ان بڑے بڑے مترجموں کو بھی بھیجا تھا جو خزانۃ الحکمۃ کے مہتمم اور یونانی و سریانی زبان میں کمال رکھتے تھے، چنانچہ ان میں سلما، حجاج بن مطر ابن البطریق بھی تھے، مامون کے دربار میں اگرچہ مترجموں کا ایک گروہ کثیر موجود تھا، لیکن چونکہ اس وقت تک ترجمہ میں اکثر لفظی رعایت کا رواج تھا، یعنی مترجمین لفظ کے مقابلہ میں لفظ رکھ دیتے تھے، مامون کو سب

[۱] مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ، [۲] مقریزی جلد دوم صفحہ ۳۵۵ و کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۳، [۳] یہ تفصیل ناسخ التواریخ حالات ارسطو کے بیان میں مذکور ہے۔

مترجم کی تلاش تھی، جو خود ان فنون میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو، تاکہ ترجمہ کے ساتھ کتاب کے اصلی مشکلات کو بھی حل کر دیتا، ایسے شخص اس زمانہ میں صرف دو تھے، حنین و یعقوب کندی۔

حنین کی لائف جہاں تک اس موقع سے تعلق رکھتی ہے، یہ ہے کہ وہ ایک صراف بچہ عیسائی تھا، اور حیرہ میں جو عراق کا ایک مشہور شہر ہے، سکونت رکھتا تھا، چوں کہ اس وقت عیسائیوں کی بہ دولت درودیوار سے تعلیم کی صدا آتی تھی، اس نے ہوش سنبھال کر طب کے سیکھنے کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں یونانی فلسفہ کا بڑا ماہر یوحنا بن ماسویہ تھا، جو ہارون الرشید کے خزانۃ الحکمۃ اور دفتر ترجمہ کا افسر تھا، حنین اس کے حلقۂ درس میں پہنچا، لیکن چندروز کے بعد استاد شاگرد میں رقیبانہ شکر رنجی ہوگئی، یوحنا نے کہا کہ تم جا کر صرافی کی دکان کھولو، تم کو علم نہیں آسکتا، حنین غم زدہ ہو کر رو تا اٹھا، اور دل میں ٹھان لی کہ یونانی زبان میں وہ کمال پیدا کروں گا کہ تمام ملک میں کسی کو ہم سری کا دعوانہ ہو سکے، ممالکِ اسلامیہ میں اس وقت یونانی فنون کا مرکز اسکندریہ تھا، وہاں یونانی علم ادب اور فلسفہ کی تعلیم کی بہت سی درس گاہیں تھیں، اس کے علاوہ یونانی نہایت کثرت سے وہاں آباد تھے، اس لیے اس نے اسکندریہ کا رخ کیا، اور وہاں رہ کر یونانی زبان حاصل کی، چنانچہ یونان کے مشہور شاعر ہومر کا کلام حفظ یاد کیا کرتا تھا، اس کے بعد عربیت کی تکمیل کے لیے بصرہ میں آیا، یہاں خلیل بصری، جو عربی علم نحو کا موجد ہے، نحو کا درس دیتا تھا، اور سیبویہ وغیرہ اس کے حلقۂ درس میں بیٹھتے تھے، حنین نے عربی پڑھنی شروع کی، اور اس میں بھی نہایت کمال پیدا کیا، فارسی اس کی ملکی زبان تھی، غرض حنین کا ابھی آغازِ شباب تھا کہ اس کی شہرت دور دور پھیل گئی، چنانچہ مامون کو جب ترجمہ کے لیے تلاش ہوئی تو لوگوں نے اس کا نام لیا، مامون نے اس کو بلا کر بیش بہا انعامات دیے اور ترجمہ کی خدمت متعلق کی، مشہور ہے کہ انعامات وغیرہ کے علاوہ مامون ہر کتاب کے ترجمہ کے صلہ میں کتاب کے برابر تول کر سونا دیتا تھا، اور شاید یہی وجہ تھی کہ حنین ان ترجموں کو نہایت گندہ کاغذ پر لکھواتا تھا، اور خط نہایت جلی اور صفحہ میں صرف چند سطریں ہوتی تھیں۔

حنین کو یونانی کتابوں کے مہیا کرنے اور ترجمہ کرنے کا عشق تھا، کتابوں کی تلاش میں اس نے

ایشائے کوچک کا ایک ایک شہر چھان مارا، یہاں تک کہ انتہائے آبادی تک پہنچا، خود اس کا بیان ہے کہ جالینوس کی کتاب البرہان کی تلاش میں میں نے یہ کوشش کی، کہ جزیرہ اور شام کے ایک ایک شہر میں دورہ کیا، فلسطین و مصر میں جستجو کی، اسکندریہ گیا، ان تمام کوششوں پر صرف آدھی کتاب ہاتھ آئی، اور وہ بھی نامرتب اور پریشان، ترجمہ کے شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اس کی عمر اڑتالیس (۴۸) برس کو پہنچی تو وہ جالینوس کی ایک سو اکیس (۱۲۱) کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ کر چکا تھا۔[۱] حنین ۱۹۴ھ میں پیدا ہوا ستر برس کی عمر پاکر ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

مامون کے دربار کا دوسرا مشہور مترجم یعقوب کندی تھا، یعقوب کندی وہ شخص تھا کہ علمائے اسلام نے اسی کو فیلسوف (فلاسفر) کا لقب دیا، بوعلی سینا اور ابن رشد اس لقب کے مستحق نہیں سمجھے گئے، ابن الندیم نے (کتاب الفہرست ص۲۹۴) اس کا مفصل تذکرہ لکھا ہے

یعقوب کندی کے بدولت عرب پر سے یہ اعتراض اٹھ گیا کہ اب تک نسلِ عرب سے کوئی شخص غیر زبانوں کا ماہر یا حکیم (فلاسفر) نہیں پیدا ہوا۔ مامون الرشید کے زمانہ سے چوتھی صدی کے آغاز تک تمام مسلمانوں میں اس کی تصنیفات رائج تھیں، اور ارسطو کی تصنیفات کے ہم پلہ خیال کی جاتی تھیں، وہ یونانی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا، اور یونانی، فارسی، سنسکرت کے علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، اس نے فلسفہ کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، اور بڑا کام یہ کیا کہ اصل کتاب میں جو مشکلات اور پیچیدگیاں تھیں ان کے عقدے حل کر دیئے۔[۲] مامون نے اس کو خاص ارسطو کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا، کیونکہ ارسطو کے فلسفہ کا سمجھنے والا اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا، علامہ ابن الندیم اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کی تصنیفات کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے، جس سے اس کے حکیم اور فلاسفر ہونے کی تصدیق ہو سکتی ہے، لیکن یہ اس کے لکھنے کا محل نہیں،

یعقوب

اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا ایک عیسائی فاضل نے فلسفہ وغیرہ میں بہت کمال حاصل کیا، وہ یونانی

---

[۱] حنین کے متعلق یہ پوری تفصیل میں نے طبقات الاطبا، تذکرہ حنین اور تذکرہ جالینوس سے لکھی ہے، [۲] یعقوب کندی کیلئے دیکھو طبقات الاطبا، جلد اول ص۲۰۷ و کتاب الفہرست ص ۲۵۵ اور موتک صاحب فرانسیسی کی کتاب،

نسل سے تھا، اور یونانی زبان میں نہایت فصاحت سے تقریر کرتا تھا، اس کے ساتھ چونکہ بچپن سے شام میں پرورش پائی تھی، عربی زبان میں بھی اس کو کمال حاصل تھا، وہ یونانی فلسفہ کا نہایت دلدادہ تھا، چنانچہ خاص اس غرض کے لئے اس نے ایشیائے کوچک کا سفر کیا، اور یونانی علم کی بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں، مامون نے اس کا حال سن کر بلا بھیجا، اور بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے، کہ اس نے یونان کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں، اور پچھلے ترجموں کی اصلاح کی،[۱]

یہ تمام سامان تو یونانی کتابوں کے ترجمے کے تھے، فارسی اور پہلوی ترجمہ کے لیے مامون نے مجوسی خاندان کے اہل کمال فراہم کیے، سہل بن ہارون ایک مجوسی تھا، جو مجوسیوں کے علوم وفنون کا بہت بڑا ماہر تھا، اس کے ساتھ عربی زبان کا ایسا انشا پرداز تھا، کہ اس زمانہ کے نہایت فصیح وبلیغ لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ جاحظ اس کی استاذی کا اعتراف کرتا تھا، چنانچہ علامہ ابن الندیم نے اس کا نام انشا پردازوں ہی کے ذیل میں لکھا ہے، اس نے کلیلہ ودمنہ کے طرز پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ثعلہ وعفرار رکھا، مامون نے اس کو خزانۃ الحکمۃ میں مقرر کیا، اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت دی، سہل کا بھائی سعید بھی نہایت فصیح وبلیغ تھا، مامون نے اس کو بھی خزانۃ الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا،[۲] شاکر کا خاندان بھی خزانۃ الحکمۃ میں کام کرتا تھا، لیکن ان لوگوں نے ترجمہ کے کام کو اس قدر وسعت دی کہ ہم آگے چل کر ان کا جداگانہ تذکرہ کریں گے، ان کے سوا سلما اور ابن البطریق وعلان شعوبی وغیرہ خزانۃ الحکمۃ میں ملازم تھے، ایک ایسا محکمہ جس میں یعقوب کندی، حنین، قسطا بن لوقا، سہل بن ہارون، سعید بن ہارون، سلما، ابن البطریق، حجاج بن مطر، علان شعوبی، جیسے ارباب کمال ملازم اور کارپرداز ہوں، اسکی وسعت اور خوبی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے،

مامون کے عہد میں علوم عقلیہ اور دوسری زبانوں سے واقفیت کا ایک اور خاص سبب

---

[۱] دیکھو طبقات الاطباء ص ۲۰۴ جلد اول ومختصر الدول حالات یعقوب کندی وکتاب الفہرست ص ۲۹۵، [۲] ان دونوں کا حال فہرست ابن الندیم ص ۱۲۰ میں مذکور ہے۔

تھا، برمکیوں کی بدولت مناظرہ کی مجلسوں کا جو طریقہ تمام ملک میں جاری تھا، ہارون الرشید نے اپنے اخیر زمانہ میں فقہار کے کہنے پر بند کرادیا تھا، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ فلسفہ وغیرہ کی طرف سے لوگوں کا میلان کم ہو چلا، مامون کے زمانہ سے پہلے یہ بات مشہور ہو چکی تھی، کہ دنیا میں اسلام بزور شمشیر پھیلا، کیونکہ اگر اسلام خود اپنی خوبیوں کی وجہ سے پھیل سکتا، تو لوگوں کو مناظرہ اور مباحثہ سے کیوں روکا جاتا، مامون نے یہ شہرہ سن کر بغداد میں ایک بہت بڑا مجمع کیا، اور تمام ملک میں جس قدر پیشوایان مذہب اور مختلف فرقوں کے لوگ تھے، سب طلب کیے گئے، فرقۂ مانویہ کا سردار جس کا نام یزدان بخت تھا، رے سے بلایا گیا، اور مامون نے اس کو خاص ایوان شاہی کے قریب اتارا، اس جلسہ میں علمائے کلام نے تمام مخالفین اسلام پر فتح حاصل کی[1]، اور لوگوں پر علانیہ ثابت ہوگیا کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ہوئی ہے اور ہوسکتی ہے، اس کے بعد مامون نے نہایت فراخ حوصلگی سے حکم دیا کہ تمام ملک میں مناظرہ اور بحث کے عام جلسے قائم کیے جائیں، اور ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کو عام اجازت دی جائے، کہ اپنے مذہب کا اثبات اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی کریں، ان مجلسوں کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو فلسفہ اور علوم عقلیہ کی طرف میلان ہوا، کیونکہ دوسرے مذاہب کے رد کرنے کے لیے فقہ اور حدیث وغیرہ کام نہیں آسکتے تھے، اس کے ساتھ چونکہ دوسری قوموں کے مذہبی مسائل معلوم کیے بغیر، اُن کے مذہب کا رد نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے خواہ مخواہ دوسری قوموں کی زبان سیکھنی پڑی،

مامون کے بعد معتصم تخت حکومت پر بیٹھا، وہ جاہل محض اور سپاہیانہ مذاق کا آدمی تھا، اگرچہ اس کے عہد میں سلطنت کی شان و شوکت کو نہایت ترقی ہوئی، رومیوں پر اُس نے آٹھ متواتر حملے کیے، اور عموریہ کے معرکہ میں تو گویا رومیوں کی سلطنت کی جڑ ہلادی، لیکن علمی فتوحات کو کچھ ترقی نہ دے سکا، البتہ عقلی علوم میں کچھ مزاحمت بھی نہیں کی، اس لیے جو لوگ اپنے شوق سے ان کاموں میں

---

[1] ان حالات کے لیے دیکھو کتاب الملل والنحل لیحیی المرتضیٰ اور مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ (کتاب الفہرست ص ۳۳۸)

معروف تھے بدستور مصروف رہے، لیکن جب معتصم کے بعد ۲۲۷ھ میں خلیفہ واثق باللہ مسند آرا ہوا، تو ترجمہ کے کام کو نئے سرے سے رونق حاصل ہوئی۔ وہ تقلید کا سخت مخالف تھا، اور ہر فرقہ اور ہر مذہب کو آزادی سے اظہار خیالات کا مجاز کیا تھا، تمام بڑے بڑے مشہور مترجم اور فلاسفر اس کے دربار میں حاضر رہتے تھے، اور [illegible] سے فلسفیانہ بحثیں کرتا تھا، چنانچہ ایک صحبت کا حال جس میں ابن بختیشوعؒ، ابن ماسویہ، میخائیل، حنین بن اسحاق سلمویہ وغیرہ بھی موجود تھے، علامہ مسعودیؒ نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے، حنین بن اسحاق سے واثق باللہ نے جو علمی مسائل دریافت کیے، ان کو حنین نے ایک مستقل کتاب میں لکھا ہے، جس کا نام کتاب المسائل الطبیعیۃ ہے، یوحنا بن ماسویہ مشہور مترجم جس کو ہارون الرشید نے خزانۃ الحکمۃ کا افسر مقرر کیا تھا، واثق نے اس کو اپنا ندیم خاص قرار دیا، اور دولت و مال سے مالا مال کر دیا، چنانچہ ایک موقع پر تین لاکھ درہم عطا کیے۔[1] واثق کے بعد متوکل باللہ خلیفہ ہوا، وہ اگرچہ محض ظاہریانہ طبیعت کا آدمی تھا، چنانچہ مناظرہ کے جلسے بالکل بند کرادیئے، لیکن ترجمہ کے کام پر اس کو بھی توجہ رہی، حنین بن اسحاق کو ترجمہ کے محکمہ کا افسر مقرر کیا، اور بہت سے زبان دان مترجم جن میں اصطفن بن بسیل اور موسیٰ بن خالد بھی داخل تھے، اس کی ماتحتی میں دیئے، یہ لوگ ترجمہ کرتے تھے، اور حنین ان کو اصلاح کی نظر سے دیکھتا تھا، اور درست کرتا تھا،[2] متوکل نے حنین کی قدردانی بھی بے انتہا کی، اس کے رہنے کے لیے خاص شاہی ایوانات میں سے تین بڑے بڑے محل عنایت کیے، اور اس خیال سے کہ آئندہ کوئی اس کے قبضہ سے نکالنے نہ پائے، شرعی گواہی کرادی، یہ بھی حکم دیا کہ وہ ہر قسم کے اسباب وسامان سے سجادیئے جائیں، اور کتب خانہ بھی وہیں مہیا کردیا جائے، اس کے ساتھ پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ مقرر کردی، متوکل کے بعد عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہ گئی، لیکن اس سلسلہ سے الگ جو اسلامی حکومتیں قائم ہوتی گئیں، ان کو ہمیشہ اس کام کی طرف توجہ رہی۔[3]

سیف الدولہ کے دربار میں عیسیٰ رقی اس خدمت پر مامور تھا، اور سریانی سے عربی میں ترجمہ کرتا رہتا تھا،

---

[1] مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت واثق باللہ وطبقات الاطباء تذکرہ یوحنا بن ماسویہ۔ [2] طبقات الاطباء جلد اول ص ۱۸۹، [3] طبقات الاطباء، جلد دوم ص ۱۴۰،

اندلس میں عبدالرحمٰن نامی ترجمہ کا بڑا شائق تھا، چنانچہ اس کے عہد کے بعض کارنامے آگے آئیں گے سامانی خاندان نے پہلوی زبان سے تاریخ کا بہت کچھ سرمایہ مہیا کیا تھا، اور درحقیقت یہی سرمایہ تھا، جس سے فردوسی نے شاہنامہ کی نقش آرائی کی، ہندوستان میں سلطان فیروز شاہ جب ۷۶۲ھ میں جوالا مکھی پہاڑ کی سیر کو گیا، تو معلوم ہوا کہ یہاں کے بت خانہ میں تیرہ سو ۱۳۰۰ سنسکرت کی قدیم تصنیفات موجود ہیں، فیروز شاہ نے وہ کتابیں حضور میں طلب کیں، اور ان کے ترجمہ کا اہتمام کیا، نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ عزالدین نے نظم کیا، اور دلائل فیروزی نام رکھا، یہ کتابیں اکثر موسیقی اور کشتی کے فن میں تھیں، عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے، کہ ۹۹۹ھ میں جب میں لاہور پہنچا تو یہ ترجمہ شدہ کتابیں میری نظر سے گذریں، اکبر شاہ کو سنسکرت کی کتابوں کا جو اہتمام تھا وہ عام طور سے مشہور ہے، خلفاء اور سلاطین کے علاوہ اکثر ارباب دولت نے بھی اس صیغہ کو بہت وسعت دی، اور ان میں سے بعضوں کا تذکرہ اس مقام پر ضرور ہے، اس فخر کا طرہ جس کے سر پر ہے، وہ برامکہ کا خاندان ہے، اور انصاف یہ ہے کہ دولت عباسیہ میں جو کچھ کام ہوا، اس کا بڑا حصہ برامکہ ہی کی بدولت تھا، اس خاندان کا مورث اعلیٰ برمک بلخ کے مشہور آتشکدہ کا جس کو مجوسی کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، مہتمم اور افسر تھا، اس کا بیٹا خالد اسلام لایا، اور دولت عباسیہ کے آغاز میں وزیر رہ کر منصور کے زمانہ میں قضا کی، خالد کا بیٹا یحییٰ بن خالد، ہارون الرشید کے عہد تک وزارت پر ممتاز رہا، چونکہ یہ خاندان اصل میں مجوسی تھا، اور آتش کدہ کے تعلق سے مجوس کی کل قوم سے ان کو واسطہ رہا، اس لیے فارسی کا سرمایۂ علمی جس قدر وہ مہیا کر سکتے تھے، کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا،

ایک بڑا سبب اُن کے زمانہ میں ترجموں کی ترویج کا یہ ہوا کہ اسلام میں سب سے پہلے اسی خاندان نے علمی عام جلسوں کی بنیاد ڈالی، یحییٰ بن خالد خود اپنے ہاں مناظرہ کی مجلس منعقد کراتا تھا، جس میں ہر فرقہ اور ہر قوم کے آدمی شامل ہوتے تھے، اور جو نہایت ترتیب اور حسن انتظام سے انجام پاتی تھی، یحییٰ کے دربار میں ہشام بن حکم مشہور متکلم تھا، جس کو مجلس کا سکریٹری مقرر کیا تھا،[1] یحییٰ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان

---

[1] کتاب الفہرست ص ۱۷۵،

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

علی بن یحییٰ معروف ابن المنجم	مامون کا منشی اور ندیم تھا، اس کو خاص طب کی کتابوں کی طرف میلان تھا،
نادری	یہ بغداد کا بشپ تھا، کتابوں کے جمع کرنے اور ترجمہ کرانے کا نہایت شایق تھا،
محمد بن موسیٰ بن عبدالملک	یہ خود بڑا فاضل تھا، اور کتابوں کی خوبی اور برائی کی نہایت صحیح جانچ کرتا تھا،
عیسیٰ بن یونس کاتب	عراق کا رہنے والا تھا، یونانی کتابوں کا زیادہ تر شایق تھا،
احمد بن محمد المعروف بہ ابن الدبر	مترجموں کو بیش بہا انعامات اور صلے دیتا تھا،
علی المعروف بہ قیوم	ایضاً
ابراہیم بن علی بن موسیٰ الکاتب	خاص کر یونانی زبان کا زیادہ شایق تھا،
عبداللہ بن اسحاق	ترجمہ کے ساتھ اس کو بے انتہا شغف تھا،
بختیشوع بن جبریل	بغداد کے تمام اطباء میں کوئی شخص دولت وماں کے لحاظ سے اس کا ہمسر نہ تھا، دس پندرہ لاکھ سال کی آمدنی تھی، جالینوس کی اکثر کتابیں اس کے لیے ترجمہ کی گئیں،

رفتہ رفتہ اس مذاق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ سلاطین و امراء کی طرف سے کسی قسم کی ترغیب اور تحریص کی ضرورت نہیں رہی، اکثر ارباب کمال خود اپنے شوق سے غیر زبانیں سیکھتے تھے، اور کتب علمیہ کے ترجمے کرتے تھے، ان میں سے سعید بن یعقوب جو ۳۰۲ھ میں بغداد اور مکہ و مدینہ کے ہسپتالوں کا انسپکٹر جنرل تھا، اور متی بن یونان المتوفی ۳۲۸ھ جس نے سریانی زبان سے بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، اور یحییٰ بن عدی جو حکیم فارابی کا شاگرد تھا، سریانی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا، اور ابو علی بن زرعہ جو بہت بڑا منطقی اور مترجم تھا، زیادہ مشہور ہیں، چنانچہ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ان کے حالات کسی قدر

تفصیل سے لکھے ہیں،

اخیر زمانہ میں مختلف اسباب کی وجہ سے سنسکرت کے علمی خزانوں پر زیادہ دست رس ہوا، سلطان علی مردکے زمانہ میں ایک پنڈت جس کا نام بھوجر تھا، مسلمانوں سے مباحثہ کرنے کے لیے بنارس سے روانہ ہوا، اور شہر الکفوت پہونچ کر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی، مباحثہ کا ارادہ چھوڑ کر قاضی صاحب سے عربی پڑھنی شروع کردی، اور ایک کتاب جس کا نام انبرت کنڈ تھا، ان کی خدمت میں نذر گذرانی، قاضی صاحب نے اس کے مطالب سنے تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ بھوجر سے سنسکرت پڑھنی شروع کی، سنسکرت میں کمال حاصل کرکے اس کتاب کا ترجمہ کیا، لیکن بعض بعض مقامات ناحل شدہ رہ گئے، اتفاق سے بھوجر کا ایک شاگرد جس کا نام انبوا ناتھ تھا، ہندوستان سے چل کر اس طرف آنکلا، ایک سنسکرت داں عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی، اور عربی زبان میں اس کا دوبارہ ترجمہ کیا، اور مراۃ المعانی لادراک العالم الانسانی اس کا نام رکھا،[1] میں نے خود اس ترجمہ کا ایک نسخہ دیکھا ہے،

محمد بن ... تونخی ایک عالم نے ہیئت و نجوم سیکھنے کے لیے خود ہندوستان کا سفر کیا، اور برسوں وہاں رہ کر ان علوم کی تحصیل کی، اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں، لیکن اس سلسلہ میں ابوریحان بیرونی کا قدم سب سے آگے ہے، پروفیسر زخاؤ جرمنی کا نہایت مشہور عالم ہے، اس نے بیرونی کی کتاب الہند کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ سکندر کے ساتھ جو یونانی مصنف موجود تھے، انہوں نے ہندوستان کے متعلق کچھ لکھا ہے، چینی مسافروں نے بھی خود اپنی ذاتی واقفیت سے اس ملک کے حالات قلمبند کیے، لیکن ابوریحان بیرونی نے جب ہندوستان کا سفر کرکے وہاں کے علوم و فنون اور رسم و عادات پر کتاب لکھی، تو تمام پچھلی تصنیفیں بازیچۂ اطفال بن گئیں،

ابوریحان بڑا ریاضی داں عالم تھا، اور شیخ بو علی سینا کا معاصر اور بہت سے علوم میں اس کا حریف مقابل تھا، اس نے ہندوؤں کے علوم حاصل کرنے کے لیے جو محنتیں اٹھائیں، وہ حقیقت میں تعجب انگیز ہیں، خود اس کا بیان ہے" اس زبان کے سیکھنے میں مجھ کو نہایت مصیبتیں پیش آئیں، ہندوؤں

[1] جامع القصص الہندیہ،

کا تعصب اس قدر بڑھا ہوا ہے، جس کی کچھ انتہا نہیں، وہ ہم مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں، ہم سے جو چیز چھو جائے ان کے نزدیک ناپاک ہو جاتی ہے، وہ اپنے بچوں کو ہمارے نام سے ڈراتے ہیں، اور ہم کو شیطان کہتے ہیں، ان سب باتوں کے ساتھ وہ تمام دنیا کو جاہل اور وحشی سمجھتے ہیں۔" ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندو اس کو کتابیں دینے میں نہایت بخل کرتے تھے، حالانکہ وہ کتابوں کے خریدنے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا، غرض ان تمام مشکلات کے ساتھ جس طرح ہو سکا، اس نے سنسکرت زبان حاصل کی، اور نہایت کمال درجہ پر حاصل کی، بہت سی مفید کتابوں کے ترجمے کیے بعض کے خلاصے لکھے، چنانچہ ان کا بیان آگے چل کر ہم تفصیل سے لکھیں گے،

مترجموں کا بے شمار گروہ جو دن رات ترجمے کے کام میں مصروف تھا، اگرچہ ہم اُن کے نام اور حالات استقصار کے ساتھ نہیں بتا سکتے، تاہم "مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ" کی بنا پر ہم ان کی ایک اجمالی فہرست حروف تہجی کی ترتیب سے لکھتے ہیں،

مترجمین زبان فارسی

کیفیت	نام
اس کا ذکر اوپر گذر چکا،	عبداللہ بن المقفع
(فہرست ۲۷۴)	فضل بن نوبخت
بہت بڑا عالم تھا، اس کے یہاں متکلمین کی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی، بہت سی کتابیں اس کی تصنیف ہیں، (فہرست ۱۷۶)	ابو سہل اسمٰعیل بن علی بن نوبخت
اس کے ہاں اکثر مترجمین، مثلاً ابو عثمان دمشقی، اسحاق، ثابت وغیرہ کا مجمع رہتا تھا، (فہرست ۱۷۷)	حسن بن موسیٰ بن نوبخت ابی سہل

نام	کیفیت
حسن بن سہل	مشہور منجم تھا، (فہرست ۲۴۴ و ۲۴۵)
موسیٰ بن خالد	داؤد بن عبد اللہ بن حمید بن قحطبۃ کے ہاں ترجمہ کے کام پر مامور تھا، (فہرست ۲۴۴)
یوسف بن خالد	ایضاً
ابو الحسن علی بن زیاد التمیمی	شہریار کی زیچ کا اس نے ترجمہ کیا تھا، (فہرست ۲۴۴)
احمد بن یحییٰ البلاذری	مشہور مورخ ہے، فتوح البلدان جس کے اکثر حوالے میری تصنیف میں ہیں، اسی کی تصنیف ہے، (فہرست ۲۴۴)
جبلہ بن سالم	اوپر گذر چکا،
اسحاق بن یزید	سیرۃ الفرس اسی نے ترجمہ کی تھی، (فہرست ۲۴۵)
محمد بن جہم البرمکی	مشہور مصنف ہے، (فہرست ایضاً)
ہشام بن القاسم	(")
موسیٰ بن عیسیٰ الکردی	(")
زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی	ایران کی تاریخیں جو اس نے ترجمہ کیں، اکثر اس کے حوالے کتابوں میں مذکور ہیں، (فہرست ایضاً)
محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی	(")
بہرام بن مردان شاہ	نیشاپور کا موبد موبدان تھا، (فہرست)
عمر بن فرخان الطبری	گذر چکا،
عبد اللہ بن علی	(فہرست ۳۰۲)

سہل بن ہارون	اوپر گذر چکا،
سعید بن ہارون	"
اسحاق بن علی	(فہرست ۳۱۵)
عبداللہ بن ہلال اہوازی	مترجم کلیلہ ودمنہ للبرامکہ،

مترجمین زبان سُریانی

نام	کیفیت
ماسرجیس یہودی	
عیسیٰ بن ماسرجیس	اوپر گذر چکا،
ہشدی کرخی	"
ابن شہدی کرخی	بقراط کی کتاب الاجنہ کا اس نے ترجمہ کیا تھا،
ایوب الرہاوی	نہایت عمدہ ترجمہ کرتا تھا،
یوحنا بن بختیشوع	
منصور بن باناس	سریانی زبان عمدہ جانتا تھا،
مرلاحی	علامہ ابن الندیم کا معاصر تھا،
داریشوع	اسحاق بن سلیمان کے مترجموں میں تھا،
ایوب بن قاسم الرقی	ایساغوجی کا ترجمہ اسی نے کیا تھا،
متی بن یونان	اوپر گذرا

۵ دیکھو کتاب الفہرست ص ۲۴۴ و طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۰۳ و ص ۲۰۴،

مترجمین زبان سنسکرت

نام	کیفیت
منکہ	اوپر گذرا،
ابن دھن	اس کے باپ کا نام دھن تھا، اور اس کی طرف منسوب ہو کر یہ ابن دھن کہلاتا تھا، بغداد کے ہسپتال کا جس کو برامکہ نے قائم کیا تھا، افسر تھا، (فہرست ۲۴۵)
اسمٰعیل تنوخی	
ابوریحان بیرونی	اوپر گذرا،
فیضی	اکبر کے دربار کا مشہور شاعر ہے،

مترجمین زبان یونانی ولاطینی ونیز سُریانی

نام	کیفیت
اصطفن	اوپر گذرا،
بطریق	منصور کے دربار کا مشہور مترجم تھا،
یحیٰی بن بطریق	مذکور الصدر کا فرزند، حسن بن سہل (وزیر مامون الرشید) کے دربار میں تھا،
حجاج بن مطر	مشہور مترجم، مجسطی اور اقلیدس کا ترجمہ اسی نے کیا تھا،
عبدالمسیح بن ناعمۃ الحمصی	
سلام ابرش	برامکہ کا مشہور مترجم،

نام	کیفیت
حبیب بن بہریز	موصل کا بشپ تھا، مامون الرشید کے لیے ترجمے کیے،
زردیا بن ماحوہ الحمصی	عمدہ ترجمہ کرتا تھا،
ہلال بن ابی ہلال الحمصی	فصیح و بلیغ نہ تھا، لیکن ترجمہ صحیح کرتا تھا،
فیثون	اس کے ترجمہ میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، عربی نہیں جانتا تھا،
تذاری	
ابونصر بن ادی بن ایوب	
بسیل	بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، عمدہ ترجمہ کرتا تھا،
ابونوح بن الصلت	
اسطاث	متوسط درجہ کا مترجم تھا،
جبرون بن رابطہ	
اصطفن بن بسیل	حنین کے قریب قریب ترجمہ کرتا تھا،
ابن رابطہ	
موسیٰ خالد	جالینوس کی اکثر کتابیں ترجمہ کیں،
تیوفیلی	
شملی	
عیسیٰ بن نوح	
ابراہیم قویری	بہت بڑا منطقی تھا، متی بن یونان اسی کا شاگرد تھا،
نذرس	فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کیں،

کیفیت	نام
	زادریع راہب
	ہیا بیشون
	صلیبا
	ایوب رہاوی
	ثابت بن قبع
یہ دونوں محمد بن خالد یحییٰ برکی کے ہاں ملازم تھے،	ایوب / سمعان
طاہر ذوالیمینین کے ہاں ملازم تھا،	باسیل
فلاطون کی کتاب آداب الصبیان کا ترجمہ اسی نے کیا تھا،	ابو عمرو یوحنا بن یوسف
مشہور مترجم	قسطا بن لوقا بعلبکی
"	حنین بن اسحٰق
"	اسحاق بن حنین
"	ثابت بن قرہ
مشہور مترجم حنین بن اسحٰق کا بھانجا تھا،	حبیش الاعسم
حنین بن اسحٰق کا شاگرد تھا،	عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم
متوسط درجہ کا ترجمہ کرتا تھا،	ابراہیم بن الصلت
	ابراہیم بن عبد اللہ
مشہور مترجم	یحییٰ بن عدی

کیفیت	نام
	تفلیسی
راس العین کا رہنے والا تھا، حنین نے اس کے ترجموں کی اصلاح کی ہے،	سرجس
خوزستان کا رہنے والا تھا،	یوسف بن [illegible] الطبیب
جالینوس کی کتاب الکیموس اسی نے ترجمہ کی،	ثابت الناقل
حنین کا مددگار تھا،	قیضا الرہادی
	عبدیسوع بن بہریز
مشہور مترجم،	ابوسعید سعید بن یعقوب
مشہور طبیب اور مترجم تھا،	ابراہیم بن بکس
باپ کا ہمسر تھا،	ابوالحسن علی بن ابراہیم

ترجمہ کا طریقہ اور اسکی صحت

ترجمہ کا اول اول یہ طریقہ تھا کہ اصل میں جو لفظ ہوتا تھا، اس کے ہم معنی الفاظ ڈھونڈھ کر لفظی ترجمہ کرتے جاتے تھے، چنانچہ یوحنا بن بطریق اور ابن ناعمہ حمصی کا یہی طرز تھا، لیکن اس میں دو دقتیں تھیں، اولاً تو ہر لفظ کے مقابل میں ایسا لفظ ملنا جو تمام خصوصیتوں کے لحاظ سے اس کا ہم معنی ہو ناممکن یا قریب ناممکن کے ہے، دوسرے لفظی ترجمہ سے مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان خرابیوں کو دیکھ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا، یعنی یہ کہ پوری عبارت کا مطلب عبارت میں ادا کرتے تھے،

غالباً یہ طریقہ حنین سے شروع ہوا، اور پھر اور لوگوں نے بھی تقلید کی، لیکن چونکہ اکثر ترجمے پہلی قسم کے بھی موجود تھے، اس لیے اصلاح کا طریقہ ایجاد ہوا، یعنی ان ترجموں میں جہاں جہاں ابہام اور پیچیدگیاں تھیں، رفع کر دی گئیں، چنانچہ پچھلے بڑے بڑے نامور مترجم مثلاً ثابت بن قرہ، یحییٰ بن عدی وغیرہ نے ترجمہ سے زیادہ پچھلے ترجموں کی اصلاحیں کیں، اور درحقیقت ان اصلاحوں سے بڑا فائدہ ہوا۔[1]

آجکل یورپ کے ناسپاس مصنف طعنہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے علمی دنیا پر جو احسان کیا، وہ صرف اس قدر کہ یونانی کتابوں کو بعینہٖ عربی میں ترجمہ کر دیا، جس سے یونانی کتابیں محفوظ رہ گئیں، لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے صرف اسی قدر نہیں کیا، بلکہ دنیا کو ان کتابوں کے مطالب سمجھا دیئے جو خود یونان کے شارحوں نے نہیں سمجھے تھے، ارسطو اور افلاطون کی تحریر کا یہ طرز تھا کہ دانستہ مضمون کو پیچیدہ طور پر ادا کرتے تھے، یہاں تک کہ خود ارسطو نے جب کسی قدر اپنی تحریرات میں توضیح سے کام لیا، تو افلاطون نے نہایت جزر کے ساتھ اس کو خط لکھا کہ تم علم کو متبذل اور پامال کرتے ہو، ارسطو نے جواب میں لکھا کہ "میں نے پھر بھی ایسی پیچیدگیاں رکھی ہیں کہ اکثر لوگ اصل مطلب کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے"۔

یہی وجہ تھی کہ خود یونانی مصنفوں نے ان دونوں حکیموں کے مطلب سمجھنے میں غلطیاں کیں، اور رفتہ رفتہ دو جدا فرقے پیدا ہو گئے، حکیم ابو نصر فارابی نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام الجمع بین الرائین ہے، یہ کتاب یورپ میں چھپ گئی ہے، اس میں حکیم مذکور نے دکھایا ہے، کہ افلاطون و ارسطو کا طرز تحریر کیا تھا، اور اس کی وجہ سے زمانۂ بعد میں یونان وغیرہ کے مصنفین نے کیسی غلطیاں کیں، فارابی نے پھر ان غلطیوں کو درست کیا ہے، اور ارسطو و افلاطون کی عبارتوں کا حل کر کے بتایا ہے کہ ان دونوں حکیموں میں کچھ اختلاف نہیں،

ترجموں کی درستی اور صحت میں جو اہتمام بلیغ کیا جاتا تھا، اس کے اندازہ کرنے کے لیئے اس

[1] ترجمے کے ان دونوں طریقوں کا ذکر بہاء الدین عاملی نے اپنی کشکول میں بحوالہ صلاح الدین صفدی کیا ہے،

مقام پر ایک واقعہ نقل کرنا کافی ہوگا۔ مفرد دواؤں کے بیان میں یونان کی سب سے عمدہ تصنیف سیوقوروس کی کتاب المتوکل باللہ کے زمانہ میں اصطفن بن بسیل نے ترجمہ کی، اور حنین نے اس پر نظر ثانی کر کے درست کیا، لیکن جن دواؤں کے نام عربی میں نہ تھے ان کے نام یونانی رہنے دیئے، یہی ترجمہ اسپین پہنچا لیکن یونانی الفاظ کی وجہ سے عام طور پر لوگ منتفع نہیں ہو سکتے تھے، ۳۳۷ھ میں جو عبد الرحمٰن ناصر کی حکومت کا زمانہ تھا، قیصر روم نے (جس کا نام مارنیس تھا) اصل کتاب جس میں دواؤں اور بوٹیوں کی تصویریں بنی تھیں، عبد الرحمٰن کو تحفہ میں بھیجی، عبد الرحمٰن کے دربار میں اگرچہ لاطینی زبان جاننے والے موجود تھے لیکن قدیم یونانی زبان بالکل متروک ہوگئی تھی، اس وجہ سے اطبا اور حکما جو اس کتاب کے حل کرنے کے شائق تھے، یونانی زبان میں مجبور ہو جاتے تھے، عبد الرحمٰن نے خط لکھ کر قیصر روم کے ہاں سے ایک عیسائی عالم کو بلوایا، جو یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں کا ماہر تھا، ۳۴۰ھ میں وہ دربار میں پہنچا، اور اطبائے اسلام مثل محمد شجار، ابن جلجل، بسباسی، ابو عثمان خزاز، محمد بن سعید، عبد الرحمٰن ابن اسحاق، ابو عبد اللہ الصقلی نے نہایت شوق اور توجہ سے یہ کتاب اس سے پڑھنی شروع کی، اس مجمع نے نہایت غور و تحقیق و تجربہ سے خود قرطبہ (کارڈوا) میں ان تمام مجہول دواؤں کے پتے لگائے، اور ان کے ناموں کی تصحیح کی، ابن جلجل جو ان تمام طبیبوں میں نہایت نامور تھا، اس نے ایک مفصل شرح اس کتاب پر لکھی، اور اس کے تمام مقامات حل کیے، ابن جلجل نے ایک اور کتاب لکھی جس میں صرف ان دواؤں کی تفصیل لکھی، جو اس کتاب میں مذکور نہیں۔[1]

ترجمہ کی صحت اور غلطی پر یورپ کے علماء نے بہت بحثیں کی ہیں، اور چونکہ بدقسمتی سے ہم مسلمان یونانی وغیرہ سے بے بہرہ ہیں، اس لیے ہم کو اس باب میں یورپ ہی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، گبن صاحب لکھتے ہیں کہ ان ترجموں کی خوبی پر ناوٹے نے خوب بحث کی ہے، اور کابیری نے دیانت داری سے اسکی حمایت کی ہے۔ لوئیس صاحب نے ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہے کہ مونک کہتا ہے کہ بعض ترجمے نہایت خوبی سے کیے گئے ہیں، فرانس کے نہایت نامور مصنف پروفیسر مونک جس نے مسلمانوں اور یہودیوں کے

[1] طبقات الاطباء تذکرہ ابن جلجل الاندلسی۔

فلسفہ اور اس کے باہمی ربط پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اور جو مدت تک میرے مطالعہ میں رہی ہے، وہ لکھتا ہے کہ جن مصنفوں نے مسلمانوں کے ترجمہ پر بے رحمانہ اعتراضات کیے ہیں، اس کی یہ وجہ ہے کہ انہوں نے اصل عربی ترجمے نہیں دیکھے، بلکہ اُن ترجموں کے ترجمے جو عربی سے لیٹن زبان میں کیے گئے دیکھے ہیں[1]۔

ترجموں کی صحت و غلطی کا تو ہم مجتہدانہ فیصلہ نہیں کر سکتے، اور اسی وجہ سے ہم نے اس بحث میں صرف یورپ کی تقلید کی، لیکن یہ امر ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے ترجمہ کو اصل زبان سے کس قدر آزاد کر دیا، آج انگریزی زبان کس قدر وسیع ہو گئی ہے، لیکن علمی اصطلاحات میں وہی تمام یونانی الفاظ قائم ہیں۔ اگرچہ اس کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ تمام یورپ میں مشترک اصطلاحوں کا قائم رہنا ضرور ہے، اور وہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، کہ یونانی الفاظ بعینہٖ قائم رکھے جائیں، بہرحال عربی ترجمے اس غلامی سے بالکل بری ہیں۔ منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ، طب میں سیکڑوں، ہزاروں اصطلاحی الفاظ تھے، لیکن ان سب کے مقابل میں عربی کے ایسے مناسب الفاظ انتخاب کیے گئے کہ گویا یہ علوم اسی زبان میں پیدا ہوئے تھے۔

یونانی زبان سے تو ملک بالکل ناآشنا ہے۔ لیکن فارسی میں جو اصطلاحیں اسلام سے پہلے موجود تھیں، اور جو دساتیر[2] میں مذکور ہیں، اور ان کے مقابل عربی اصطلاحات کو ہم اس موقع پر نمونہ کے لیے لکھتے ہیں[3]، جس سے ظاہر ہو گا کہ اصطلاحی الفاظ کا کس خوبی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔

---

[1] کتاب مذکور صفحہ ۳۱۴۔ [2] ان صحیفوں کے مجموعہ کا نام ہے جو آتش پرستوں کے اعتقاد میں زردشت وغیرہ پر اترے۔ [3] لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یورپ کے محقق جنھوں نے ژند اور پہلوی زبان میں کمال پیدا کیا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ دساتیر ایک جعلی کتاب ہے، اور اسلام کے بہت بعد تصنیف ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میرے مضمون کا یہ حصہ بے کار گیا۔

اصطلاحات فلسفہ و طب وغیرہ

پہلوی	عربی	پہلوی	عربی
کسی	تشخص	زنجیر	تسلسل
نوشدہ	حادث	آمیغ	حقیقت
فروزہ	صفت	جداشناس	فصل
پرتوی	اشراقی	رہبر	دلیل
رہبری	مشائی	ہمادی	کلی
برین فرہنگ	الہیات	پاژتازی	جزوی
مایہ	ہیولیٰ	ادچیز	ہویت
پیکر	صورت	چارآمیزہ	اخلاط اربعہ
بایستہ ہستی	واجب الوجود	جنبش شمپوری	حرکت قسری
شایستہ ہستی	ممکن الوجود	بازگیر	اعتراض
نخستین اندازخرد	بالبداہتہ	کنور	علّت
نابائے	محال	اشکیوہ	مرکب
چرخہ	دور	کاموس	بسیط

یونانی ولاطینی الفاظ عربی ترجموں میں خال خال اب بھی موجود ہیں، مثلاً اصطلاحات طبی میں کیموس، کیلوس، مالیخولیا، تریاق، نقرس، قولنج وغیرہ، لیکن یہ صرف گویا اس بات کے یادگار ہیں کہ ان علوم کا ماخذ یونان ہے

غیر قوموں کے علوم و فنون جو ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں آئے

مذکورۂ بالا تفصیل کے بعد اب ہم ایک ایک زبان کے متعلق تفصیلی گفتگو کریں گے، اور چونکہ مسلمانوں نے سب سے زیادہ یونان کے علمی ذخیرہ کے ساتھ اعتنا کیا، اسی لیے اول اسی سے شروع کرتے ہیں، پھر فارسی، سریانی، قبطی، سنسکرت وغیرہ کے متعلق لکھیں گے،

یونان

فلسفہ

یونانی فلسفہ کی ابتدا تھیلز (Thales) سے ہوئی، جس کو اہل عرب طالیس کہتے ہیں، یہ حکیم حضرت عیسیٰؑ سے ۶۲۰ برس قبل پیدا ہوا، اس نے مصر میں تعلیم پائی تھی، اور وہیں یہ اصول سیکھا تھا، کہ تمام اشیار پانی سے پیدا ہوئیں، اس کے فلسفہ کو آیونک فلاسفی کہتے ہیں، اس کے بعد فلسفہ کی اور بہت سی شاخیں نکلیں، اور بڑے بڑے حکماء پیدا ہوئے، فلسفہ یونانی کا یہ سلسلہ ۵۲۲ء تک جاری رہا، یعنی جب کہ ایتھنز کا اسکول اسی سنہ میں قیصر روم جسٹنین کے حکم سے بند کر دیا گیا، اس ممتد دور کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، قدیم، جدید، دور قدیم کی انتہا افلاطون پر ہوتی ہے، اور ارسطو سے دور جدید شروع ہوتا ہے، قدماء میں سات بڑے حکیم جو حکمت و فلسفہ کے ستون کہلاتے ہیں، یہ تھے: Thales (طالیس)، Anoxa-Goras (انکساغورس)

Anaxemenes (انکسیانس) (انبذقلس)

Pytha Goras (فیثاغورث) Socrates (سقراط)

Platon (افلاطون)

فیثاغورث کے زمانہ تک تصنیف کا چنداں رواج نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں ہسٹری آف فلاسفی کے عنوان سے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں ان حکماء کی تصنیفات کے بہت کم نام ملتے ہیں، تاہم ان کے فلسفیانہ اصول اور مسائل محفوظ تھے، اور مسلمانوں نے ان سے پوری واقفیت حاصل کی، علامہ شہرستانی نے طالیس، انکساغورس، انکیمانس، اینبدقلس کے اصول پر مفصل گفتگو کی ہے، اور غالباً یورپین تصنیفات میں اصول و مسائل کے متعلق ان سے زیادہ تفصیل نہیں مل سکتی،

اینبدقلس — اینبدقلس کا فلسفہ مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہوا، اس کی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں، محمد بن عبداللہؒ کو جو قرطبہ کا رہنے والا تھا، اینبدقلس کی تصنیفات کا اتنا شوق تھا کہ ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا، ابوالہذیل علاف جو مسلمانوں میں علم کلام کا بہت بڑا فاضل اور خلیفہ مامون الرشید کا استاد تھا، صفات باری کے متعلق اسی حکیم کے خیالات کا پیرو تھا[۱]، اینبدقلس ہی پہلا شخص تھا جو اربعہ عناصر کا قائل ہوا، اور وہی خیال اب تک مسلمانوں میں چلا آتا ہے،

فیثاغورث — فیثاغورث المتولد ۵۸۰ھ قبل مسیح نے فلسفہ کو نہایت ترقی دی، یہاں تک کہ اس علم کا یہ نام اسی کے عہد میں ایجاد ہوا، اس کی تصنیفات جس قدر بہم مل سکیں بہم پہنچائی گئیں، اور ترجمہ کی گئیں، چنانچہ ان میں سے جو علامہ ابن الندیم کے زمانہ یعنی چوتھی صدی کے وسط تک موجود تھیں، حسب ذیل ہیں

رسالۃ فی السیاسۃ العقلیہ، رسالۃ الیٰ متمرد صقلیہ، رسالۃ ابی سیفانس فی استخراج المعانی،[۲]

ابن ابی اصیبعہ نے ان کتابوں کے علاوہ مفصلہ ذیل کتابوں کا بھی نام لیا ہے،

کتاب ارثماطیقی، کتاب الالواح، کتاب فی النوم والیقظہ، کتاب فی کیفیۃ النفس والجسد، الرسالۃ الذہبیۃ، الملخس نے ان کتابوں کی جو شرحیں لکھی تھیں، ان کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا

سقراط — سقراط المتوفی ۳۹۹ھ قبل مسیح، فلسفہ کا باپ تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے اگرچہ مستقل کتابیں نہیں تصنیف کیں، کیونکہ وہ تحریر و تصنیف کا مخالف تھا، تاہم تعلم و تعلیم کے وقت اس نے فلسفہ کے مسائل پر

---

[۱] طبقات الاطباء، ج ۱، ص ۳۷، [۲] فہرست ابن الندیم ص ۲۴۵،

جو تقریریں کیں، اس کے شاگردوں نے اکثر محفوظ رکھیں، اور وہ رسالوں کی شکل میں مرتب ہو کر اس کیطرف منسوب ہیں، چنانچہ ازغالس کو فلسفہ کے متعلق پہیلیوں کے طور پر جو اسرار لکھے، انکو شہرستانی نے اپنی کتاب میں گویا بعبارتہ نقل کیا ہے، اس کے سوا اس نے اپنے عزیزوں کو جو تحریر لکھی اور پالٹیکس پر اسکی جو رائے تھی، اس کی تصنیفات میں محسوب ہیں، اور عربی میں ان کا ترجمہ موجود ہے،

افلاطون افلاطون المتوفی ۳۴۷ سنہ قبل مسیح نے فلسفہ کا بالکل ایک نیا اسکول قائم کیا، اس نے پانچ برس تک سقراط سے تعلیم حاصل کی، سقراط کے مرنے پر مصر گیا، اور فیثاغورث کے شاگردوں سے استفادہ کیا، پھر ایتھنز میں آکر ایک دارالعلوم قائم کیا، اور فلسفہ پر لکچر دینے شروع کیے، اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، تصنیفات میں اس کا خاص طرز یہ ہے کہ فرضی اشخاص کی زبان سے مسائل بیان کرتا تھا، اور کتاب کا نام بھی انہی لوگوں کے نام پر رکھتا تھا، افلاطون کی تصنیفات جو عربی میں ترجمہ کی گئیں، ان کی تفصیل نقشہ ذیل سے معلوم ہوگی،

نام کتاب	مضمون	مترجم یا مفسر
کتاب السیاستہ	پالیٹکس	حنین بن اسحاق
کتاب النوامیس	قانون	حنین و یحییٰ بن عدی
کتاب بنام سوفطس		اسحاق
کتاب بنام طیاوس	مابعد الطبیعتہ	یحییٰ بن البطریق و حنین بن اسحٰق
اصول الہندسہ	جامیٹری کے اصول	قسطا بن لوقا

ان کتابوں کے سوا ابن ابی اصیبعہ نے اور بہت سی کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن کا مجموعہ چھتیس ۳۶ تک پہنچتا ہے،

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افلاطون مطالب کو دانستہ نہایت پیچیدہ طریقہ

سے بیان کرتا تھا، اس لیے خود یونانی حکماء نے اس کے مطلب سمجھنے میں اکثر غلطیاں کیں، لیکن حکمائے اسلام خصوصاً فارابی نے نہایت صحت وخوبی سے ان کی تشریح کی،

ان سات حکماء کے سوا اس دور میں اور اس کے بعد اور بھی اہل کمال گزرے جن کو فلسفیت کی حیثیت حاصل تھی، مثلاً ارسٹیپ المتولد ۴۳۵ھ قبل مسیح جو سقراط کا شاگرد تھا، اور جس کا فلسفہ صرف لذت وعیش پر مبنی تھا، اور ہرقلس (Heracles) المتولد ۵۰۰ھ قبل مسیح جو پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا تھا، اور دیمقراطیس (Democrites) جو اجزائے لایتجزی کا قائل تھا، اور کسنوفانس (Xristophanes) المتولد ۶۱۷ھ ق م، لیکن ان حکما کی مستقل تصنیفات نہ تھیں، البتہ ان کے اصول اور مسائل جو ان کے ہمعصروں یا شاگردوں نے محفوظ رکھے تھے موجود تھے، اور عربی زبان میں ترجمہ کیے گیے، چنانچہ ان تمام حکماء کے فلسفہ کو شہرستانی اور جمال الدین قفطی اور صاعد اندلسی نے تفصیل سے لکھا ہے، اور میرا خیال ہے کہ یورپ کی تصنیفات میں بھی اس سے زیادہ نہیں مل سکتا،

حکمائے متاخرین کا دور ارسطو المتولد ۳۸۴ھ ق م سے شروع ہوتا ہے، وہ امام الفلسفہ کے نام سے مشہور ہے، اور درحقیقت وہ اس لقب کا مستحق تھا، یورپ نے اکثر طعنہ دیا ہے کہ مسلمانوں نے صرف ارسطو کے فلسفہ سے واقفیت حاصل کی، اور ہمیشہ اسی کا کلمہ پڑھتے رہے، یونان کے اور نامور حکماء سے وہ بہت کم واقف ہیں، اگرچہ یہ اعتراض درحقیقت یورپ کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے ارسطو کے سوا تمام اور حکماء کے فلسفیانہ مسائل کا ذخیرہ جو ہم پہنچایا ہے، آج یورپ اس سے زیادہ سرمایہ مہیا نہیں کر سکتا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اور حکماء کی بہ نسبت مسلمانوں نے ارسطو کے فلسفہ کے ساتھ زیادہ اعتناء کیا، جس کے مختلف اسباب تھے، اوّل تو ارسطو سے پہلے تصنیف وتالیف کا منتظم طریقہ نہیں قائم ہوا تھا، اس واسطے حکمائے قدیم کے خیالات اور مسائل اچھی طرح منضبط نہیں تھے، فلاطون نے تصنیف کو زیادہ ترقی دی، لیکن وہ مضامین کو نہایت پیچیدہ طور سے ادا کرتا تھا، اور اس کو فرض منصبی خیال کرتا تھا، چنانچہ جب اس کی زندگی میں ارسطو کی بعض مفصل تصنیفات شایع ہوئیں، تو اس نے

ارسطو کو نہایت ناراضی کا خط لکھا، کہ اسرار فاش کیے دیتے ہو[1] شاید یہی وجہ بھی تھی کہ ایپکیورس (Epicurus) ڈایاجینز (Diogenes) دیمقراطیس وغیرہ کے بعض مسائل اسلام کے برخلاف تھے، لیکن ارسطو کا فلسفہ اسلام سے ملتا جلتا تھا، ارسطو وحدانیت، صفات باری، ثواب، عقاب، حشر ونشر کا قائل تھا۔

بہرحال یہ عیب ہو یا ہنر، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں نے نہایت جدوجہد سے ارسطو کی ایک ایک تصنیف بہم پہنچائی، اور ان سب کے ترجمے کیے، چنانچہ ہم اس موقع پر اس کی تصنیفات کی ایک مفصل فہرست لکھتے ہیں،

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
قاطیغوریاس Catogory	مقولات عشر یعنی کم کیف وغیرہ	حنین بن اسحاق	فارابی، متی، ابن مقفع، ابن بہریز، کندی اسحٰق، احمد بن طیب، رازی نے اس کے خلاصے اور شرحیں لکھیں،
باری ارمیناس	اس میں مقولات مرکبہ کا بیان ہے	حنین واسحاق	حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا، متی، فارابی نے شرحیں لکھیں، اسحاق، ابن مقفع، کندی، ابن بہریز، رازی احمد بن طیب نے خلاصے لکھے،
انالوطیقا اول Analytic	تحلیل قیاسات	تیوڈورس	حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں اس کے بعض اجزا کا ترجمہ کیا، کندی دمتی نے شرح لکھی،

[1] افلاطون اور ارسطو کی اس خط وکتابت کو فارابی نے کتاب الجمع بین الرائین میں نقل کیا ہے، دیکھو رسائل فارابی مطبوعہ یورپ صفحہ

نام	مضمون	مترجم	کیفیت
انالوطیقا ثانی	برہان	اسحاق وغیرہ	حنین نے بعض اجزاء کا سریانی میں ترجمہ کیا متی نے اس سریانی کی عربی کی، متی کندی فارابی نے شرحیں لکھیں،
طوبیقا Topics	بحث وجدل	یحیٰی بن عدی	اسحاق نے سریانی میں، اور یحیٰی بن عدی نے اس سریانی کا عربی میں ترجمہ کیا، سات مقالے دمشقی نے ترجمہ کئے، اور ابراہیم بن عبداللہ نے آٹھ مقالے، یحیٰی بن عدی نے ہزار ورق میں شرح لکھی، فارابی، متی نے بھی شرحیں لکھیں،
سوفسطیقا Sophistiq	مغالطہ	ابن ناعمہ	متی وابن ناعمہ نے سریانی میں ترجمہ کیا، اور یحیٰی وقویری وابراہیم نے عربی میں
ریطوریقا Rhytoric	فصاحت وبلاغت یا خطابت	اسحق وابراہیم بن عبداللہ	فارابی نے شرح لکھی،
بوطیقا Poetic	شاعری	متی ویحیٰی بن عدی	متی نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا،

یہ آٹھوں کتابیں منطق میں ہیں، کیونکہ ارسطو نے منطق کے آٹھ حصے قرار دیئے تھے، ان میں سے قاطیغوریاس یورپ میں چھپ گئی ہے، اور باری ارمیناس وانالوطیقا اول وثانی مع شرح ابن رشد کا قلمی

نسخہ اس وقت میرے مطالعہ میں ہے، ارسطو کی اور تصنیفات حسب ذیل ہے

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
سمع الکیان	طبعیات میں ہے، اور ہیولیٰ، صورت، مکان، حرکت زمانہ کا بیان ہے	حنین وقسطا بن لوقا وغیرہ	یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے
کتاب السماء والعالم	اس میں عناصر اربعہ اور فلک کا بیان ہے،	ابن البطریق ومتی	ابو زید بلخی، اور جعفر خازن نے اسکی شرح لکھی، ابو ہاشم نے اصل کتاب پر ردوقدح کیا،
کتاب الکون والفساد	انقلابات عناصر کا بیان ہے	حنین و اسحاق	حنین نے سریانی اور اسحاق ودمشقی نے عربی میں ترجمہ کیا، مقالۂ اول کا ترجمہ قسطا نے کیا،
الآثار العلویہ	عنصریات		ابن رشد نے اس کے ترجمہ کی جو اصلاح کی وہ میری نظر سے گذرا ہے
کتاب النفس	نفس کی حقیقت کا بیان ہے	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا اسحق نے دو ترجمے ناقص وکامل کیے،
کتاب الحس والمحسوس	حس کے اسباب وعلل سے بحث کی ہے،		اس کتاب کی تلخیص جو ابن رشد نے کی ہے وہ میری نظر سے گذری ہے
کتاب الحیوان	حیوانات کا بیان ہے۔	ابن البطریق	نو مقالے ہیں۔ سریانی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا،

کیفیت	مترجم	مضمون	نام کتاب
ثابت بن قرہ نے ترجمہ کی اصلاح کی، میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے،	اسحٰق بن حنین	نباتات کا بیان ہے	کتاب النبات
فرفوریوس مصری نے اس کتاب کی جو تفسیر کی، وہ یورپ میں چھپ گئی ہے،	کندی	الہیات	اثولوجیا
حروف الف سے میم و واؤ تک اس کا نسخہ ملا جس کا ترجمہ یحیٰی بن عدی نے کیا،	یحیٰی بن عدی	یونانی حروف تہجی کی ترتیب پر ہے،	کتاب الحروف
فرفوریوس نے اس کے بارھویں مقالہ کی تفسیر لکھی جس کا ترجمہ اسحٰق بن حنین نے کیا،	اسحٰق بن حنین		کتاب الاخلاق
	حجاج بن مطر		کتاب المرآۃ

ان کتابوں کے سوا ارسطو کی اور بہت سی تصنیفات ہیں، اور ان سب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، چنانچہ ان میں سے جو کتابیں ساتویں صدی تک موجود تھیں، اور علامہ ابن ابی اصیبعہ کی نگاہ سے گذریں، حسب ذیل ہیں:

کتاب[1] الفراسۃ، کتاب[2] السیاسۃ المدنیۃ، کتاب[3] السیاسۃ العلمیۃ، مسائل[4] فی الشراب کتاب[5] فی التوحید، کتاب[6] الشباب والہرم، کتاب[7] الصحۃ والسقم، کتاب[8] فی الاعداء، کتاب[9] فی الباہ رسالۃ[10] الی ابنہ، وصیۃ[11] الی نیقاتر، کتاب[12] الحرکۃ، کتاب[13] فضل النفس، کتاب[14] فی العظم الذی لایتجزیٰ،

کتاب[۱۵] النقل، الرسالة[۱۶] الذہبیة، رسالة[۱۷] الی الاسکندر فی تدبیر الملک، کتاب[۱۸] الکنایات، کتاب[۱۹] فی علل النجوم، کتاب[۲۰] الانوار، رسالة[۲۱] فی الیقظة، کتاب[۲۲] الاحجار، السبب[۲۳] فی خلق الاجرام السماویة، کتاب[۲۴] فی الروحانیات، رسالة[۲۵] فی طبائع العالم، کتاب[۲۶] الاصطاخیس، کتاب[۲۷] الحیل، کتاب[۲۸] ما بعد الطبیعة، کتاب[۲۹] نعت الحیوانات الغیر الناطقة، کتاب[۳۰] ایضاح الخیر المحض، کتاب[۳۱] الملاطیس، کتاب[۳۲] فی نعت الدم، کتاب[۳۳] المعادن، کتاب[۳۴] اسرار النجوم، کتاب[۳۵] الغالب والمغلوب،

ارسطو کے بعد تصنیف وتالیف کا عام رواج ہو گیا، اور اس زمانہ میں جس قدر حکماء پیدا ہوئے اکثر صاحب تصنیف ہوئے، ارسطو کا فلسفہ اگرچہ درحقیقت افلاطونی فلسفہ سے مختلف نہ تھا، لیکن دونوں حکیموں کی طرز تحریر وادائے مطالب میں اس قدر اختلاف تھا، کہ لوگوں نے ان کو باہم مخالف سمجھا، اور اس بنا پر فلسفہ کے دو الگ الگ اسکول قائم ہو گیے، ارسطو کے فلسفہ نے زیادہ وسعت حاصل کی، اور اس کے پیرووں میں بڑے بڑے مشہور حکیم پیدا ہوئے، ان میں سے ثاؤفرسطس (Theophrastus) اور اسکندر افرودسی (Alexender Aphrodisius) زیادہ مشہور ہیں،

ثاؤفرسطس سنہ ۳۱۰ ق م ارسطو کا خاص شاگرد تھا، اور ارسطو نے اپنے مدرسہ کا اس کو جانشین مقرر کیا تھا، یونان کے بڑے بڑے حکماء اس کے حلقۂ درس میں بیٹھتے تھے، وہ قائل تھا کہ خدا کی ذات وصفات میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہو سکتا، وہ ستاروں کو روحانی اجسام مانتا تھا، اور ان کے مدبر عالم ہونے کا قائل تھا، فلسفہ میں اس کی متعدد تصنیفات ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

کتاب[۱] النفس، کتاب[۲] الآثار العلویة، کتاب[۳] الادب، کتاب[۴] الحس والمحسوس، کتاب[۵] ما بعد الطبیعة، کتاب[۶] النبات، یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں پچھلی تین کتابوں کا ترجمہ ابراہیم ابن بکس اور یحییٰ بن عدی نے کیا[1]۔

اسکندر افرودسی دمشق سنہ ۱۲۹ء میں پیدا ہوا، اس نے ارسطو کی تصنیفات پر نہایت کثرت

---

[1] دیکھو شہرستانی مطبوعہ یورپ ص ۲۴۷ و فہرست ابن الندیم ذکر ثاؤفرسطس،

سے شرحیں لکھیں، وہ ارسطو کے فلسفہ کا ایک بڑا رکن تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے بعض اصول خود بھی ایجاد کیے، چنانچہ خدا کے عالم کلیات وجزئیات ہونے پر اول اسی نے دلیل قائم کی، اسی نے ارسطو کے برخلاف یہ مسئلہ بیان کیا کہ نفس کو مفارقت بدن کے بعد کسی قسم کا ادراک واحساس نہیں ہو سکتا۔ اس کی شرحیں اور مستقل تصنیفات دونوں عربی میں ترجمہ کی گئیں، چنانچہ نقشۂ ذیل سے تفصیل معلوم ہوگی۔

ترجمۂ شروح

نام کتاب	مترجم	کیفیت
شرح قاطیغوریاس	ابوزکریا	یہ شرح ۶۰۰ صفحوں میں ہے،
شرح انالوطیقا		مصنف نے اس کی دو شرحیں لکھیں، ایک زیادہ مفصل اور کامل ہے،
شرح طوبیقا		آٹھ مقالوں میں سے صرف پانچ مقالوں کی شرح ہے،
شرح سماع طبعی	ابوروح الصابی وحنین وقسطا ودمشقی	ان مترجموں نے کتاب کے مختلف حصوں کے ترجمے کیے،
شرح کتاب السماع والعالم		صرف پہلے مقالہ کی شرح ہے،
شرح کتاب الکون والفساد	متی وقسطا	
شرح الآثار العلویہ		اس شرح کا ترجمہ پہلے عربی میں کیا گیا، پھر یحییٰ ابن عدی نے اس ترجمہ کا ترجمہ سریانی زبان میں کیا۔
شرح کتاب الحروف		

اسکندر افرودسی کی جو تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں،

کتاب[۱] النفس، کتاب[۲] الرد علی جالینوس فی التمکن، کتاب[۳] الرد علی جالینوس فی الزمان، کتاب[۴] الابصار، کتاب[۵] اصول العامۃ، کتاب[۶] عکس المقدمات، کتاب[۷] مبادی الکل، کتاب[۸] فی ان الموجود لیس بجنس للمقولات العشر، کتاب[۹] العنایۃ، کتاب[۱۰] الفرق بین الہیولیٰ والجنس، کتاب[۱۱] الرد علی من قال انہ لایکون شیٔ الا من شیٔ، کتاب[۱۲] فی ان الابصار لایکون الا بشعاعات تنبث من العین، کتاب[۱۳] اللون، کتاب[۱۴] الفصل، کتاب[۱۵] المالیخولیا،[۱]

فلسفہ ارسطو کے اور بہت سے شارح و مفسر گذرے، جن کی تصنیفات کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا، مثلاً نیقولاؤس، امیقدردس،

نیقولاوس نیقولاؤس (Niqolaus) نے علاوہ شرحوں کے مستقل تصنیفات بھی کیں، چنانچہ ان میں سے کتاب فی فلسفۃ ارسطو فی النفس و کتاب النبات و کتاب الرد علی جاعل الفعل والمفعولات شیئاً واحداً و کتاب اختصار فلسفۃ ارسطو کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا،

پلوٹارک ارسطو کا فلسفہ اگرچہ تمام ملک پر قبضہ کر چکا تھا، اور پچھلے حکماء کے پیرو بہت کم رہ گئے تھے، تاہم معدوم نہیں ہوئے تھے، سنہ ۵۰ء میں پلوٹارک (Plutarch) جو سنہ ۸۰ء میں موجود تھا، اس نے سقراط کے فلسفہ کو رونق دی، اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی، اس کی تصنیفات نہایت مقبول ہوئیں، اور وہ مجدد فلسفہ قرار پایا، انگریزی مورخوں نے لکھا ہے کہ شکسپیر نے اپنی پیزیں قوم کی اخلاقی حالت کی جہاں جہاں تصویر کھینچی ہے، اکثر پلوٹارک کے بیان سے مدد لی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ حصے نہایت موثر اور مفید ہیں، بہرحال مسلمانوں نے باوجود اس کے کہ وہ فلسفۂ ارسطو کے زیادہ دلدادہ تھے، پلوٹارک کے فلسفہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور اس کی اکثر تصنیفات کے ترجمے کیے، اس نے ایک کتاب میں طبعیات کے متعلق تمام حکماء کی رائیں نقل کی تھیں، قسطا بن لوقا نے اس کا ترجمہ کیا، اس کے سوا اس کی اور کتابیں مثلاً کتاب الی موریالیا، کتاب الغضب، کتاب الریاضۃ، کتاب النفس، عربی و سریانی

---

[۱] اسکندر افرودسی اور اس کی تصنیفات کے لیے دیکھو فہرست ابن الندیم ص ۲۵۲ و طبقات الاطباء ج ۱ ص ۶۹،

میں ترجمہ کی گئیں،

یہ تقسیم زمانہ کے اعتبار سے تھی، لیکن اصولِ فلسفہ، طرزِ تعلیم، اخلاق وعادات کے لحاظ سے فلسفہ کے سات اسکول قرار دیئے گئے ہیں،

(۱) فیثاغورثیہ	اس کا حال اوپر گذر چکا،
(۲) قورنیتیہ	اس فرقہ کا بانی ارسیفورس تھا، اور چونکہ وہ قورنیا کا رہنے والا تھا، اس لئے یہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہوا،
(۳) رواقیہ	(اسٹوک) (Stoic) اس فرقہ کا بانی زینون (Zeno) المتولد ۳۴۰ سنہ ق م تھا، اور چونکہ وہ چھت کے نیچے بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا، رواقیہ کے نام سے مشہور ہوا،
(۴) کلابیہ	(Dogmatic) اس فرقہ کا بانی اینٹیتن تھا، یہ حکیم تمام آدمیوں کو حقیر سمجھتا تھا، اور خاص کر امراء اور دولتمندوں کو گویا کاٹ کھانا چاہتا تھا، اس مناسبت سے لوگ اس کو کتا کہتے تھے، اور اسی مناسبت سے اس فرقہ کا نام کلابیہ مشہور ہو گیا، اس فرقہ کا سب سے نامور شخص دیوجانس کلبی (Diogenes) تھا، جس کے حالات اور اقوال وافعال عربی کتابوں میں اکثر مذکور ہیں، وہ ۴۱۳ سنہ ق م میں پیدا ہوا،
(۵) مانو	اس کا بانی فورن تھا، اور چونکہ وہ لوگوں کو تعلیم سے منع کرتا تھا اس لئے اس نام سے مشہور ہوا،
(۶) لذتیہ	اس کا بانی اپیکورس المتولد ۳۳۶ سنہ ق م تھا، جس کا فلسفہ یہ تھا کہ آئندہ حشر ونشر کچھ نہیں اس لیے جس قدر ہو سکے یہاں عیش کر لینا چاہیئے،
(۷) مشائین	اس کے بانی افلاطون اور ارسطو تھے، اور چونکہ یہ لوگ پڑھانے کے وقت

ٹہلتے جاتے تھے، اور پڑھاتے جاتے تھے، اس لیے اس نام سے مشہور ہوئے،

ان میں سے بعضوں نے تصنیف وتالیف نہیں کی، بلکہ زبانی تعلیم کی تعلیم کرتے تھے، چنانچہ ان کے اصول اور اقوال دوسروں کی تصنیفات میں حوالہ کے طور پر ملتے ہیں، غرض ان میں سے جن حکماء کی تصنیفات موجود تھیں، عربی میں ترجمہ کی گئیں، اور جن کے صرف اقوال اور مسائل محفوظ تھے، اسی حیثیت سے محفوظ رہے، چنانچہ علامہ شہرستانی نے دیوجانس، اپیکورس، زینون کے اقوال اور مسائل کو اپنی کتاب میں نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعضوں کا اصول چونکہ مذہب اسلام کے مخالف تھا، اس لیے ان کی پیروی نہیں کی گئی، لیکن بعض بعض حکمائے اسلام کے خیالات میں ان کا پرتو پایا جاتا ہے، مثلاً عمر خیام کی رباعیاں اپیکورس کے خیالات سے لبریز ہیں، لیکن چونکہ وہ خیالات شاعری کے پردہ میں ادا کیے گئے ہیں، اس لیے الحاد وزندقہ کے طعنہ سے کسی قدر وہ محفوظ رہا،

زینون وحدت وجود کا قائل تھا، اور یہ خیال تو اس وسعت سے مسلمانوں میں پھیلا کہ ایک بڑے مذہبی گروہ کا دارومدار اسی پر ہے،

یونان کے فلسفہ نے وہ قبول حاصل کیا، کہ مصر کے درسگاہوں میں جہاں کسی زمانہ میں خود حکمائے یونان نے تعلیم پائی تھی، اس کا رواج ہو گیا، اسکندریہ کے تمام مدارس میں یونانی ہی فلسفہ پڑھایا جاتا تھا، کچھ دنوں تک تو مقلدانہ تعلیم رہی، پھر وہاں خود ایسے اہل کمال پیدا ہو گئے، کہ فلسفہ کے خاص خاص اسکول کے بانی قرار پائے، چنانچہ امونیس (Ammonius) نے جو ۲۲۰ء میں تھا، ایک نئے طریقہ کی بنیاد ڈالی، جس کا نام نیو پلاٹونیزم یعنی جدید فلسفۂ افلاطونی ہے، اس حکیم نے افلاطون کے فلسفہ میں چند خاص اصول اضافہ کیے، اور بہت سے لوگ اس کے پیرو ہو گئے، امونیس نے ارسطو کی بہت سی کتابوں پر شرحیں بھی لکھیں مثلاً شرح قاطیغوریاس، شرح طوبیقا وغیرہ، چنانچہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا،

امونیوس نے مستقل تصنیفیں بھی لکھیں، جو عربی میں ترجمہ کی گئیں، مثلاً شرح مذہب ارسطالیس فی الصانع، کتاب فی اغراض ارسطالیس کتاب حجۃ ارسطالیس فی التوحید،

نیو پلاٹو نیزم یعنی جدید فلسفۂ افلاطونیہ جو اسکندریہ میں قائم ہوا، اس کے اصول اولین چار تھے،

(۱) خدا میں تین اقنوم ہیں، وحدت، فہم، قوت،

(۲) نفس وحدت حاصل کرسکتا ہے، اور اس حیثیت سے خدا کی برابری حاصل کرسکتا ہے،

(۳) موجودہ زندگی کے تصورات سب وہم و خیال ہیں،

(۴) مادہ نہایت حقارت کے قابل ہے،[1]

اس فلسفہ کے مشاہیر حکماء یہ تھے،

فرفوریوس (Porphyrius) ۲۳۳ء میں پیدا ہوا، فن بلاغت کی تحصیل ایتھنز میں کی، یہ مذہب عیسوی کا مخالف تھا، اور عیسائیت کے رد میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں، فلسفہ میں ارسطو کی اکثر کتابوں کی شرح لکھی، اور کلیات خمس کی ترتیب اسی نے دی، مسلمانوں نے اس کی تصنیفات کو بڑی جد و جہد سے مہیا کیا، اور ان کے ترجمے کیے، جن کی تفصیل ذیل میں ہے:

نام		
ایساغوجی	یعنی کلیات خمس	
مدخل الی القیاسات		ابو عثمان دمشقی
کتاب العقل والمعقول		
انابو کے نام دو کتابیں	انابو، فرفوریوس کا شاگرد تھا،	
کتاب الرد علی بجیوس	عقل و معقول کے بیان میں ہے،	
الاسطقسات	عناصر کا بیان ہے	
شرح کتاب باری ارمینا س		
لارسطو،		

[1] میزان الحق مطبوعہ بیروت ص ۳۰۴،

نام کتاب	مضمون	مترجم
شرح کتاب سماع طبعی لارسطو		بسیل
شرح کتاب اخلاق لارسطو		اسحٰق بن حنین، یہ کتاب بارہ[۱۲] مقالوں میں ہے

فرفوریوس نے حکماء کے حال میں ایک نہایت مفصل اور مفید کتاب لکھی تھی، اس کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا، چنانچہ طبقات الاطباء کا ابتدائی حصہ بہت کچھ اسی سے ماخوذ ہے۔ اور مسلمان مصنفون نے حکمائے یونان کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں، اکثر اس سے ماخوذ ہیں،

اس فلسفہ کا دوسرا مشہور حکیم برانلس تھا، یہ ۴۱۲ء میں پیدا ہوا، فلسفہ و ریاضی میں استاذ وقت تھا، یہ بھی مذہب عیسوی کا سخت مخالف تھا، اس کی اکثر تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں، جن کی تفصیل ذیل میں ہے:

نام کتاب	مضمون
کتاب حدود اوائل الطبیعات	
ثمان عشرة مسائل	اٹھارہ[۱۸] مسئلوں کا بیان ہے،
شرح قول فلاطون فی النفس	تین مقالوں میں ہے،
اثولوجیا	یعنی الٰہیات
تفسیر وصایائے فیثاغورث	فیثاغورث کی وصیتیں جو آب زر سے لکھی گئی تھیں، ان کی شرح ہے، دو سو[۲۰۰] صفحوں میں ہے،
الجواہر العالیہ	
دیادوخس	یونانی نام ہے، اس میں دس[۱۰] مسئلوں پر بحث ہے،

الخیر الاول	
المسائل العشر المعضلات	دس نہایت مشکل مسئلوں پر بحث ہے،
الجزء الذی لا یتجزی	جزء الذی لا یتجزی کی بحث میں ہے۔

ثامسطیوس

اس طبقہ کا ایک اور مشہور حکیم ثامسطیوس (Themisteas) تھا، جو ۳۵۵ء میں تھا، یہ بھی عیسائیت کا منکر تھا، اور شاید یہی وجہ تھی کہ بادشاہِ روم لیولیانس نے جو مذہب عیسوی کا سخت دشمن تھا، اس کو اپنا سکریٹری مقرر کیا تھا، اس نے ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھیں، جن میں سے شرح کتاب قاطیغوریاس، شرح انالوطیقا، شرح انالوطیقا ثانی، تفسیر کتاب طوبیقا، تفسیر سماع طبعی، تفسیر کتاب السماء والعالم، تفسیر کتاب الکون والفساد، تفسیر کتاب النفس، تفسیر کتاب الحروف کا ترجمہ عربی زبان میں موجود ہے، علامہ ابن الندیم نے ان کتابوں کی اور ان کے مترجموں کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

ثامسطیوس کی ذاتی تصنیفات بھی ہیں، اور ان کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا، ان میں سے ایک کتاب نفس کی بحث میں ہے، اور باقی دو رسالے ہیں، جو اس نے لیولیانس کو لکھے تھے۔

یحیٰی نحوی

حکمائے اسکندریہ کا خاتم یحیٰی نحوی (John the Grammarian) تھا، جو اسلام کے زمانہ تک موجود رہا، اور حضرت عمرو بن العاص رضی نے اس کی بہت قدر و منزلت کی، وہ بہ یک واسطہ برقلس کا شاگرد تھا، اور اس کی صحبت سے مشرف ہوا تھا، یحیٰی کا اصل فن طب تھا، چنانچہ اس کی طبی تصنیفات کا ذکر آگے آتا ہے، لیکن اس نے فلسفہ پر بھی کتابیں لکھیں، چنانچہ ارسطو کی کتاب قاطیغوریاس وانالوطیقا اول و دوم وطوبیقا وسماع الطبعی والکون والفساد، ان سب کتابوں کی شرحیں لکھیں، ان کے سوا اس کی مستقل تصنیفات بھی ہیں، ایک کتاب برقلس کے رد میں ہے، اور اٹھارہ مقالوں میں ہے، ارسطو کے رد میں بھی اس نے ایک کتاب چھ مقالوں میں لکھی، ان کے سوا اور تصنیفیں بھی ہیں، چنانچہ ان سب کی تفصیل علامہ ابن الندیم و ابن ابی اصیبعہ نے کی ہے، یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، اور ان میں سے بعض آج تک موجود ہیں،

ہیئت

اس فن کا موجد تھیلس (ثالیس ملطی) کہا جاسکتا ہے، جو حضرت عیسیٰؑ سے ۶۶۰ برس پہلے تھا، اس نے زمین کو مرکز کائنات مانا، اور وہ پہلا شخص ہے جس نے زیچ بنائی، اور خسوف کی پیشین گوئی کی، اس کے بعد فیثاغورث وافلاطون نے اس فن کو نہایت ترقی دی، فیثاغورث نے جو ۵۳۶ھ ق م تھا، بجائے زمین کے آفتاب کو مرکز مانا، ان حکما کی تحقیقات اور مسائل اگرچہ عربی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں، لیکن اس فن کے متعلق ان کی کسی مستقل تصنیف کا ہم کو پتہ نہیں ملتا، جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو، البتہ اس دور کے بعد جن حکماء نے اس فن کو ترقی دی، ان کی کتابوں کے ترجمے عربی میں موجود ہیں، ان میں سب سے مقدم اور نامور ارسترخوس تھا، جو ارشمیدس کا ہمسر تھا،

ارسترخوس — ارسترخوس یونانی الاصل اور حضرت عیسیٰؑ سے ۲۷۰ برس پہلے تھا، یہ اس بات کا قائل تھا کہ زمین آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے، اس کی تصنیفات میں سے جس کتاب کا ترجمہ موجود ہے، اس کا نام جرم الشمس والقمر ہے، اس میں آفتاب و ماہتاب کی جسامت اور مقدار اور فاصلہ کا بیان ہے، یہ عجیب بات ہے کہ یورپ کو بھی باوجود انتہائے تلاش کے یہی ایک کتاب مل سکی، چنانچہ اصل کتاب ۱۶۸۸ء اور اس کا فرنچ ترجمہ ۱۸۱۰ء میں چھاپا گیا،[1]

اسی دور کا دوسرا مشہور فاضل ابرخس (Hipparchus) ہے، جو حضرت عیسیٰؑ سے ۱۴۰ برس قبل تھا،

ابرخس — ابرخس نے اس فن میں بہت کچھ اضافہ کیا، علم ہیئت میں جبر و مقابلہ سے اول اسی نے کام لیا، اس مصنف کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، لیکن تعجب یہ ہے کہ علامہ ابن الندیم نے جن کتابوں کا نام لکھا ہے، وہ جبر و مقابلہ کے متعلق ہیں ہیئت کی کسی کتاب کا نام نہیں لکھا،

بطلیموس — بطلیموس، یہ پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب بنایا، اور آلات نجوم تیار کیے، اس کے زمانہ میں

[1] دائرۃ المعارف مرتبۂ زمانہ حال و فہرست ابن الندیم ص ۲۷۰

بہت بڑے سامان سے رصدخانہ بنا، اور اجرام فلکی کے حالات تحقیق کیے گئے، مسلمانوں نے اس کی ہیئت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، چنانچہ اس کی کتاب مجسطی کا ترجمہ بڑے اہتمام اور جدوجہد سے ہوا، سب سے پہلے یحییٰ بن خالد برمکی نے اس کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، چنانچہ بہت سے مترجمین نے اس کی فرمائش سے ترجمے کیے اور تفسیریں لکھیں، لیکن وہ سب مبہم اور غیر مفہوم تھیں، اس لیے اس نے بیت الحکمۃ کے افسروں یعنی ابو حسان کو اس کام پر مامور کیا، ان لوگوں نے نہایت مشہور اور نامور مترجموں کو جمع کر کے ترجمہ کرایا، اور نہایت محنت کے ساتھ ترجمہ کیا گیا، اس کتاب کے کل ترجمے جو مقبول ہوئے، تین ہیں، ایک حجاج بن مطرکا، دوسرا اسحاق کا، جس کو ثابت نے صحیح کیا، تیسرا خود ثابت کا، چونکہ مامون الرشید کو اس کتاب کے ساتھ نہایت شغف تھا، اس کے حکم سے حنین بن اسحاق نے بھی ترجمہ کیا، حجاج بن یوسف و ثابت بن قرہ نے زوائد سے پاک کر کے خلاصہ لکھا، ابوریحان بیرونی نے اس کا اختصار کیا، اور عمرو بن فرخان، ابراہیم بن الصلت، فضل بن حاتم، شمس الدین سمرقندی، نظام الدین نیشاپوری وغیرہ نے شرحیں لکھیں،[1]

بطلیموس کا نظام تمام یورپ میں مدتوں یعنی کوپرنکس کے زمانہ تک متداول رہا، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ بطلیموس کی یہ کتاب (مجسطی) اول عرب ہی کی بدولت یورپ میں پہنچی، چنانچہ عربی زبان سے لاطین میں اس کا ترجمہ کیا گیا، پھر یونانی نسخہ بھی ملا، اور فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا گیا جو پیرس میں ۱۸۱۶ء میں چھاپا گیا،[2]

بطلیموس نے آلات رصدیہ میں ذات الحلق اور ذات الصفائح پر دو مستقل کتابیں لکھیں، اور ایک نہایت مفصل کتاب علم نجوم میں لکھی، جس کا نام قانون ہے، یہ کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں، چنانچہ مؤرخ یعقوبی نے ان کتابوں کے ابواب اور فصلوں کے مضامین کو تفصیل سے لکھا ہے بطلیموس کی اور تصنیفات جو ترجمہ کی گئیں، حسب ذیل ہیں:

کتاب الموالید، کتاب استخراج السہام، کتاب تحویل سنی العالم، کتاب تحویل سنی الموالید

---

[1] کتاب الفہرست و کشف الظنون و دائرۃ المعارف۔ [2] دائرۃ المعارف،

کتاب[5] المرض وشراب الدوا، کتاب[6] فی سیر السبعہ، کتاب[7] فی الاسرار والمجین، کتاب[8] فی اثر البعد و،
کتاب[9] تخصیص ایہا یفلج، کتاب[10] ذوات الذوایب، کتاب[11] السابع، کتاب[12] القرعہ، کتاب[13] اقتداص
احوال الکواکب، کتاب[14] الثمرہ، کتاب[15] الاربعہ، یہ کتاب ایک شاگرد کے نام سے لکھی تھی، ابراہیم بن
الصلت نے اس کا ترجمہ کیا، حنین نے اصلاح کی، ثابت وعمرو بن الفرخان وغیرہ نے شرحیں لکھیں، یہ تینوں
حکیم فن ہیئت کے بانی اور موجد خیال کیے جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے علاوہ اور اہل کمال
کی بھی کتابیں بہم پہنچائیں، اور ترجمہ کیں، چنانچہ تفصیل حسب ذیل ہے،

اوطولوقس

اوطولوقس (Autolycus) یہ ارسطو کا معاصر اور دیوجانس کا استاد تھا، اس کی
دو کتابیں اس فن میں ہیں، اور دونوں کا ترجمہ کیا گیا، کتاب الکرۃ المتحرکۃ، کتاب الطلوع والغروب،

البسقلاوس

البسقلاوس (Hypsicles سنہ ۱۶۰ ق م میں تھا، اور اسکندریہ میں رہتا تھا، اس
کی تصنیفات میں کتاب الاجرام والابعاد، کتاب الطلوع والغروب کا ترجمہ ہوا، اس نے اقلیدس
کے چوتھے اور پانچویں مقالہ کی اصلاح بھی کی تھی، اور اس کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا،

ثاون

ثاون (Theon) اسکندریہ کا رہنے والا تھا، اس نے آلات رصدیہ میں سے ذات الحلق
اور اصطرلاب کے متعلق دو مستقل کتابیں لکھیں، بطلیموس کی زیج پر بھی ایک کتاب لکھی، مجسطی پر بھی
اس کی ایک کتاب ہے، چنانچہ ان سب کتابوں کا ترجمہ کیا گیا،

فالیس رومی

فالیس رومی، اس کی تصنیفات جن کا ترجمہ ہوا، حسب ذیل ہیں:
مدخل الی صناعۃ النجوم، کتاب الموالید، کتاب المسائل، کتاب الزایجہ، کتاب المسائل الکبیر،
کتاب السلطان، کتاب الامطار، کتاب تحویل سنی العالم، کتاب الملوک،

تیودورس

تیودورس (Theodorus) اس کی تصنیفات جو ترجمہ ہوئیں حسب ذیل ہیں،
کتاب الاکر، کتاب المساکین، کتاب اللیل والنہار،

ببس

ببس (Pappus) ثاون اسکندرانی کا معاصر تھا، اس نے بطلیموس کی کتاب پر جو کرہ
کی تسطیح کے متعلق ہے، شرح لکھی، اس کتاب کا ترجمہ ثابت نے کیا،

ایرن — ایرن (Heron) ۲۵۰ھ ق م تھا، اس نے اصطرلاب پر ایک کتاب لکھی، اور اس کا ترجمہ کیا گیا، اقلیدس کے شکوک پر بھی ایک کتاب لکھی اور اس کا بھی ترجمہ ہوا،

ابیون — ابیون (Apion) اخیر حکماء میں سے ہے، اس کی تصنیفات میں سے اصطرلاب پر ایک کتاب ہے، اور وہ عربی میں ترجمہ کی گئی،

جبر و مقابلہ و حساب

جبر و مقابلہ کا فن اگرچہ مسلمانوں نے گویا خود ایجاد کیا، کیونکہ مسلمانوں سے پہلے اس کی ابتدائی حالت ایسی تھی کہ فن کا لفظ اس پر صادق نہیں آسکتا تھا، اور اس بات کا تمام یورپ اعتراف کرتا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ یونانیوں نے بھی اس فن میں کچھ کتابیں لکھی تھیں، چنانچہ وہ عربی میں ترجمہ کی گئیں،

ابرخس — سب سے اوّل جس نے یونان میں اس کے متعلق کچھ لکھا وہ ابرخس تھا، جو ۱۴۰ھ ق م نہایت مشہور ریاضی داں گذرا ہے، سیارات کی حرکت چھ سو برس ما بعد تک خسوف کی تاریخیں، ستاروں کے فاصلے، اجرام فلکی کی فہرست، ان مضامین پر اس نے بہت سے رسالے لکھے، جبر و مقابلہ پر اس کی جو کتاب ہے، اس کا ترجمہ اور اصلاح ابوالوفا محمد بن محمد حاسب نے کی، ابوالوفا نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی، اور دعووں کو براہین ہندسیہ سے ثابت کیا، ابرخس کی ایک اور کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا، جس کا نام قسمۃ الاعداد[1] ہے، ابرخس کے بعد دیوفنطس نے اس فن کو ترقی دی،

دیوفنطس (Diphantus) یونانی تھا، اور اسکندریہ میں سکونت رکھتا تھا جبر و مقابلہ پر اس نے تیرہ[13] رسالے لکھے، جو ایک مجموعہ میں مرتب تھے، ان رسالوں میں مربعات و مکعبات وغیرہ کے بہت سے مسائل موجود ہیں، عربی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا، یورپ کو مدت تک

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۲۶۹ و دائرۃ المعارف،

دیوفنطس کا نام تک معلوم نہ تھا، سب سے پہلے آٹھویں صدی عیسوی میں یوحنا شامی نے اس کا حوالہ دیا، ۱۶۷۰ء میں اس کی کتاب اصل یونانی میں مع لاٹین ترجمہ کے چھاپی گئی، اور ۱۶۲۵ء میں اس کا ترجمہ کیا گیا[1]

حساب کے متعلق عام طور پر مسلّم ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیا، اور یہی وجہ ہے کہ وہ رقوم اعداد کو ہندی طریقہ سے لکھتے ہیں، تاہم یونان کی تصنیفات بھی مسلمانوں نے بہم پہنچائیں، سب سے قدیم تصنیف فیثاغورس کی تھی، جس کا نام ارثماطیقی یعنی ارتھمٹیک تھا، یہ کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی[2] اس کے علاوہ اور مصنفوں کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں، جنکی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

نیقوماخس (*Nicomachus*) ارسطو کا باپ، اور بہت بڑا موسیقی دان تھا، اس نے اس فن میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ارثماطیقی ہے، یہ کتاب دو مقالوں میں ہے، اور اصل یونانی میں ۱۵۳۸ء میں بمقام پیرس چھاپی گئی ہی، یہ کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی[3]

مکانک یا علم الآلات[4]

یہ فن اگرچہ درحقیقت موجودہ زمانہ کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے، لیکن یونان میں اس کی ابتدا ہو چکی تھی، سب سے پہلے جس نے جرثقیل اور حرکت کے اصول دریافت کیے، وہ ارشمیدس (*Archimedes*) ہے، جو ۲۵۰ قم میں تھا، اس نے پانی کی گھڑی ایجاد کی، جس میں گھنٹوں کے گذرنے پر خود بخود گھنٹوں کی تعداد کے موافق گولیاں گرتی تھیں، اسی زمانہ میں ایرن نے اس

---

[1] دائرۃ المعارف جلد ۸ صفحہ ۷۴۲، [2] طبقات الاطباء، جلد اول صفحہ ۴۳، [3] کتاب الفہرست صفحہ ۲۶۹، و دائرۃ المعارف، لفظ حساب، [4] مکانک کے لئے دیکھو دائرۃ المعارف ذکر آلات و فہرست ابن الندیم صفحہ ۱۷۶ و ۲۶۹، و ۲۷۱ و ۲۸۵ و یعقوبی صفحہ ۲۳۵،

فن میں بہت سی باتیں اضافہ کیں، پانی کے بلند کرنے کا آلہ اوّل اسی نے ایجاد کیا، اس نے آلات کی پانچ تقسیمیں کیں، لیکن آج کل چھ قرار دی جاتی ہیں، یعنی سطح مائل بھی ایک قسم قرار دی جاتی ہے، حالانکہ ہیرن نے اس کو چھوڑ دیا تھا، ہیرن نے جرثقیل پر ایک مستقل کتاب لکھی،

مارطس

ایک اور حکیم جو اس فن کا استاد گذرا ہے، مارطس تھا، مارطس [illegible]) یونانی الاصل تھا، اس نے ارگن باجہ پر ایک کتاب لکھی اور ایک آلہ دریافت کیا، جس کی آواز ۶۰ میل تک جا سکتی تھی،

غرض اس فن کے متعلق جو کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، حسب ذیل ہیں:

نام کتاب	مضمون	کیفیت
آلہ ساعات الماء	پانی کی گھڑی	ارشمیدس
کتاب شیل الاثقال	جرثقیل کے بیان میں	ایرن
الاشیاء المتحرکہ من ذاتہا	چیزوں کا خود بخود حرکت کرنا	"
الآلات المصوتہ	ارگن باجہ جو آپ سے آپ بجتا ہے	مارطس
کتاب الدوالیب	گھڑی وغیرہ میں جو چکر ہوتے ہیں	"

موسیقی

موسیقی کا فن اگرچہ عرب میں مدت سے موجود تھا، لیکن علمی حیثیت سے نہ تھا، یونان میں اوّل جس شخص نے علمی حیثیت سے اس فن کو مرتب کیا، وہ غالباً فیثاغورث تھا، اقلیدس نے بھی اس کو ترقی دی، اور اس فن میں اس کی تصنیفات بھی ہیں، اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ ان قدماء کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، چنانچہ علامہ ابوالفرج اصفہانی نے اسحاق موصلی کے حال میں تصریح کی ہے، کہ

موسیقی کی تمام کتابیں محمد بن حسن بن مصعب کے حکم سے ترجمہ کی گئیں،

لیکن ہم کو کسی کتاب اور اس کے مترجم کا نام بہ تعین نہیں معلوم ہو سکا، جہاں تک ہم کو معلوم ہے سب سے پہلی تصنیف جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی، وہ نیقوماخس کی کتاب ہے، جو ارسطو کا باپ تھا، یہ کتاب اب اصلی زبان میں بمقام لیڈن ۱۶۱۶ء میں چھاپی گئی ہے،

دوسری تصنیف اس فن میں ارسطکاس کی تھی،

ارسطکاس ارسطکاس (Aristoxenus) ارسطو کا شاگرد اور فن موسیقی کے ارکان میں تسلیم کیا گیا ہے، فیثاغورث نے اس فن کو صرف ذوق پر محمول رکھا تھا، ارسطکاس پہلا شخص ہے، جس نے راگ کے ایقاعات کو ریاضی کے اصول سے ثابت کیا، اور فیثاغورث سے جداگانہ طریقہ پر ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی، اس کی کتاب جو خاص ایقاع کے متعلق ہے، اس کا ترجمہ کیا گیا، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، اور اس کا اصلی نسخہ آج یورپ میں موجود ہے، ارسطکاس کی اور بھی بہت سی تصنیفات تھیں، لیکن غالباً مسلمانوں کو نہیں ملیں، اور آج یورپ کو بھی اعتراف ہے کہ کتاب الایقاع کے سوا اور کوئی تصنیف نہیں ملتی،

جغرافیہ

یونانی اسکول میں اس فن کی ابتدا اراتستھنز سے ہوئی، جو حضرت عیسیٰؑ سے قریباً سو برس پہلے اسکندریہ میں تھا، اس کے بعد ابرخس نے بہت کچھ اس پر اضافہ کیا، ابرخس کے بعد استرابون ہوا جو یونانی تھا، اس نے خود دور دراز مقامات کے سفر کیے، اور جغرافیہ پر ایک عمدہ کتاب لکھی، اسی دور کے قریب مارینوس تھا، جس کے جغرافیہ میں زمین کا رنگین نقشہ موجود ہے، سب سے اخیر لیکن سب سے زیادہ نامور بطلیموس ہوا، وہ دوسری صدی عیسوی میں تھا، اس نے تمام دنیا میں اپنی طرف سے سیاح بھیجے، جنہوں نے نہایت جد و جہد سے ملکوں اور آبادیوں اور دریا و نہر وغیرہ کے حالات بہم پہنچائے [1]، اور ان کی مدد سے ایک نہایت مفصل

[1] کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۳۳

جغرافیہ لکھا، جو آج بھی موجود ہے، اس جغرافیہ میں اکثر شہروں کا عرض بلد وطول بلد بھی درج ہے،

مسلمانوں نے اگرچہ ان تمام تصنیفات سے واقفیت پیدا کی، چنانچہ مورخ مسعودی کتاب التنبیہ والاشراف میں جابجا ان کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن جن کتابوں کا ترجمہ ہوا، وہ مارنیوس اور بطلیموس کا جغرافیہ ہے،

مارنیوس — مارنیوس کے جغرافیہ میں تمام اقالیم کے جدا جدا رنگ تھے، مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ تمام قدیم جغرافیوں میں یہ سب سے اچھا ہے[۱]،

بطلیموس — بطلیموس (Ptolomy) کا جغرافیہ آٹھ بابوں میں ہے، اور نہایت مفصل ہے، اول یعقوب کندی کے حکم سے اس کا ترجمہ ہوا، لیکن وہ اچھا نہ تھا، اس لیے دوبارہ ثابت نے ترجمہ کیا، اور نہایت عمدگی سے کیا، سریانی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا،

طب

طب کی ابتدا یونان میں اسقلیبس سے ہوئی، یونانیوں نے اس کو ابوالطب کا لقب دیا تھا، اور ان کا خیال تھا کہ اس پر خدا کی طرف سے یہ فن الہام ہوا تھا، اسقلیبس نے اپنی اولاد کو زبانی اس فن کی تعلیم دی، اور وصیت کی کہ یہ فن خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔ اس کے خاندان میں بڑے بڑے نامور حکماء اور طبیب گذرے، اقلیدس، افلاطون، سولن وغیرہ اس کے خاندان سے تھے، سولھویں

بقراط — نسل میں تقریباً حضرت عیسیٰؑ سے پانسو برس پہلے بقراط پیدا ہوا، اور یونانیوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فن کو مرتب کیا، اور کتابیں لکھیں، طب کی تعلیم کو عام بھی اسی نے کیا، ورنہ اس سے پہلے بجز اس خاندان کے کوئی شخص اس فن کو حاصل نہیں کرسکتا تھا، بقراط کے بعد جالینوس پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا،

یونانیوں کے نزدیک فن طب کے آٹھ ارکان ہیں، اول اسقلیبس (Asclepius) اور

---

[۱] کتاب مذکور ص ۳۳،

اخیر جالینوس ۔ ان کے بیچ میں غورس ہینس ، برماینڈس ، افلاطن ، سقلیبس دوم اور بقراط تھے ، ان لوگوں کے سوا اور بھی بہت سے صاحب تصنیف اطبا گذرے لیکن وہ ارکان فن نہیں کہے جا سکتے ،

مسلمانوں نے طب کے اس تمام سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کیا ، اور چونکہ بقراط اور جالینوس نے اس فن کو درحقیقت نہایت کمال کے رتبہ پر پہنچایا ، اس لیے ان کی تصنیفات پر زیادہ توجہ کی ، بقراط کی طرف اگرچہ بہت سی کتابیں منسوب ہیں ، لیکن ان میں سے تیس کتابیں قطعی طور سے اس کی تصنیف کہی جا سکتی ہیں ، چنانچہ یہ سب ترجمہ کی گئیں ، اور ان میں سے ۱۲ اس قدر مقبول و متداول ہوئیں ، کہ درس میں داخل ہو گئیں ، ابن ابی اصیبعہ نے ان کتابوں کے علاوہ بقراط کی اور بہت سی کتابیں گنوائی ہیں ، جن کا شمار ۹ ہم تک پہنچتا ہے ، لیکن مصنف مذکور کا بیان ہے کہ ان میں بعض مشتبہ ہیں ،

بقراط کی ترجمہ شدہ تصنیفات میں سے جن کے مترجموں کا نام ہم تفصیل سے معلوم کر سکتے ہیں ، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ،

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
عہد بقراط	اس میں بقراط نے وہ شرائط بتائے ہیں ، جن کے بغیر کسی کو فن طب نہیں پڑھنا چاہیے ،	حنین حبیش ، عیسیٰ بن یحییٰ	اول الذکر نے سُریانی میں ، اور حبیش و عیسیٰ نے عربی میں ترجمہ کیا ،
فصول	تمام مسائل طبیہ کا خلاصہ ہے	حنین	محمد بن موسیٰ شاکر کے لیے ترجمہ کی گئی ، سات مقالوں میں ہے ،
تقدمۃ المعرفۃ	علامات مرض کا بیان ہے	حنین و عیسیٰ	تین مقالے ہیں ،
الامراض الحادۃ	غذا ، فصد ، مسہل وغیرہ کا بیان ہے ،	عیسیٰ بن یحییٰ	اس کتاب کے پانچ مقالوں میں سے صرف تین کا ترجمہ ہوا ،

کیفیت	مترجم	مضمون	نام کتاب
چار مقالے،	حنین	ہڈیوں کے ٹوٹنے اور جوڑنے کا بیان ہے	کتاب الکسر والجبر
	عیسیٰ بن یحییٰ		ابیدیمیا
اس کتاب کا ترجمہ احمد بن موسیٰ شاکر کے حکم سے ہوا،	"		اخلاط
محمد بن موسیٰ شاکر کے حکم سے،	حنین	اعمال ید کا بیان ہے	قاطیطریون
	حنین، حبیش	مختلف ملکوں کی آب و ہوا کی تاثیر،	کتاب الماء والھواء
	"	بدن کی ترکیب کا بیان	طبیعۃ الانسان[1]

جالینوس — جالینوس ۵۹ئہ میں پیدا ہوا، اور ہندسہ وحساب پڑھنے کے بعد سترہ برس کی عمر میں طب کی تحصیل شروع کی، اور اس کی تکمیل کے لیے ایتھنز، ساپرس، اٹلی، اسکندریہ وغیرہ کا سفر کیا،[2] اس نے فن طب کے متعلق بہت سے نئے مسائل دریافت کیے، اور اس فن کو اس حد تک پہنچایا، کہ اسلام کے دور تک اس پر کچھ اضافہ نہ ہوسکا،

مسلمانوں نے اس کی تصنیفات کے بہم پہنچانے اور ترجمہ کرنے میں بے انتہا کوشش کی، ایک کتاب البرہان کی تلاش میں جزیرہ، شام، فلسطین، مصر کے ایک ایک شہر کی خاک چھانی گئی تصنیفات

---

[1] بقراط کی ان تصنیفات اور ان کے علاوہ اور تصنیفات کے مضامین کو مورخ یعقوبی اور ابن ابی اصیبعہ نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے، [2] جالینوس نے اپنے حالات آپ نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کے حوالہ سے نہایت دلچسپ واقعات اپنی تاریخ میں جمع کیے ہیں،

کے پتہ لگانے میں بڑی آسانی یہ ہوئی کہ جالینوس نے اپنی تصنیفات کی خود ایک فہرست لکھی تھی، اور اس کا ترجمہ کر لیا گیا تھا، مترجمین میں سے حنین بن اسحاق نے اپنی تمام زندگی اسی کی تصنیفات کے ترجمہ میں صرف کردی، چنانچہ اس نے اپنی ایک تصنیف میں جالینوس کی اکیس[۲۱] کتابوں اور رسالوں کا نام مع تصریح مضامین لکھا ہے، اور بیان کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں عربی میں ترجمہ کرلی گئیں، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے حنین کا یہ قول نقل کرکے لکھا ہے کہ اس وقت حنین کی عمر ۴۸ برس کی تھی، اور اس وقت اس قدر کتابیں اس کو بہم پہنچ سکیں، اور چونکہ حنین نے ستر برس کی عمر پائی تھی، اس لیے یہ یقینی ہے کہ اس نے جالینوس کی اور تصنیفات بھی حاصل کی ہوں گی، اس کے بعد علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ میں نے خود جالینوس کی اور بہت سی کتابیں عربی زبان میں دیکھیں، جن کا ذکر حنین نے اپنی فہرست میں نہیں کیا ہے، چنانچہ علامہ موصوف نے ان کتابوں کے نام تفصیل سے لکھے ہیں، جن کی تعداد ۳۲ ہے، جالینوس نے بقراط کی اکثر کتابوں کی شرح لکھی ہے، ان کا ترجمہ بھی عربی میں کیا گیا، چنانچہ بقراط کی جس قدر کتابوں کا نام اوپر مذکور ہوا، جالینوس کی سب پر شرحیں ہیں، اور سب کا ترجمہ عربی میں موجود ہے، بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ جالینوس کی تصنیفات جس قدر اس وقت دنیا میں موجود ہیں ایک ایک کرکے ترجمہ کی گئیں، جن کتابوں کے متعلق ہم زیادہ تفصیل معلوم کرسکے، ان کا ایک مختصر سا نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب الفرق	.	حنین	
الصناعۃ	.	"	
کتاب النبض	.	"	
شفاء الامراض	.	"	
مقالات خمس	تشریح میں ہے	"	

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
اسطقسات	اربع عناصر	"	
کتاب المزاج	.	"	
القوی الطبیعیۃ	.	"	
العلل و الاعراض	.	"	
تعرف علل الاعضاء الباطنیۃ	.	حبیش	
کتاب النبض الکبیر	.	"	سولہ مقالے ہیں،
کتاب الحمیات	.	حنین	
البحران		"	تین مقالے ہیں،
ایام البحران		"	
تدبیر الاصحاء		حبیش	چھ مقالے ہیں،
حیلۃ البرء		"	۱۴ مقالے ہیں، پہلے مقالہ کو حنین نے درست کیا،

یہ تمام کتابیں قدیم زمانے میں اسلامی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں داخل تھیں، ان کے سوا جالینوس کی اور تصنیفات حسب ذیل ہیں،

کتاب التشریح الکبیر	تشریح کا بیان ہے	حبیش	۱۵ مقالوں میں ہے،
اختلاف التشریح		"	دو مقالے ہیں،
تشریح الحیوان المیت	مردہ جانور کی تشریح	"	ایک مقالہ ہے،
تشریح الحیوان الحی	زندہ جانور کی تشریح	"	دو مقالے،

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
علم البقراط بالتشریح	.	جیش	۵ مقالے ،
علم ارسطو فی التشریح	.	"	۳ مقالے ،
تشریح الرحم	.	"	۱ مقالہ ،
حرکات الصدر والرئیہ	.	اصطفن بن بسیل	۲ مقالے ، حنین نے ترجمہ کی اصلاح کی ،
علل النفس	.	"	۲ مقالے ،
کتاب الصوت	.	حنین	یہ کتاب محمد بن عبدالملک الزیات کیلئے ترجمہ کی گئی ، ۴ مقالے ،
حرکۃ العضل	.	حنین اصطفن	حنین نے اصلاح کی ، ۱۰ مقالہ
کتاب الحاجۃ الی النبض	.	جیش	۱ مقالہ ،
کتاب الحاجۃ الی النفس	.	اصطفن	.
کتاب العادات	.	جیش	۱ مقالہ ،
آراء بقراط و فلاطن	.	"	۱۰ مقالے ،
کتاب الحرکات المجہولۃ	.	حنین	۱ مقالہ ،
کتاب الامتلاء	.	اصطفن	"
منافع الاعضاء	.	جیش	۱۷ مقالے
کتاب فضل البیات	.	حنین	سریانی وعربی دونوں میں ترجمہ ہوئی ۔ ۱ مقالہ ،
خصب البدن		جیش	۱ مقالہ ۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب سوء المزاج المختلف	.	حنین	ایک مقالہ،
الادویۃ المفردہ	.	"	گیارہ مقالے،
کتاب الاورام	.	ابراہیم بن الصلت	ایک مقالہ،
کتاب المنی	.	حبیش	دو مقالے،
المولود تسعۃ اشہر	.	حنین	ایک مقالہ،
کتاب المرۃ السوداء	.	اصطفن	"
کتاب رداءۃ التنفس	.	حنین	تین مقالے،
تقدمۃ المعرفۃ	.	عیسیٰ بن یحییٰ	ایک مقالہ،
کتاب الفصد	.	"	"
کتاب الذبول	.	حنین	"
صفات الصبی یصرع	.	ابن الصلت	"
قوی الاغذیہ	.	حنین	تین مقالے،
التدبیر الملطف	.	"	ایک مقالہ،
کتاب الکیموس	.	ثابت شملی و حبیش	.
کتاب ارسطراطس	.	حنین	.
تدبیر بقراط للامراض الحادہ	.	"	ایک مقالہ،
ترکیب الادویہ	.	حبیش الاعسم	سترہ مقالے،
الادویۃ المقابلۃ للادواء	.	عیسیٰ بن یحییٰ	دو مقالے ،

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب التریاق	•	یحییٰ بن البطریق	ایک مقالہ،
کتاب الیٰ ثراسابوس	•	حنین	•
الریاضۃ بالکرۃ الصغیرۃ	•	حبیش	ایک مقالہ
الریاضۃ بالکرۃ الکبیرۃ	•	"	"
فی ان الطبیب الفاضل فیلسوف	•	حنین	"
کتاب بقراط الصحیحۃ	•	"	"
الحث علی تعلیم الطب	•	حبیش	"
محنۃ الطبیب	•	حنین	"
کتاب البرہان		"	یہی کتاب ہے جس کی تلاش میں حنین نے تمام ملکوں کا سفر کیا تھا،
تعریف المرء عیوب نفسہ	•	توما	
کتاب الاخلاق	•	حبیش	چار مقالے،
انتفاع الاخیار باعدائھم	•	"	ایک مقالہ
ماذکرہ افلاطن فی طیماوس	•	حنین واسحاق	دو مقالے،
فی ان قوی النفس تابعۃ لمزاج البدن	•	حبیش	

ان مشہور اطبار کے سوا اور یونانی اطبا، کی تصنیفات وتالیفات کے بھی ترجمے کیے گئے مثلاً

ارشیجانس جو جالینوس سے پہلے تھا، اس کی تین کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں، کتاب اسقام الارحام

[1] یہ پوری فہرست ابن الندیم کی کتاب سے مرتب کی گئی ہے، دیکھو کتاب الفہرست ص ۲۹۰،

طبیعۃ الانسان، کتاب فی النقرس[5]

روفس

جالینوس سے پہلے ایک اور بڑا نامی طبیب گذرا ہے، جس کا نام روفس (Rufus) تھا، اس کی تینتالیس (۴۳) کتابوں کے نام علامہ ابن الندیم نے اپنی کتاب میں بہ تفصیل نقل کیے ہیں، اور چونکہ علامہ موصوف کی کتاب کا موضوع انہی کتابوں کا نام لکھنا ہے، جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، اس لیے یہ یقینی ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا، ان کے سوا جن حکماء کی تصنیفات کے ترجمے ہوئے، ان کے اور ان کی تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں:

نام مصنف	تصنیفات ترجمہ کردہ شدہ
فیلغریوس (Philagrius)	کتاب من لا یحضرہ طبیب، وجع النقرس، کتاب الصداع، کتاب الماء الاصفر، کتاب وجع الکبد، کتاب قولنج، کتاب الیرقان، کتاب خناق الرحم، کتاب عرق النسا، کتاب السرطان، کتاب صنعۃ تریاق الطین، کتاب عضۃ الکلب، کتاب علامات الاستسقاء، کتاب فی القوباء، کتاب فیما یعرض للثۃ والاسنان،
اوریباسیوس (Oribasius)	کتاب الی ابیہ، کتاب الی ابنہ، رسالۃ فی التشریح، کتاب الادویہ، کتاب السبعین، اول دو کتابوں کا ترجمہ حنین نے اور کتاب الادویہ کا ترجمہ اصطفن نے کیا،
اوراس	کتاب العلل المہلکۃ،
افلاطن طبیب	کتاب الکی،

[5] ابن ابی اصیبعہ ص ۳۴،

تصنیفات ترجمہ کردہ شدہ	نام مصنف
کتاب البول،	مغنس الحمصی (بقراط کا شاگرد)
کتاب الکناش، علل النساء، مترجمہ حنین،	نوبیس الاجانیطی،
کتاب الزینہ، یہ طبیب جالینوس سے پہلے اور بقراط کے بعد تھا،	اقریطون
علل العین و علاجہا، کتاب البرسام، کتاب الحیات، والدیدان التی تتولد فی البطن، مترجمہ ابن البطریق،	اسکندروس
کتاب الحقن، مترجمہ اصطاث	مورنوس

اس سلسلہ میں دیسقوریدس کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے، یہ وہ حکیم ہے، جس نے دواؤں اور ہر قسم کی بوٹیوں پر اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ایک بہت بڑی مفصل کتاب لکھی، وہ ہمیشہ جنگلوں اور صحراؤں جزیروں اور دور دراز مقامات میں سفر کیا کرتا تھا، اور جو دوائی ہاتھ آتی اس کی تاثیر قلمبند کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی تصویر بھی کھینچتا تھا، جالینوس کا بیان ہے کہ ادویۂ مفردہ کے متعلق میں نے چودہ کتابیں مختلف مصنفوں کی دیکھیں، لیکن دیسقوریدس کی کتاب کو کوئی نہیں پہنچتی۔ اس کتاب کا ترجمہ اور اس کی تصحیح جس اہتمام سے کی گئی، اس کو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ آئے ہیں، دیسقوریدس کی یہ کتاب خود ہماری نظر سے گذری ہے، تعجب ہے کہ دیسقوریدس کی اس کتاب پر اطبائے مابعد نے کچھ اضافہ نہیں کیا،

مسلمانوں میں ابن جلجل اندلسی صرف ایک شخص گذرا ہے، جس نے اپنے تجربہ سے کچھ دوائیں اس پر اضافہ کیں، اور ان کو ایک مستقل کتاب میں قلمبند کیا،

یونانی تعلیم نے چونکہ عام عالمگیری حاصل کی تھی، تمام ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں، اس سلسلہ میں اسکندریہ سب سے زیادہ ممتاز ہے، یہاں سات بڑے بڑے نامور طبیب پیدا ہوئے جنہوں نے طب یونانی

کو بہت ترقی اور وسعت دی، ان لوگوں نے جالینوس کی ۱۶ کتابوں کو خاص کر لیا تھا، اور ان کے خلاصے اور شرحیں لکھی تھیں،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حکماء کی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ "ان تمام شرحوں میں میں نے جس کو سب سے بڑھ کر پایا، وہ جالینوس کی شرح ہے، اس شرح سے اس کا نہایت فضل و کمال ثابت ہوتا ہے"،

یحییٰ — ان سب میں سے اخیر یحییٰ نحوی تھا، جس کا مختصر ذکر فلسفہ کے بیان میں ہو چکا ہے، وہ فلسفہ اور طب میں نہایت کمال رکھتا تھا، اور اسکندریہ میں بشپ کے عہدہ پر ممتاز تھا، قیصر روم نے اس کو قسطنطنیہ میں بلایا تھا، اور چونکہ فن طب میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہ تھا، دربار میں نہایت قبول حاصل ہوا، اور مدت تک وہ قسطنطنیہ میں رہا، اس نے جالینوس کی ۱۹ کتابوں پر شرحیں لکھیں، جو سب عربی میں ترجمہ کی گئیں، ابن ابی اصیبعہ نے ان سب کے نام تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن میں بہ لحاظ اختصار قلم انداز کرتا ہوں،

اطبائے اسکندریہ کے معاصر، شام و روم میں بھی بہت سے نامی اطباء تھے، مثلاً شمعون، اہرن، یوحنا نطلیس، برطلاؤس، سندہشار، کملان، اوراس، بونیوس بیروتی، سیورخنا، فلاغوسوس، عیسیٰ، سرجیس، طلوسی غریغوریوس وغیرہ وغیرہ،

ابن ابی اصیبعہ نے مذکورۂ بالا طبیبوں اور ان کی تصنیفات کے نام لکھکر لکھا ہے کہ ان حکیموں کی اکثر تصنیفات اس وقت موجود ہیں، اور ابوبکر رازی نے اپنی کتاب میں جس کا نام حاوی ہے، اکثر ان کتابوں سے نقل کیا ہے،

ہندسہ[1] (یا) جامیٹری

اس فن کا موجد اوس ہے جس نے اس کے ابتدائی اور جذری مسائل کو فن کی صورت میں مرتب کیا، تھیلز — تھیلز ہے جو حضرت عیسیٰ سے چھ سو بیس برس پہلے تھا، دائرہ اسی کی ایجاد ہے،

[1] اس عنوان کی تفصیل میں جن حکماء اور اہل فن کے نام آئے ہیں، ان کی تعیم انگریزی حرفوں میں اوپر گذر چکی ہے،

انکساغورس

اس کے بعد انکزگورس نے کچھ مسائل اضافہ کیا، جن میں سے دائرہ کی تربیع بھی تھی، لیکن ان حکما کی تصنیفات مسلمانوں کو نہیں مل سکیں، کیونکہ وہ اسلام سے پہلے ناپید ہو چکی تھیں، اس سلسلہ میں سب سے مقدم زمانہ کی جو تصنیف مسلمانوں کو مل سکی، وہ اقلیدس کی تصنیف تھی، یہ مشہور فاضل حضرت عیسیٰؑ سے دو سو بہتر برس پہلے تھا، وہ اگرچہ یونان کا باشندہ نہ تھا، لیکن چونکہ تعلیم یونان میں پائی تھی، اور اسکی تصنیفات بھی یونانی ہی زبان میں تھیں، اس لیے وہ یونانی ہی کہلاتا ہے،

اقلیدس

مسلمانوں نے اس کی تصنیفات نہایت جد وجہد سے بہم پہنچائیں، اور عربی زبان میں ان کے ترجمے کیے گئے،

ہندسہ میں اس کی مشہور کتاب جواب اس کے نام سے مشہور ہے، اس کا ترجمہ اول حجاج بن یوسف بن مطر نے ہارون الرشید کے لیے کیا، پھر اسی نے دوسرا ترجمہ مامون الرشید کے لیے کیا، اور یہ ترجمہ زیادہ صحیح اور صاف ہے،

اسحاق بن حنین نے بھی اس کا ترجمہ کیا، اور ثابت بن قرۃ نے اس کی اصلاح کی، حجاج کے نسخہ میں کل شکلیں ۴۶۸ ہیں، ثابت کے نسخہ میں دس شکلیں زائد ہیں، کچھ مقالے ابو عثمان دمشقی نے بھی ترجمہ کیے،

علمائے اسلام نے نہایت کثرت سے اس کتاب کی شرحیں لکھیں، جن میں سے یزیدی، جوہری، ماہانی، ابو حفص الحرث خراسانی، ابو الوفا البوزجانی، ابو القاسم الانطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابو یوسف الرازی، قاضی عبد الباقی بغدادی، ابو علی الحسن بن الہیثم المصری، ابو جعفر خازن اہوازی، ابو داؤد سلیمان بن عقبہ کا نام خصوصیت سے لیا گیا ہے، قاضی عبد الباقی کی شرح نہایت بسیط ہے، اس نے اشکال کی مثالیں اعداد سے دی ہیں، ابن ہیثم نے مصادرات کی شرح لکھی ہے، اور ایک کتاب میں اس کے مسائل پر اعتراضات لکھے ہیں، اور پھر جواب دیتے ہیں، ثابت بن قرۃ نے ان علل کی تشریح کی جن پر اقلیدس نے شکلوں کی ترتیب رکھی ہے،

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ یورپ کو یہ کتاب عرب ہی کی بدولت اور عربی ہی

زبان میں ملی، چنانچہ اول اس کا ترجمہ عربی زبان سے اڈیلرڈ و دباث نے کیا[1]،

ہندسہ میں اقلیدس کی اور بھی تصنیفات ہیں، اور وہ عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

اقلیدس کے بعد دو بہت بڑے نامور فاضل گذرے، جنھوں نے فن ریاضی کو اوج کمال تک پہنچا دیا، ارشمیدس و ابلونیوس،

ارشمیدس ارشمیدس سرقوسہ میں ۲۸۷ برس قبل مسیح پیدا ہوا، اور اسکندریہ کے مدرسہ میں علوم کی تکمیل کی، وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندسہ کو عملی طور پر برتا، اور اس کے ذریعہ سے بہت سے مفید آلات ایجاد کیے، پانی کی گھڑی بھی غالباً اسی کی ایجاد ہے۔ اس حکیم کی جو تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، حسب ذیل ہیں،

نام کتاب	کیفیت	نام کتاب	کیفیت
کتاب الکرۃ والاسطوانہ	دو مقالے ہیں،	تربیع الدائرہ	ایک مقالہ ہے،
تسبیع الدائرہ	دائرہ کے سات حصہ کرنے کا طریقہ	الدوائر المماسۃ	
		الخطوط المتوازیہ	
المثلثات		الماخوذات فی اصول ہندسہ	
المفروضات		خواص المثلثات القائمۃ	
ساعات الماء	یعنی پانی کی گھڑیاں	الزاویہ	

ارشمیدس کی کتابیں آج کل اصل یونانی میں چھاپ گئی ہیں، اور موسیو پیرار نے فرنچ زبان میں ان کا ترجمہ بھی کیا ہے[2]،

[1] دائرۃ المعارف مطبوعہ بیروت ذکر اقلیدس۔ [2] ارشمیدس اور اس کی تصنیفات کے لیے دیکھو کتاب الفہرست و دائرۃ المعارف ذکر ارشمیدس و کشف الظنون،

ارشمیدس کی تصنیفات میں سے چونکہ کرہ اور اسطوانہ کی کتاب زیادہ مہتم بالشان تھی، مسلمانوں نے اسی کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، ثابت بن قرہ نے ترجمہ کی اصلاح کی، اوطوقیوس نے اس کی مشکلات کی جو شرح لکھی تھی، اس کا بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا، محقق طوسی نے اس کی تحریر لکھی، اس کتاب میں ۴۸ شکلیں ہیں، اسی طرح کتاب الماخوذات کی طرف بھی بہت توجہ کی گئی، ابوالحسن علی نے اس کی تفسیر لکھی، طوسی نے اصلاح کی، ابوسہل نے بھی اس کو ترتیب دیا،

ابلونیوس

ابلونیوس نے اس فن کو اور بہت زیادہ ترقی دی، اور اسکندریہ کے مدرسہ کی شہرت اس کی وجہ سے حد کمال کو پہنچ گئی، اس کی تصنیفات کے بہم پہنچانے میں بہت زیادہ جدوجہد کی گئی، کیونکہ پوری کتاب کا نسخہ کہیں موجود نہ تھا، مامون الرشید نے روم سے جو کتابیں منگوائی تھیں، ان میں یہ بھی آئی تھی، یہ کتاب اصل میں آٹھ مقالوں میں تھی، لیکن مسلمانوں کو صرف سات مقالے ملے، اور آٹھویں مقالے کی صرف چار شکلیں، چار پہلے مقالوں کا ترجمہ ہلال حمصی نے اور تین مقالوں کا ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا، ابلونیوس کی اور کتابیں جو عربی میں ترجمہ کی گئیں، حسب ذیل ہیں،

نام کتاب	کیفیت
کتاب قطع الخطوط علی نسبۃ، کتاب فی النسبۃ المحدودۃ، کتاب قطع السطوح علی نسبۃ کتاب الدوائر المماسہ	ثابت بن قرہ نے اس کے پہلے مقالہ کی اصلاح کی،

ان دو مہندسوں کے بعد منالاؤس اور اوطیوقیوس کا نام زیادہ مشہور ہوا، اور انھوں نے درحقیقت اس فن کو ترقی دی، منالاؤس (Menelaus) اسکندریہ کا رہنے والا تھا، اور سنہ ۱۰۰ء میں تھا، بطلیموس نے اپنی کتاب مجسطی میں اس کا حوالہ دیا ہے، اس کی تصنیفات حسب ذیل ہیں، جن کا

ترجمہ عربی زبان میں ہوا،

نام کتاب	کیفیت
الاشکال الکریہ	
کتاب معرفۃ الکمیۃ	چند اجسام جو مخلوط کر دیئے جائیں انکی کمیت دریافت کرنے کا طریقہ،
اصول الہندسہ	تین مقالوں میں ہے، ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا،
کتاب المثلثات	صرف چند اجزاء کا عربی میں ترجمہ ہوا،

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے، کہ اس مصنف کی جو تصنیفات یورپ کو ملیں، وہ عربی زبان کے ذریعہ سے ملیں ورنہ ان کی اصل مفقود ہے،

ان مشہور اہل فن کے سوا جن مصنفوں کی کتابیں ترجمہ ہوئیں، ان میں سے ارسطو وغیرہ کی کتابوں کا ذکر اوپر گذر چکا، باقی کی تفصیل حسب ذیل ہے،

اوطوقیوس اوطوقیوس ۵۰۰ء میں تھا، اور شام کا رہنے والا تھا، اس نے ارشمیدس کی مشہور کتاب الکرۃ والاسطوانۃ کے پہلے مقالہ کی شرح لکھی، ہندسہ میں اس کی ایک اور کتاب دو خطوں کے بیان میں ہے، اس میں انہوں نے تمام علمائے مہندسین کا مذہب اور ان کے اقوال اور دلائل نقل کیے ہیں، ان دونوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا، پچھلی کتاب کا ترجمہ ثابت نے کیا، اور نہایت خوبی سے کیا،[1]

سنبلیقوس سنبلیقوس (Senuplyous) یہ یحیٰی نحوی کا معاصر تھا، اس نے اقلیدس کی شرح لکھی، چنانچہ اس کا ترجمہ عربی زبان میں موجود ہے،

---

[1] فہرست ابن الندیم ص ۲۶۷،

دیگر علوم وفنون

علوم مذکورۂ بالا کے علاوہ اور بہت سے علوم وفنون تھے، جن پر یونانی زبان میں سیکڑوں تصنیفات موجود تھیں، اور جہاں تک مل سکیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، لیکن ان کی تفصیل لکھی جائے تو بہت بڑا دفتر بن جائے، اور ناظرین گھبرا جائیں۔ اس لیے اجمالی طور پر اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

بہت بڑا سرمایہ یونانی زبان میں ادب اور تاریخ کا تھا، یونان کو فصاحت وبلاغت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تمام دنیا کو الکن سمجھتے تھے۔ فصاحت وبلاغت کے اصول اول یونانیوں نے منضبط کیے، ارسطو نے اس فن کو منطق میں داخل کیا، اور اس کو ایک جداگانہ باب میں لکھا، جس کا نام ریطوریقا ہے، یہ کتاب بعینہٖ عربی زبان میں ترجمہ کی گئی، ارسطو کے سوا اور لوگوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھیں، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے معتدبہ کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

یونانی لٹریچر کی جان اور روح ہومر کا کلام ہے، جس کی نسبت یورپ کا دعویٰ ہے کہ کل دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں ہوا۔

ہومر کا ترجمہ خلیفہ مہدی کے عہد میں اس کے مشہور منجم ثاوفیلوس نے سریانی زبان میں کیا،[1] یونان کے اور بہت سے افسانے جو انشا کی حیثیت رکھتے تھے، ترجمہ کیے گئے، علامہ ابن الندیم نے ان کے نام بھی گنائے ہیں، مثلاً کتاب سمسہ ودمن، مورویانوس، انطوس سیاح، دیون دراجیل وغیرہ وغیرہ، لیکن عربی لہجہ کے تصرفات میں ان کتابوں کے نام اس قدر بدل گئے ہیں کہ ہم ان کے اصلی یونانی نام نہیں معلوم کرسکے۔

تاریخ اور اس کے متعلق اس کثرت سے کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، کہ یونان و روم کے حالات عربی زبان میں جس وسعت اور استقصاء سے ملتے ہیں خود اسلامی ممالک کے حالات میں اس قسم کی اکثر جزئیات نہیں ملتیں، چنانچہ مؤرخ مسعودی کی تصنیفات کے دیکھنے سے اس بات کا

[1] دائرۃ المعارف جلد ۴ صفحہ ۲۶۲۔

اندازہ ہو سکتا ہے، مسعودی کے زمانہ سے پہلے اور خود اس کے زمانہ میں بہت سے مصنفوں نے مفید تاریخیں عربی زبان میں لکھیں، جو یونانی تصنیفات سے ماخوذ تھیں، اور اس لحاظ سے ان کو بھی ایک قسم کا ترجمہ کہنا چاہیے، فرقہ مارونیہ میں سے قیس مارونی نے ایک کتاب بادشاہان روم و مختلف ممالک کے حالات میں لکھی، فرقہ ملکیہ میں سے ابن قسطنطن کی کتاب نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے، اسی طرح سعید بن البطریق جو [illegible] کا لارڈ بشپ تھا، اس کی کتاب جو عربی زبان میں ہے، نہایت مستند خیال کی جاتی ہے، اور جس کا ذکر اوپر بھی گذر چکی ہے، اثناوس راہب نے آدم سے لے کر قسطنطن تک کے واقعات لکھے، یعقوب بن زکریا کسکری کی تاریخ کو اکثر تصنیفات تاریخی پر ترجیح دی جاتی ہے، ابو زکریا نصرانی جو فلسفہ دان اور مسعودی کا معاصر تھا، اس نے اپنی کتاب میں بادشاہان یونان و روم کے واقعات کے علاوہ حکما، اور ارباب فن کے حالات اور ان کے اخلاق و عادات لکھے،[1]

فلاسفہ اور حکما، کے متعلق یونانی زبان سے نہایت مفید ذخیرہ ہاتھ آیا، اور عربی میں منتقل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ یونانی حکما، مثلاً افلاطون، بقراط، ارسطو وغیرہ کا نام آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اور ان کے مقولے اور کہاوتیں نقل محفل ہیں،

فرفوریوس فرفوریوس جو تیسری صدی عیسوی میں تھا، اور جس کا ذکر فلسفہ کے بیان میں گذر چکا ہے، اس نے حکما، و فلاسفہ کے حالات میں جو کتاب لکھی تھی، اس کا بجنسہٖ ترجمہ کیا گیا، چنانچہ اس کے حوالوں سے علامہ ابن اصیبعہ کی کتاب مالا مال ہے، جالینوس نے اپنی تصنیفات کی ایک فہرست لکھی تھی، اور اس میں اپنے علمی حالات بھی اکثر لکھے تھے، وہ بھی ترجمہ کی گئی[2] جالینوس عام طبی تصنیفات میں بھی اکثر اپنے واقعات لکھ جاتا ہے، اس سے بھی اس کے بہت سے حالات بہم پہنچے،

بطلیموس نے ارسطو کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس کا بھی ترجمہ کیا گیا، غرض اس طرح یونانی حکما، و اہل فن کے متعلق جو کچھ یونانی زبان میں موجود تھا، عربی زبان میں آ گیا، اور ان کو ترتیب دے کر نہایت عمدہ تالیفات تیار ہوئیں، حنین بن اسحاق کی کتاب نوادر الفلاسفۃ و الحکما، اور مبشرین

---

[1] ان تمام کتابوں کا ذکر کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۱۵۴ و صفحہ ۱۵۵ میں ہے، [2] طبقات الاطباء صفحہ ۷۴ جلد اول۔

فائک کی کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم اور ابن جلجل اندلسی کی کتاب اور جمال الدین قفطی اور شہرزوری کی تاریخ الحکما، اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطبا، یہ تمام کتابیں جن میں یونانی اور مصری حکمار کے حالات دفتر کے دفتر ملتے ہیں، در اصل یونانی ہی تصنیفات ہیں جنہوں نے اپنا قالب بدل لیا ہے،

فن حرب میں یونان میں دو بڑے مصنف گذرے، الیانوس، پوپیس، ان مصنفوں نے لڑائی کے تمام اصول قلمبند کیے، حب یر، فوجوں کی تقسیم، صفوں کی ترتیب، فوجی مشقیں، قواعد وغیرہ نہایت تفصیل سے مندرج ہیں، چنانچہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا، اصل ترجمہ تو مجھ کو نہیں مل سکا لیکن ان کتابوں سے اخذ کرکے عربی میں جو کتاب لکھی گئی، وہ یورپ میں چھپ گئی ہے، اور میرے مطالعہ میں ہے،

مسلمانوں نے یونانی لٹریچر کے عمدہ اور ضروری حصہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جو کچھ زبان میں موجود تھا سب کو لیا، یہاں تک کہ شعبدے اور نیرنگیات، قیافہ و فال، اکسیر وکیمیا، طلسمات و حاضرات، ان لغویات سے بھی بے پروائی نہ کی،

ارسطو کا ایک شاگرد قالش تانس (Callis Thenes) نامی تھا، اور اکثر سکندر کے ساتھ رہتا تھا، یونان میں غالباً اول اسی نے نیرنگیات اور شعبدے ایجاد کیے، اور ان پر کتابیں لکھیں، چنانچہ اس کی کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی، جس کا نام الجامع فی النیرنجات والخواص ہے[۱]،

اس فن میں ایک نہایت مشہور فاضل گذرا ہے، جس کا نام بلیناس (Apollonius) تھا، یہ پہلی صدی عیسوی میں تھا، اور حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا منکر تھا، لوگوں سے کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے جو معجزے دکھائے ہیں، میں بھی دکھا سکتا ہوں، چنانچہ اس کے ثبوت میں شعبدوں کے کرشمے دکھاتا تھا، اس کی کتاب جس میں ان طلسمات کا بیان ہے، جو خود اس نے جا بجا قائم کیے تھے، عربی زبان میں ترجمہ کیے گئے[۲]،

---

[۱] فہرست صفحہ ۳۱۲، [۲] فہرست صفحہ ۳۱۳،

قیافہ اور فال کے متعلق جو کتابیں ترجمہ ہوئیں، حسب ذیل ہیں،

کتاب الفراسۃ، کتاب زجر الروم، کتاب الخیلان مصنفہ میلنس رومی، کتاب فیثا غورس فی الفرع،

کتاب قرعۃ ذی القرنین، کتاب القرعۃ المنسوبۃ الی الاسکندر بالسہام[1]

خواب کی تعبیر کے متعلق حسب ذیل کتابیں ترجمہ کی گئیں،

کتاب ارطامیدورس، کتاب النوم والیقظۃ لفرفوریوس،

کیمیا کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، اور افسوس یہ ہے کہ اس نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو مدتوں تک بوالہوسی کے دام میں پھنسائے رکھا، اور آج بھی ہزاروں پڑھے لکھے اس مرض میں مبتلا ہیں بہرحال اس فن کی جو کتابیں عربی زبان میں آئیں، حسب ذیل ہیں،

کتاب دیقرس فی الصنعۃ کتاب الاسکندر فی الحجر، کتاب دیقرس فی جواب بدیوس، کتاب قلوبطرۃ کتاب سقناس، کتاب دحیوس، کتاب کرانوس،

علامہ ابن الندیم نے اور بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں، اور یہ ممکن تھا کہ میں تلاش اور کوشش سے ان کتابوں اور ان کے مصنفین کے صحیح نام دریافت کرتا۔ لیکن اس بیہودہ شغل میں اگلوں نے وقت ضائع کیا تو کیا، میں کیوں اپنی اوقات خراب کروں،

فارس

مسلمانوں کو فارس کے علمی ذخیرے سے جس قدر واقفیت ہونے کے ذریعے تھے، اور کسی زبان سے نہ تھے، فارسی نسلیں نہایت کثرت سے اسلام لائیں، عباسیوں کے دربار میں عموماً مجوسی بھرے ہوئے تھے، جن میں بہت سے مذہباً بھی مجوسی تھے، اور ان سے ترجمہ اور تالیف کی خدمت متعلق تھی، سلاطین اسلام اکثر فارسی خاندانوں سے تھے، تاہم تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی

[1] فہرست ص ۳۱۴،

زبان میں آیا، اس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ کا پتہ نہیں ملتا، یہاں تک کہ نہایت کدوکاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی نہیں معلوم ہوتا، حالانکہ یونانی حکماء مثلاً ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اس کی وجہ اس کے سوا اور نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے زمانہ سے پہلے فارس کا ذخیرہ اکثر برباد ہو چکا تھا، اور بالخصوص فلسفہ اور اس کے متعلقات بالکل ناپید ہو چکے تھے، اس کی تفصیل میں کسی قدر اپنے مضمون کتب خانہائے اسلام میں لکھ چکا ہوں، یہاں مزید اطمینان کے لیے حمزہ اصفہانی جو بہت بڑا نامور مورخ گذرا ہے، اسکی عبارت نقل کرتا ہوں،

فاما تواریخ من کان قبل الساسانیۃ فلم اشتغل بها لا فات المعترضة فیها وذالک ان الاسکندر لما استولی علی ارض بابل وقهر اهلها حسد علی ما کان اجتمع لهم من العلوم التی لم تجمع قط لامة من الامم مثلها فاحرق من کتبهم ما نالته یده ثم تصدی الی قتل الموابذة والهرابذة والعلماء والحکماء ومن کان یحفظ علیهم فی اثناء علومهم وتواریخ حتی اتی علی عامتهم[1]

غرض مسلمانوں نے جب ترجمہ کے کام پر توجہ کی تو فارسی زبان میں جو ذخیرہ موجود تھا، وہ تاریخ طب، ادب، فن حرب وغیرہ کا ذخیرہ تھا، اور وہ بھی اخیر زمانہ یعنی اردشیر اور اس کے بعد کی تصنیفات تھیں، مسلمانوں کو سب سے زیادہ دلچسپی فن تاریخ سے تھی، اور اسی لیے تاریخ کا جس قدر سرمایہ مل سکا، عربی زبان میں منتقل کیا گیا، فارسی کی تاریخیں دو قسم کی تھیں، عام جس میں تمام سلاطین کے حالات و واقعات تھے، اور خاص جس میں کسی خاص بادشاہ یا خاص ملک اور شہر کا حال تھا، چنانچہ دونوں

---

[1] تاریخ سنی ملوک لحمزۃ اصفهانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۲، اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ ساسانیوں سے پہلے زمانہ کی تاریخ پر میں نے توجہ نہیں کی کیونکہ اس پر بہت آفتیں آئیں، وہ یہ کہ جب سکندر نے بابل پر قبضہ پایا اور وہاں کے لوگوں کو دبا لیا، تو ان کے علوم و فنون پر اس کو رشک ہوا، چنانچہ اس نے اسکی جس قدر کتابیں پائیں سب جلا دیں، اور موبدوں اور علماء و حکماء کو قتل کرا دیا،

قسم کی تاریخیں کثرت سے عربی میں ترجمہ کی گئیں،

عام تاریخوں میں سے جن کتابوں کے نام ہم معلوم کر سکے وہ حسب ذیل ہیں،

خدائی نامہ:۔ یہ نہایت مفصل کتاب تھی، جس میں ابتدائے سلطنت عجم سے لے کر اخیر زمانہ تک مفصل حالات درج تھے، عبداللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا، اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا، یہ اصل کتاب اس قدر مقبول اور متداول تھی، کہ بہرام بن مردان شاہ جو دولت عباسیہ کے عہد کا مترجم ہے، اس نے لکھا ہے کہ میں نے بیس سے زیادہ مختلف نسخے اس کتاب کے فراہم کیے تھے[1]

آئین نامہ:۔ یہ نہایت مفصل تاریخ تھی، اور اس کا ترجمہ بھی عبداللہ بن المقفع نے کیا[2] علامہ مسعودی نے لکھا ہے کہ یہ بہت بڑی کتاب ہے، اور کئی ہزار صفحوں میں اس کا مکمل نسخہ بجز پارسی موبدوں کے اور کسی کے پاس پایا نہیں جاتا[3]

کہن نامہ:۔ یہ آئین نامہ کا ایک ٹکڑا ہے، اس میں عہدہ داروں و متوسلان سلطنت کے مراتب مذکور ہیں، چنانچہ اس میں چھ سو عہدوں اور ان کے مراتب اور درجات کا ذکر ہے[4]

سیر ملوک الفرس:۔ عبداللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا، لیکن یہ نام اصل کتاب کا نہیں بلکہ ترجمہ کا ہے،

سیر ملوک الفرس:۔ مترجمہ محمد بن جہم البرکی،

سیر ملوک الفرس:۔ مترجمہ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی،

سیر ملوک الفرس:۔ مترجمہ محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی[5]

سیکسران:۔ یہ بھی نہایت مفصل تاریخ ہے، مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم

---

[1] خدائی نامہ کے لیے دیکھو حمزہ اصفہانی کی کتاب صفحہ ۱۶-۲۴ وکتاب الفہرست ص ۱۱۸، [2] کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸، [3] دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف المسعودی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۴، [4] کتاب التنبیہ صفحہ ۱۰۴، [5] ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۸ میں ہے،

اس کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے، عبداللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا، پہلوی زبان میں تھی،

یہ تمام کتابیں شاہانِ فارس کے حالات و واقعات میں ہیں، ان کے اصلی نام معلوم نہیں ہوسکے،

خاص خاص عہدہ یا خاص خاص اشخاص کی جو تاریخیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں،

تاریخ دولت ساسانی:۔ خاندانِ ساسان کی یہ نہایت مفصل تاریخ تھی، اس میں عام حالات کے علاوہ ساسانیوں کے قوانینِ سلطنت اور طریقِ انتظام نہایت تفصیل سے درج تھے، چنانچہ اس کا ذکر ہم تفصیل کے ساتھ ابتدا میں لکھ آئے ہیں، مورخ مسعودی نے اس کتاب کا نسخہ ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر دیکھا تھا،

ایضاً:۔ مترجم ہشام بن قاسم الاصفہانی،

" :۔ اصلاح دادہ بہرام بن مردان شاہ جو شہر نیشاپور کا موبد تھا،[1]

رستم و اسفندیار نامہ:۔ اس میں رستم و اسفندیار کے معرکوں کی تفصیل ہے، جبلہ بن سالم نے اس کا ترجمہ کیا

بہرام نامہ:۔ مترجمۂ جبلہ بن سالم،

کارنامہ:۔ نوشیرواں کے حالات و واقعات ہیں،

شہرزاد باپرویز:۔

کارنامہ:۔ اردشیر بن بابک جو بہت بڑا مدبر بادشاہ گذرا ہے، اس نے خود اپنے واقعات و حالات اس کتاب میں قلمبند کیے تھے،[2]

کتاب التاج:۔

بہرام و نرسی نامہ:۔

کارنامہ:۔ نوشیرواں کے حالات ہیں،

---

[1] ان دو اخیر کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۹ میں ہے، [2] مروج الذہب مطبوعۂ یورپ صفحہ ۱۶۲ جلد اول،

مزدک نامہ۔

نوشیرواں نامہ۔[1]

سیرت نامہ۔ یہ اجود بن فرخ زاد کی تصنیف ہے،

عام تاریخوں اور سوانح عمریوں کے علاوہ اس قسم کی تمام تحریروں اور دستاویزوں کا بھی ترجمہ کیا گیا، جن سے واقعات ماضی کا پتہ لگتا تھا، مثلاً نوشیروان نے اپنے بیٹے ہرمز کو جو وصیت نامہ لکھا، اور خاندان کے لیے جو وصیت کی، اردشیر بابکان کا عہد نامہ شاپور کے نام، کسریٰ و مرزبان کا سوال وجواب؛ نوشیروان کا خط سرداران فوج کے نام، نوشیروان اور جواسپ کی باہمی خط وکتابت، یہ اور اسی قسم کی بہت سی تحریریں عربی میں ترجمہ کی گئیں،

الزام اور تردید

باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے فارس کی تاریخ کے ساتھ اس قدر اعتنا کیا، تاہم یورپ نے انکی کوششوں کی جو داد دی وہ یہ ہے کہ ملکم صاحب نے جنھوں نے ایران کی تاریخ نہایت تحقیق وتدقیق سے لکھی، تحریر فرماتے ہیں کہ

"تمام مورخوں نے جو صدر اسلام کے ہمعصر تھے لکھا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ایرانیوں کی پامردی اور دلیری سے طیش میں آکر فتح کے بعد جس قدر ان کی مذہبی چیزیں پائیں برباد کر دیں، شہر کے شہر جلا دیئے، آتش کدوں میں آگ لگا دی، موبدوں اور دستوروں کو قتل کر دیا، اور جس قدر کتابیں تھیں مذہبی یا تاریخی تمام برباد کر دیں، قریباً چارسو برس تک کسی نے ایران کی قدیم تاریخ کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، سب سے پہلی کوشش اس باب میں جو ہوئی وہ سلاطین سامانیہ کی طرف سے ہوئی، اور وہ بھی اس وجہ سے کہ یہ خاندان بہرام چوبین کی نسل سے تھا، اور ان کو اپنے باپ دادا کا نام زندہ کرنا مقصود تھا"

ملکم صاحب نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اول جو کتاب شاہان عجم کی تاریخ میں لکھی گئی، وہ شاہنامہ تھی، ملکم صاحب نے صحابہ اور قرن اول پر جو متواتر اتہام لگائے ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ان کا یہ بیان

---

[1] ان سات اخیر کتابوں کا ذکر کتاب الفہرست ص۳۰۵ میں ہے،

کس قدر صحیح ہے کہ مسلمانوں نے چار سو برس تک ایران کی تاریخ پر توجہ نہیں کی، ذالک مبلغہم من العلم

غریب ملکم کو معلوم نہیں کہ ساسانیوں کے دور سے پہلے ایسے بہت سے مسلمان مورخ گذرے ہیں جنہوں نے اپنی تمام عمر صرف ایران کی تاریخ کی تدوین و ترتیب میں صرف کر دی، ان میں سے ایک عمر کسروی تھا جس کا لقب اسی وجہ سے کسروی پڑ گیا تھا، خدائی نامہ جس کا ذکر ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس کی نسبت موسیٰ کسروی کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کو بار بار پڑھا، اور اس کی تصحیح و تحقیق میں بہت کوشش کی، لیکن اس کے جس قدر نسخے ہاتھ آئے سب مختلف اور متناقض تھے، بالآخر میں حسن بن علی الہمدانی سے مقام مراغہ میں ملا، اور چونکہ وہ اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اس سے اس کتاب کی تصحیح کرنی چاہی،[1] اس کے بعد کسروی نے نہایت غور رسی سے جس طرح سنین اور تاریخ کی تحقیق کی ہے، اس کو مفصل لکھا ہے،

مورخ مسعودی نے باوجود اس کے کہ عرب کی نسل سے ہے ایک خاص کتاب تجاوران ایران کے معرکوں پر لکھی، اور خود کتاب التنبیہ والاشراف میں تصریح کی کہ میں نے یہ کتاب ابو عبیدہ کے جواب میں لکھی، جس نے بہادران عرب کے معرکے لکھے تھے، غریب ملکم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ علامہ طبری، مسعودی، ابو حنیفہ دینوری، ابن واضح کاتب عباسی، حمزہ اصفہانی وغیرہ جنھوں نے ایران کی تاریخیں نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھیں، سب کے سب ساسانی دور سے پہلے تھے،

شاہنامہ، عام تاریخ کی حیثیت سے تو درکنار، منظوم تاریخ ہونے کی حیثیت سے بھی نئی تصنیف نہیں، سب سے پہلے جس نے شاہنامہ نظم میں لکھا، وہ ابو علی محمد بن احمد البلخی شاعر تھا، لیکن اس نے صرف شاعرانہ حیثیت سے یہ کتاب نہیں لکھی، بلکہ ایران کی نہایت قدیم اور نایاب تاریخیں فراہم کی ہیں، چنانچہ اس نے خود تصریح کی ہے کہ اس کتاب کے واقعات اس نے سیر الملوک عبداللہ بن المقفع و سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی و سیر الملوک ہشام بن القاسم و سیر الملوک بہرام بن مروان شاہ و سیر الملوک بہرام بن مہران اصفہانی سے لیے ہیں، اور بہرام مجوسی کی تصنیفات سے اسکا مقابلہ کیا ہے،[2]

ملکم صاحب کی کوتاہ بینی تو بالکل تعصب پر مبنی ہے، لیکن چونکہ ایران کی تاریخوں میں جو مسلمانوں

---

[1] تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۱۶، ۱۷، [2] دیکھو کتاب الآثار الباقیہ بیرونی مطبوعہ یورپ صفحہ ۹۹

نے لکھیں۔ دور دراز کار قصے مثلاً سیمرغ، دیو سفید، مار ضحاک، ہفتخواں وغیرہ اکثر پائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ یونانی مورخوں کی تحریروں سے اکثر جگہ مطابق نہیں۔ اس لیے ظاہر میں یہ قیاس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ایران کا قدیم تاریخی سرمایہ ہاتھ نہیں آیا، لیکن درحقیقت یہ قیاس صحیح نہیں، مسلمان ہمیشہ سے اس بات کے عادی ہیں کہ جو روایت ان کے ہاتھ آئے اس کو بغیر کسی تصرف اور کانٹ چھانٹ کے بیان کر دیں، ایران کی قدیم تاریخوں میں یہ تمام دور از کار قصے موجود تھے، اسلامی مورخوں نے ان کو اسی طرح نقل کر دیا، نہ اس لیے کہ وہ بھی وہم پرست اور اس قسم کی مزخرفات پر یقین رکھنے والے تھے، بلکہ اس لیے کہ نقل و روایت میں دیانتداری کا یہی مقتضا ہے، کہ اپنی طرف سے کچھ تصرف نہ کیا جائے۔ مورخ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں مار ضحاک و سلاطین کی درازی عمر وغیرہ کی نسبت صاف تصریح کر دی ہے کہ "یہ ایرانیوں کی لغویات ہیں"۔ بیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ ولهم فی التواریخ القسم الاول واعمار الملوک وافاعیلهم المشهورة عنهم ما یستنفر عن استماعه القلوب وتمجه الآذان ولا تقبله العقول[1]۔

یونانی مورخوں سے اختلاف کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمانوں نے جب ایران کی تاریخ لکھنے پر توجہ کی تو ان کے سامنے دو مختلف ماخذ موجود تھے، خود ایرانی تصنیفات اور یونانی مورخوں کی جستہ جستہ تحریریں، لیکن مسلمانوں نے صاحب البیت ادری بما فیه کے بموجب ایرانی ہی تصنیفات پر اعتبار کیا، مورخ مسعودی نے کتاب التنبیه والاشراف میں صاف لکھا ہے[2]۔

ولم نذکر من ذالک الا ما ذکرته الفرس دون غیرهم من الامم کالاسرائیلیین والیونانیین والروم اذ کان ما یذهبون الیه فی ذالک خلاف ما حکته الفرس وکانت الفرس احق ان یوخذ عنها، یعنی میں نے اس باب میں صرف وہ بیان کیا ہے جو ایرانیوں نے لکھا ہے، نہ وہ جو اور قوموں مثلاً یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں نے لکھا ہے، کیونکہ ان قوموں کا بیان ایرانیوں سے مختلف ہے، اور ایرانی ہی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی روایت اختیار کی جائے۔

[1] آثار الباقیہ للبیرونی ص ۱۰۔ [2] دیکھو کتاب مذکور ص ۸۱۔

مذہبی تصنیفات کا ترجمہ

تاریخ کے علاوہ مذہبی کتابوں کا ایک بڑا سلسلہ تھا، اور وہ جہاں تک مل سکا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

ایران میں سب سے پہلا بانیِ مذہب جس کا نام ونشان معلوم ہے، زردشت تھا، اس پر جو کتاب (بخیال اس کے) آسمان سے اتری، اس کا نام اوستا تھا، یہ کتاب قدیم پہلوی زبان میں تھی، زردشت نے خود اس کا ترجمہ کیا، اور اس کا نام پاژند رکھا، پھر موبدون نے اس شرح کی شرح لکھی، جس کا نام پاردہ تھا، مجوسی اس تمام سلسلے کو آسمانی اور وحیِ الٰہی خیال کرتے تھے، شرح الشرح تو سکندر کے ہاتھوں بالکل برباد ہوگئی، لیکن اوستا اور ژند و پاژند کا سلسلہ باوجود سکندر کی غارت گری کے جا بجا، بچا رہ گیا، اور وہی مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اوستا میں کل اکیس سورتیں تھیں، اور ہر سورۃ تقریباً چار چار سو صفحوں میں لکھی جاتی تھی، ان سورتوں میں سے ایک سورہ کا نام جیسترشت تھا، جس میں دنیا کے آغاز اور انجام کا حال بیان کیا گیا ہے، ایک سورہ کا نام ہادوخت تھا، جس میں نصائح اور پند تھی، غرض یہ تمام سلسلہ مسلمانوں نے بہم پہنچایا، اور نہایت احتیاط سے اس کو محفوظ رکھا، چنانچہ مورخ مسعودی نے تصریح کی ہے کہ چوتھی صدی کے آغاز تک یہ کامل نسخہ موجود تھا، اور سیستان میں ایک شخص کو یہ کتاب تمام و کمال حفظ یاد تھی، اگرچہ قرائن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، لیکن اس قدر تو صریح شہادتوں سے ثابت ہے کہ اوستا کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا، اور مدتوں تک اس کے نسخے پائے جاتے تھے، حمزہ اصفہانی جو تیسری صدی میں تھا، اس نے اپنی کتاب تاریخ سنی الملوک میں جا بجا اوستا کے عربی ترجمہ کے حوالے دیئے ہیں، اور یہ ترجمہ خود اس کی نظر سے گذرا تھا، حمزہ اصفہانی نے جو تاریخ کبیر لکھی اسمیں بھی تصریح کی ہے کہ میں نے اس کتاب کے واقعات کو اوستا سے مقابلہ کرکے صحیح کیا ہے۔[1]

زردشت کے علاوہ اور بہت سے جو مدعیانِ نبوت یا بانیانِ مذہب پیدا ہوئے، ان میں مرقیون ابن دیصان، مزدک اور مانی زیادہ مشہور ہیں، مرقیون تیتس کے زمانہ میں تھا، جو قیصرانِ روم کے سلسلہ میں

---

[1] اوستا اور ژند و پاژند کے متعلق دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۹۱، ۹۲، مسعودی مطبوعۂ یورپ جلد دوم صفحہ ۱۲۶ و تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۱۲ والآثار الباقیہ للبیرونی صفحہ ۱۰۵۔

بارھواں قیصر گذرا ہے، ابن دیصان، مرقیون سے تیس ۳۰ برس بعد پیدا ہوا، مانی، شاپور بن اردشیر کے زمانہ میں تھا، مزدک قباد کا ہمعصر تھا، مرقیون اس بات کا قائل تھا کہ تمام کائنات نور وظلمت سے پیدا ہوئی ہے، خدا نے خود کائنات کو نہیں پیدا کیا، کیونکہ کائنات برائی سے خالی نہیں، اور خدا برائی کا خالق نہیں ہوسکتا، مرقیون نے عقائد وغیرہ کے متعلق ایک کتاب لکھی جس کا نام انجیل رکھا، یہ کتاب بعینہٖ عربی زبان میں ترجمہ کی گئی،

ابن دیصان کا مذہب مرقیون کے قریب قریب ہے، بلکہ گویا مرقیون کے مذہب کی ایک شاخ ہے، اس نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں، اُن میں سے کتب ذیل کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا،

کتاب النور والظلمت، کتاب روحانیۃ الحق، کتاب المتحرک والجماد،

مانی نبوت کا مدعی تھا، اور اپنے تئیں فارقلیط کا مصداق سمجھتا تھا، اس نے ایک انجیل تصنیف کی تھی جو موجودہ انجیل سے بالکل الگ تھی، اس کے اصول عقائد یہ تھے کہ نور وظلمت قدیم ہیں، احکام فقہی میں جانور کا ذبح کرنا، آگ، پانی، نباتات کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اس کی تصنیفات بکثرت ہیں جن میں سات بطور اصل کے ہیں، ان میں ایک فارسی زبان اور چھ سریانی زبان میں ہیں، یعنی سفر الاسرار، سفر الجبابرۃ، فرائض السماعین، شاپورگان، سفر الاحیار، فرقماطیہ،

شاپورگان، مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتی تھی، علامہ ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیۃ میں جابجا اس کے حوالے دیئے ہیں، اور لکھا ہے کہ تاریخی واقعات کے متعلق اردشیر کے زمانہ کے بعد ایرانی تصنیفات میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے[1]

مانی کی تصنیفات ایک مدت تک موجود رہیں، علامہ ابوریحان بیرونی نے ایک رسالہ میں جو الآثار الباقیۃ کے ساتھ چھپا ہے، لکھا ہے کہ مجھ کو مانی کی تصنیفات کی بہت تلاش تھی، چنانچہ ایک دوست کے ذریعہ سے کتب ذیل میسر آئیں،

فرقماطیا، سفر الجبابرۃ، کنز الاحیار، فسخ الیقین، انجیل، شاپورگان، سفر الاسرار، ان کتابوں کے علاوہ مانی نے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے تھے، اور ان تمام رسالوں کا عربی زبان میں ترجمہ

---

[1] الآثار الباقیۃ ص ۱۱۸،

کیا گیا، ابن الندیم نے ان تمام رسالوں کے نام بہ تفصیل لکھے ہیں[1]

مانی کی تصنیفات و تالیفات اس کثرت سے عربی میں متداول ہوئیں کہ مسلمانوں میں اس کے معتقدات و خیالات عام طور پر پھیل گئے، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کی نسبت گمان کیا گیا کہ وہ مانی کے پیرو ہوگئے مسعودی کے حوالے سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ابن ابی العوجاء، حماد عجرد، یحییٰ بن زیاد، مطیع بن ایاس، نے مانی کی تائید میں کتابیں لکھیں، ابن الندیم نے اور بہت سے مسلمان علماء کے نام لکھے ہیں، جو مانی کی پیروی میں بدنام تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نری تہمت ہے، مسلمانوں میں ہمیشہ آزاد خیالی اور تعصب دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں، جو لوگ آزاد خیال تھے وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے مسائل کی تحقیقات اور اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، متعصبوں کے نزدیک غیر مذاہب والوں کا نام لینا بھی کفر تھا، اس لیے جو آزاد خیال علماء غیر مذاہب کے مسائل کو کسی حیثیت سے بیان کرتے تھے، متعصبوں کے نزدیک وہ انہی مذاہب کے پیرو کہلاتے تھے،

ایران میں سب سے اخیر جو شخص مذہبی فرقہ کا بانی ہوا وہ مزدک تھا، یہ نوشیروان کے باپ قباد کے زمانہ میں تھا، اور قباد اس کا مقلد ہوگیا تھا، مزدک کا اصل مذہب قریب قریب وہی تھا جو آجکل یورپ میں رڈیکل اور سوشلیسٹ وغیرہ کا ہے، یعنی ہر آدمی دوسرے آدمی کے مال اور ناموس پر اختیار رکھتا ہے، اسی بنا پر مزدک کے مذہب میں زنا کچھ گناہ نہ تھا، یہ معلوم نہیں کہ مزدک نے کوئی مستقل تصنیف کی تھی یا نہیں، لیکن یہ ثابت ہے کہ اس کے مسلمات و معتقدات و احکام و مسائل جس قدر تھے عربی زبان میں آگئے تھے، چنانچہ علامہ بلخی نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جس کا نام عیون المسائل والجوابات ہے[2]، مزدک کے حالات فارسی زبان میں اسلام سے پہلے قلمبند کیے گئے تھے، عبداللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا،[3]

تاریخی اور مذہبی تصنیفات کے بعد جو چیز مسلمانوں کو سب سے زیادہ مرغوب تھی، وہ فن ادب تھا،

---

[1] مانی و مرقیون و ابن دیصان اور ان کی تصنیفات و مسائل کا ذکر فہرست ابن الندیم و کتاب التنبیہ والاشراف و الآثار الباقیہ میں مفصلاً و مجملاً ہے، [2] کتاب الفہرست صفحہ ۳۴۲، [3] ایضاً صفحہ ۱۱۸،

چنانچہ فارسی کے لٹریچر کا جس قدر سرمایہ ہاتھ آیا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپ اور لطیف کتاب ہزار افسانہ تھی، جو عربی میں ترجمہ ہو کر الف لیلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب اصل میں شاہان عجم کے مشغلہ اور شب بیداری کے لیے تصنیف ہوئی تھی، اس میں ہزار راتیں اور دو سو سے کم قصے تھے، چنانچہ اس کا بعینہ ترجمہ کیا گیا، لیکن موجودہ الف لیلہ فارسی کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ غالباً اس نسخہ سے مرتب کیا گیا ہے جو محمد بن عبدوس جہشیاری نے بہت سے فسانہ گویوں کو جمع کر کے خود ایک جدید کتاب تیار کی تھی، جس میں چار سو اسی راتیں تھیں۔[۱]

الف لیلہ کے سوا فارسی کے اور بہت سے ناول اور افسانے عربی زبان میں ترجمہ کیے گئے، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نام عربی میں آکر کچھ ایسے بدل گئے ہیں، کہ لفظ کی صحت نہیں ہو سکتی، ان میں سے ابن الندیم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

کتاب یوسفاس، [illegible] خسروا، مرمن، نمرا قد و نزہة، خرس و خرگوش، روز بہ، سگ زمانہ، شاہ زنان، نمر قدنامہ[۲]

اس سلسلہ کے علاوہ فن انشا کی اور بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ عجیب کتاب تیمیہ تھی، اس کتاب کی خوبی اور عمدگی اس قدر مسلم تھی کہ ملاحدہ اس کو قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے (نعوذ باللہ)، چنانچہ علامہ باقلانی کو اپنی کتاب اعجاز القرآن میں اس کا جواب دینا پڑا، تیمیہ کے مقابلہ کی دوسری کتاب اردشیر کا عہد نامہ تھی، چنانچہ اس کا ترجمہ بھی عربی میں موجود ہے، ابن الندیم نے لکھا ہے کہ جن کتابوں کی خوبی پر تمام زمانہ کا اتفاق ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

عہد اردشیر، کلیلہ و دمنہ، رسالہ عمارۃ بن حمزہ، ماہ آنیہ، تیمیہ، رسالہ حسن الاحمد ابن یوسف بکاتب[۳]

آداب و اخلاق کی کتابیں بھی کثرت سے ترجمہ کی گئیں، ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں،

نامۂ فرخ زاد۔ بیٹے کی نصیحت کے لیے لکھی تھی،

نامۂ مہراد و حسیس۔ یہ دونوں موبد تھے، اور بزرجمہر وزیر نوشیروان کے لیے یہ کتاب لکھی تھی،

---

[۱] الف لیلہ کے متعلق پوری تفصیل کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۴ میں ہے، [۲] کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۵ [۳] ایضاً صفحہ ۱۲۶،

بغداد میں۔

موبد مُوبدان کی کتاب۔ محاضرات اور اخلاق میں ہے،

کتاب اردشیر فی التدبیر۔ یہ کتاب اردشیر کے حکم سے تمام حکما کی کتابوں سے التقاط کر کے لکھی گئی تھی[1]

کتاب بن مردبود۔ ہرمز بن کسریٰ کے لیے تصنیف کی گئی تھی،

توقیعات کسریٰ۔ نوشیروان کے فرامین اور احکام،

آداب کبیر
آداب صغیر } یہ دونوں کتابیں آداب و اخلاق میں ہیں، اور عبداللہ بن المقفع نے ان کا ترجمہ کیا،

فن حرب

فن حرب اور تدابیر جنگ کے متعلق نہایت مفید کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، چنانچہ بعض کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں:

کتاب آداب الحروب:۔ اس میں نہایت تفصیل سے لشکر آرائی، قلعوں اور شہروں کا محاصرہ، گشت کی فوج، سرحد کی مضبوطی، اس قسم کے امور کے متعلق ہر قسم کے قاعدے اور تدبیریں درج تھیں، یہ کتاب اردشیر کے لیے تیار کی گئی تھی،

کتاب تعبیۃ الحروب
و آداب الاساورہ } اس میں خاص لشکر آرائی اور سواروں کی قواعد کے طریقے درج ہیں،

کتاب الرمی:۔ تیر اندازی کے فن میں تھی، اور بہرام گور کی تالیف تھی،

چوگان و گوی:۔ اس کا مضمون نام سے ظاہر ہے،

ان فنون کے سوا اور بہت سے مضامین کی کتابیں ترجمہ کی گئیں، مثلاً بیطاری، شکار بازی، قیافہ، شگون وغیرہ وغیرہ، چنانچہ ان مترجم کتابوں کے نام جا بجا فہرست ابن الندیم میں ملتے ہیں[2]

---

[1] ان کتابوں کا ذکر فہرست ابن الندیم صفحہ ۳۱۵ و ۳۱۶ میں ہے، [2] ان کتابوں کیلئے دیکھو ابن الندیم ص۳۱۵،

کلدانی، نبطی، سریانی

تمام مورخوں کا بیان ہے کہ دنیا میں سب سے اول تہذیب و تمدن کی ابتدا بابل و نینوا سے ہوئی، اور یہی شہر کسی زمانہ میں جاہ و دولت اور حرفت و صنعت کے مرکز تھے، خسوف و کسوف کے دریافت کے قاعدے اول یہیں کے علماء نے معلوم کیے، دھوپ گھڑی اول یہیں ایجاد ہوئی، یہاں کی زبان نے مختلف زمانوں میں مختلف نام پائے، یعنی آرامی پھر کلدانی، پھر سریانی، آرامی و کلدانی پیکانی خط میں لکھی جاتی تھی،

مسلمانوں نے قدامت کے لحاظ سے ان زبانوں کی طرف نہایت توجہ کی، اور علوم و فنون موجود تھے، لیکن مسلمانوں کے دور تک اصلی علوم اکثر مٹ چکے تھے، اور اخیر اخیر صرف نجوم، سحر، خواب کی تعبیر، اور اس قسم کی باتوں پر مدار رہ گیا تھا، غرض جو کچھ ذخیرہ مل سکا مہیا کیا گیا، اور عربی زبان میں منتقل ہوا،

بابل میں ستاروں کے نام پر سات بڑے عظیم الشان ہیکل تعمیر کیے گئے تھے، جن میں سے بعض کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں، یہ ہیکل بڑے بڑے علماء کے اہتمام میں تھے، اور وہ ان ہیکلوں سے رصد خانہ کا کام لیتے تھے، چنانچہ عطارد کا ہیکل ہرمز کے اہتمام میں، مشتری کا تینکلوس کے اہتمام میں، مریخ کا طینقر دس کے اہتمام میں تھا، ہرقل اور قیطوار بھی ان ہی علماء میں تھے،

تینکلوس ایک مشہور عالم یہاں کا تھا، جس کی نسبت علامہ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ ضحاک کے وقت میں تھا[1]،

افسوس ہے کہ انگریزی کتابوں کی رو سے ان ناموں کی تصحیح نہیں ہو سکتی، نوفل آفندی نے اپنی کتاب سیاحۃ المعارف میں جو یورپین تصنیفات سے ماخوذ ہے، لکھا ہے کہ بابل کے علماء میں بیروس ایک بڑا ہیئت دان تھا، جو حضرت عیسیٰ سے ۲۱۳۰ برس پہلے تھا، ممکن ہے کہ یہ تینکلوس ہو جس کو

---

[1] فہرست ابن الندیم ص۲۳۵،

ابن الندیم نے ضحاک کا معاصر لکھا ہے، بہرحال عرب کے مورخوں کی تحریر کے مطابق ان سات علما میں سے اکثروں کی تصنیفات بہم پہنچیں اور ان کا ترجمہ کیا گیا، تینکلوس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہو کر کتاب الوجوہ والحدود کے نام سے موسوم ہوئی،

قیطوار کی کتاب کا نام صناعۃ النجوم رکھا گیا، ہرمز کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، جن کے نام ابن الندیم نے تفصیل سے لکھے ہیں[1] لیکن چونکہ وہ صرف جادو اور شعبدہ و کیمیا کے متعلق ہیں، میں ان کے نام قلم انداز کرتا ہوں،

بابل کی تاریخیں جو یہیں کی زبان میں لکھی گئی تھیں، ان میں سے اکثر کا ترجمہ ہوا، چنانچہ ابن الندیم نے ان کے عربی نام حسب ذیل لکھے ہیں، کتاب ملک بابل، کتاب نمرود، کتاب الملک الراکب، کتاب الشیخ والفتی، کتاب الدشیر، کتاب لاہج، کتاب الحکیم الناسک،

مانی کی سات مشہور تصنیفات میں سے چھ سریانی زبان میں تھیں، اور ان سب کا ترجمہ ہوا چنانچہ اس کا ذکر زبان فارسی کے ذیل میں اوپر گذر چکا،

کلدانی زبان کا سب سے بڑا مشہور مترجم احمد بن علی تھا، جو ابن وحشیہ کے نام سے مشہور ہے، اور جو نسل کے لحاظ سے بھی کلدانی تھا، علم فلاحۃ کے متعلق اس نے بابل کی تصنیفات کا جو مجموعہ مرتب کیا وہ درحقیقت نہایت مفید تصنیف ہے، اور آج بھی مصر کے کتبخانہ خدیویہ میں موجود ہے، طب، دینیات سحر، نجوم وغیرہ کے متعلق اس نے کلدانی زبان کا بہت بڑا ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کیا، ان میں سے ابن الندیم نے جن کتابوں کے نام لکھے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

کتاب طرد الشیاطین، کتاب السحر الکبیر، کتاب السحر الصغیر، کتاب الدوار علی مذہب النبط، کتاب مذاہب الکلدانیین فی الاصنام، کتاب الاشارۃ فی السحر، کتاب اسرار الکواکب، کتاب حیاوثی الکلدانی، کتاب الحیاۃ والمماۃ فی علاج الامراض لراہطا بن سموطان الکلدانی، کتاب الاصنام، کتاب القرابین، کتاب الطبیعۃ، کتاب الاسماء[2]

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۱۲ صفحہ ۳۵۳، [2] ایضاً صفحہ ۳۱۲ و ۳۱۳،

عبرانی

یہ زبان سمٹک زبان کی شاخ اور کلدانی کی بہن ہے، اس زبان میں اگرچہ فلسفہ وسائنس کا ذخیرہ نہیں تھا، لیکن توریت وزبور وانجیل کی اصلی زبان عبرانی ہے، اور بہت سے صحف انبیاء بھی اسی زبان میں ہیں، اس لحاظ سے اس زبان کے ساتھ بھی نہایت اعتنا کیا گیا، غالباً سب سے اول جس نے عبرانی کتابوں کا ترجمہ کیا، وہ احمد بن عبد اللہ بن سلام ہارون الرشید کے دربار کا ملازم تھا، اس فاضل نے عہد عتیق اور عہد جدید کی تمام کتابوں کا ترجمہ کیا، اور یہ التزام رکھا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے صحف انبیاء، توراۃ، انجیل اور کتب انبیاء کا ترجمہ عبرانی اور یونانی وصیانی زبان سے کیا، اور ترجمہ میں عبارت کی خوبی اور آرائش سے بالکل قطع نظر کی کہ معنی میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پائے۔[1]

توریت کا دوسرا ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا، یہ ترجمہ اس یونانی نسخہ سے کیا گیا تھا، جو مصر میں بطلیموس اسکندر کے زمانہ میں بہتر بڑے بڑے نامور پادریوں نے عبرانی زبان سے یونانی زبان میں کیا تھا، اور یہ نسخہ تمام نسخوں سے صحیح ترسمجھا جاتا تھا۔[2]

عہد عتیق اور جدید کے مجموعہ کا جس میں چوبیس کتابیں شامل ہیں، اور لوگوں نے بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا، جن میں سے اکثر یہود تھے، چنانچہ ان میں سے مفصلۂ ذیل علماء کا نام مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف میں لکھا ہے:

ابو کثیر یحییٰ بن زکریا الکاتب الطبرانی	۳۲۰ھ میں وفات پائی،
سعید بن یعقوب الفیومی الیہودی	بہت بڑا فاضل تھا، بغداد کے وزراء اور قضاۃ کے دربار میں اکثر حاضر ہوتا تھا، اور اسرائیلیوں کے مباحثات میں اس کے فیصلے ہمیشہ تسلیم کیے جاتے تھے، ۳۳۱ھ کے بعد

[1] یہ تمام تفصیل کتاب الفہرست ص۲۲ و ص۲۳ میں ہے [2] کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی ص۱۱۱

	وفات پائی،
داؤد قومسی،	بیت المقدس میں رہا کرتا تھا، ۳۳۴ھ میں وفات پائی،
ابراہیم بغدادی،[۱]	یہ بھی چوتھی صدی میں تھا،

قبطی

قبطی زبان سے مصر کی قدیم زبان مراد ہے، مصر میں اگرچہ آج کل عموماً عربی زبان شائع ہے، لیکن اصلی قبطی زبان معدوم نہیں ہوئی، اور قبطیوں کی مذہبی کتابیں اب بھی اسی زبان میں لکھی جاتی ہیں[۲] البتہ خطوط میں بہت انقلابات ہوئے، نہایت ابتدائی زمانہ میں ہیروغلوفی خط جاری تھا، جو اہرام وغیرہ پر کندہ ہے، اس خط میں حروف نہ تھے، صرف نقوش اور تصویریں تھیں، جو بالذات یا بالعرض مطالب پر دلالت کرتی تھیں، سنہ ۶۶۰ ق م ابجدی حروف ایجاد ہوئے، مذہب عیسوی کا قدم آیا تو یونانی خط جاری ہوا، اور تمام تالیفات وتصنیفات اسی زبان میں ہونے لگیں،

قدیم زمانہ کی تصنیفات تو اسلام سے پہلے معدوم ہو چکی تھیں، لیکن زمانۂ مابعد کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، جو زیادہ تر بلکہ قریباً کل یونانی زبان میں تھا، کیونکہ اسکندریہ میں حضرت عیسیٰؑ سے دو سو اٹھاسی (۲۸۸) برس پہلے فلسفہ کا جو مدرسہ قائم ہوا تھا، وہ گویا یونان کی شاخ تھا، اور اسکندریہ کے بڑے بڑے حکماء مثلاً استرخس، ایرخس، اپلونیوس، فرفوریوس وغیرہ جن کا ذکر اوپر گذر چکا، سب دراصل یونانی تھے،

اس عہد کی اکثر تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، لیکن اُن کا ذکر یونان کے تذکرہ میں گذر چکا، یہاں صرف قبطی زبان کے سرمایہ سے بحث ہے، اگرچہ ہم تفصیل سے یہ نہیں بتا سکتے کہ اس زبان کی کیا کیا کتابیں ترجمہ ہوئیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس زبان کے ہر قسم کے سرمایہ بہم پہنچانے میں نہایت کوششیں کی گئیں، لوگ

---

[۱] ان چاروں کے لیے دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۱۱۳، [۲] سیاحۃ المعارف صفحہ ۴۰،

کو تعجب ہوگا۔ لیکن مورخ مسعودی نے بڑے وثوق کے ساتھ بسط روایت کی ہے، کہ حضرت ذوالنون مصری کو مصر کی قدیم عمارتوں کے کتبوں کے دریافت کرنے کا نہایت شوق تھا، اور انھوں نے ہیروغلوفی خط کے نقوش اور تصویروں کو بڑی کوشش سے پڑھا تھا۔ مسعودی کے خاص الفاظ جیسا کہ علامہ مقریزی نے نقل کیے ہیں، یہ ہیں[1]

واخبرنی غیر واحد من بلاد اخمیم من صعید مصر عن ابی الفیض ذی النون بن ابراھیم المصری الاخمیمی الزاھد وکان حکیما وکانت له طریقة یاتیها ونحلة یعضدها وکان ممن یقرأ علی اخبار ھذہ البرابی[2] وامتحن کبیرا منها صور فیها ورسم علیها من الکتابة والصور قال رأیت فی بعض البرابی کتابا تدبرته فاذا ھو ورایت فی بعضها کتابا تدبرته فاذا فیه یقدر المقدر والقضاء یضحك۔

ابوزید بلخی نے لکھا ہے کہ اہرام پر جو تحریریں ہیں، ان میں سے ایک عبارت کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو اس کا یہ مطلب تھا[3] الخ۔ مورخ مقریزی نے اپنی کتاب (جلد اول صفحہ ۱۱۶) میں ایک اور واقعہ بہت تفصیل سے لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہایت قدیم قبطی خط کے پڑھنے والے اسلام کے زمانہ میں موجود تھے۔ اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ہیروغلوفی خط کے پڑھنے کا فخر یورپ سے چھین کر مسلمانوں کو ملنا چاہیے، ہیروغلوفی خط کے متعلق کچھ شبہہ ہو تو ہو، لیکن زمانۂ مابعد کی قبطی تصنیفات کا ترجمہ کیا جانا بالکل یقینی ہے، فرعون کے زمانہ کی مالگذاری اور اس کے مصارف کی تعداد اور تفصیل جو مسلمان مورخ نے لکھی ہے، وہ درحقیقت ایک قبطی کتاب کا ترجمہ ہے، چنانچہ مورخ مقریزی نے اس کتاب کے ترجمے کیے جانے کی تصریح کی ہے[4]۔

---

[1] دیکھو مقریزی جلد اول ص۳۹ ، [2] برابی بربا کی جمع ہے، بربا مصر کے قدیم مقبروں اور اس قسم کی عمارتوں کو کہتے ہیں، [3] مقریزی جلد اول ص۱۱۵ ، [4] ایضاً ص۷۵ ۔

سنسکرت

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ سنسکرت کے ترجموں کی ابتدا خلیفہ منصور کے عہد سے ہوئی، یعنی ہندوستان کا ایک نامور پنڈت منصور کے دربار میں آیا، اور کتاب سدھانتا نند گذرانی جس کا ترجمہ دربار کے ایک عالم محمد بن ابراہیم فزاری نے کیا، اسی زمانہ میں یحییٰ برمکی نے ایک شخص کو ہندوستان بھیجا کہ وہاں جو دوائیں پیدا ہوتی ہیں، ان کو تلاش کر کے لائے، اور نیز ہندوستان والوں کے عقائد اور مذہب وغیرہ کی تفصیل لکھ کر لائے، چنانچہ اس رپورٹ کا ایک نسخہ علامہ ابن الندیم نے یعقوب کندی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا تھا، جس کی تاریخ کتابت ۲۴۹ھ تھی[1] علامہ مذکور نے لکھا ہے کہ خاندان برامکہ نے ہندوستان سے بہت سے پنڈت اور وید کے علماء طلب کیے۔ افسوس کہ ان کے نام کی تفصیل صحت کے ساتھ نہیں ملتی، جاحظ اپنی کتاب البیان والتبیین میں ایک جگہ ایک ضمنی تذکرہ میں لکھ گیا ہے[2] کہ "معمر کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں یحییٰ بن خالد نے ہندوستان کے حکیموں یعنی منکہ، بارکر، قلرقل، سندباد وغیرہ وغیرہ کو طلب کیا تھا، میں نے بہلہ ہندی سے پوچھا کہ بلاغت کس کو کہتے ہیں، الخ" اس عبارت سے پتہ لگتا ہے کہ بہت سے ہندو پنڈت اور طبیب بغداد میں آئے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی تفصیل نہیں ملتی،

برامکہ کے سوا، ہارون الرشید اور مامون الرشید کی قدردانی نے ہندوستان کے اہل کمال کو بغداد کی طرف متوجہ کیا، ہارون الرشید ایک مرتبہ سخت بیمار ہوا، اور پایۂ تخت کے اطباء علاج سے عاجز آگئے، اس زمانہ میں ہندوستان کے ایک پنڈت کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی ابو عمرو عجمی کی تحریک سے ہارون الرشید نے اس کو طلب کیا، اور اس کے علاج سے خدا نے شفا دی، اس فاضل کا نام منکا تھا، اور وہ طبابت کے علاوہ علوم عقلیہ کا بڑا ماہر تھا، بغداد میں رہ کر اس نے فارسی زبان سیکھ لی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے کرائے[3]،

۱؎ کتاب الفہرست صفحہ ۳۴۵، ۲؎ کتاب مذکور صفحہ ۴ مطبوعہ مصر، ۳؎ منکا کا مفصل تذکرہ طبقات الاطباء جلد دوم صفحہ ۳۳ میں ہے۔

ہارون الرشید کے دربار کا ایک نامور پنڈت سالی تھا، جس کو عرب کے مصنف صالح لکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک اور مشہور فاضل ہندو تھا، جس نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے، اس کے باپ کا نام دھن تھا، اور اہل عرب اس کو اصلی نام کے بجائے ہمیشہ ابن دھن یعنی دھن کا بیٹا لکھتے ہیں برکیوں نے بغداد میں جو ہسپتال بنایا تھا، یہ اسکا افسر تھا،[1]

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سنسکرت اور بھاشا کی تعلیم اس حد تک وسیع ہو گئی تھی کہ مدت تک ایک گروہ اس قسم کا موجود رہا جو ان زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا، ہارون الرشید نے ہندوستان میں جو علماء مناظرہ کے لیے بھیجے تھے، ضرور ہے کہ سنسکرت داں ہوں گے اور مسعودی ۳۰۳ھ میں کھنبات آیا تھا، اور وہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی تھی، وہ لکھتا ہے کہ یہاں کا راجہ [illegible] مذہبی مناظروں کا بہت شایق ہے، اور مسلمان اور دوسرے مذہب کے لوگ جو اس کے [illegible] آتے ہیں، ان سے بحث اور گفتگو کرتا رہتا ہے،[2] یہ ظاہر ہے کہ مناظرہ بھاشا زبان میں ہوتا ہوگا، سنسکرت تصنیفات سے واقفیت کے بغیر مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی،

اس گروہ میں سب سے بڑا ماہر ابوریحان بیرونی تھا، جس کا مختصر حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس کی سنسکرت دانی اس مرتبہ کی تھی، کہ اس نے بعض عربی تصنیفات کو ہندوؤں کے لیے سنسکرت میں ترجمہ کیا، سنسکرت علوم و فنون کے متعلق جو کتاب اس نے لکھی ہے، اور جس کو جرمنی کے مشہور پروفیسر زخاؤ نے اپنی تصحیح سے چھپوایا ہے، ہمارے سامنے ہے، یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے، مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرۂ معلومات مہیا کیا ہے، ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ ہندو اپنی کتابوں کے دینے میں بخل کرتے تھے، اس لیے مصنف نے بہت سی کتابوں کو زبانی پڑھا اور یاد کیا، اس نے خود لکھا ہے[3] کہ مختلف پرانوں میں سے جو پران میں نے زبانی سیکھے وہ حسب ذیل ہیں،

---

[1] کتاب الفہرست ص ۲۴۵، [2] مسعودی مطبوعہ یورپ جلد اول ص ۲۵۴، [3] کتاب الہند ص ۶۳،

اور پران، مچھ پران، کورم پران، براہ پران، نرسنگھ پران، بایو پران، بامن پران، نند پران، اسکند پران، ادت پران، سوم پران، سانب پران، برہمانڈ پران، مارکنڈیو پران، تارکش پران، بشن پران، برہم پران، بہش پران،

بیرونی کی کتاب کی جامعیت و وسعت معلومات کا اندازہ ان ابواب کے عنوان سے ہو سکتا ہے، جو مصنف نے اختیار کیے ہیں، یہ کل اسی عنوان ہیں، اور ہر عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے، اور جو کچھ لکھا ہے سنسکرت کی مستند کتابوں سے لکھا ہے، ان میں سے بعض عنوان ہم نمونہ کے طور پر نقل کرتے ہیں،

(۱) ہندوؤں کا اعتقاد خدا کی نسبت،

(۲) موجودات عقلیہ اور حسیہ کی نسبت اعتقاد،

(۳) تناسخ کا مسئلہ،

(۴) بید اور پران اور دیگر مذہبی کتابیں،

(۵) نحو اور عروض کی تصنیفات،

(۷) ہیئت اور نجوم، اس کے متعلق بہت سے عنوان قائم کیے ہیں، اور ہر ایک پر مفصل بحث کی ہے،

(۸) حرام و حلال،

(۹) قانون وراثت،

اس نامور مصنف نے علاوہ اس کتاب کے سنسکرت کی متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ کیں، یا سنسکرت کی کتابوں سے اخذ کر کے لکھیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

سانکیا

پاتنجلی — पातञ्जली

پلس سدھانتا

براہم سدھانتا — ब्राहम सद्दान्त

برہت سنہیتا،

लाجو[۷]، مصنفہ براہمر वराहीमर

سندھانتا[۸] پر ایک کتاب جس کا نام جوامع الموجود لخواطر الہنود ہے، یہ کتاب پانچسو[۵۰۰] صفحوں میں ہے،

کھنڈکھڈکا[۹]، اس کتاب کا ترجمہ پہلے عربی میں ہوا تھا جس کو عربی کتابوں میں ارکند[؟] کہتے ہیں،

کرن[۱۰] ... رسالہ

ا... [۱۱] ... پر، جس میں بتایا ہے کہ سندھ اور ہندوستان میں صفروں کے شمار کا قاعدہ کیا ہے۔

ایک رسالہ[۱۲]، جس میں بیان کیا ہے کہ اعداد کے مدارج عربی میں باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر کیے گئے ہیں، پندرہ[۱۵] صفحوں میں ہے،

راشیکا[۱۲]، یعنی اربعۂ متناسبہ پر ایک مضمون، پندرہ[۱۵] صفحوں میں ہے،

اعداد کی ترتیب[۱۳] کے متعلق ایک رسالہ،

برھما سدھانتا[۱۴]، میں حساب کا جو طریقہ ہے، اس کا ترجمہ، چالیس[۴۰] صفحوں میں ہے،

موجودہ[۱۵] زمانہ کا تعین باعتبار ہندی تاریخ و سنہ کے، سو[۱۰۰] صفحوں میں ہے،

ایک[۱۶] رسالہ جس میں یہ تعین بتایا ہے کہ کون کون ثوابت صرف منازل قمر کے متعلق ہیں،

ان سوالات[۱۷] کے جوابات جو ہندو ہیئت دانوں نے اس سے پوچھے تھے، ایک سو بیس[۱۲۰] صفحوں میں ہے،

ان سوالوں[۱۸] کے جواب جو کشمیر سے اس کے پاس آئے،

طول عمر[۱۹] کے شمار کا ہندی طریقہ،

لاگھو جیاتکم[۲۰]، مصنفہ وراہ مہر کا ترجمہ جو ایک چھوٹی سی کتاب ولادت کے متعلق ہے،

بامیان[۲۱] کے دو بتوں کی کہانی،

نیلوفر[۲۲] کا قصہ جس میں دیوبتی اور بربھاکر کا بیان ہے،

کلپہ یارہ[۲۳] کا ترجمہ جو ایک رسالہ ہے متعلق عوارض مکررہ کے،

واسودیو[۲۵] کے دوبارہ ظہور پر ایک مضمون، नासदेव

[۲۵] ایک کتاب کا ترجمہ جو تمام محسوسات اور مدرکات پر مشتمل ہے،
[۲۶] مسادات کی تصنیف[۱] کی وجہ کے متعلق ایک رسالہ، موافق رائے برہم سدھانتا،

اخیر اخیر میں اکبر شاہ کی بدولت سنسکرت کی تصنیفات نے زیادہ تر مسلمانوں میں رواج پایا، اکبر کو ہندوؤں کی طرف جو میلان تھا وہ عام طور سے مشہور ہے، اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے قابل اور نامور پنڈتوں کو جمع کیا تھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں جہاں دانش اندوزان دولت کی فہرست دی ہے، ہندو علماء میں سے حسب ذیل نام شمار کیے ہیں،

مہادیو، بھیم ناتھ، بابا بلاس، نرائن، سیوجی، مادھو، رام بھدر، سری بھٹ، مادھو سرستی، جدروپ، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن آسرم، بلبھدر مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، دامودر بھٹ، باہن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، پرم اندر، گوپی ناتھ، بجے سین سور، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹا چارج، کاشی ناتھ،

اکبر نے اپنے اہتمام سے بہت سی کتابوں کے ترجمے کرائے، دیوی برہمن اور عبد القادر بدایونی و شیخ سلطان تھانیسری و نقیب خاں کی شرکت سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا، اکبر نے اس ترجمہ کا نام رزم نامہ رکھا، اور تمام معرکوں کی تصویریں بنوا کر اس میں شامل کیں، مذکورہ بالا فضلاء نے رامائن کا بھی ترجمہ کیا، اور اس میں بھی تصویریں بنوائی گئیں، اتھروَن وید جو چوتھا وید ہے، اس کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا، اور اس ترجمہ کا قلمی نسخہ ہمارے کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے، لیلاوتی جو فن حساب کی مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ فیضی نے کیا، تاجک جو علم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے، مکمل خان گجراتی نے اس کو فارسی قالب پہنایا، کنہیا جی کے حالات میں ہربنس ایک کتاب ہے، مولانا شیری نے اس کا ترجمہ کیا، نل اور دمن کا قصہ جو ایک پردرد ناول ہے، فیضی نے اسکو مثنوی کا لباس پہنایا،[۲]

---

[۱] بیرونی کی کتاب الآثار الباقیہ جو یورپ میں چھاپی گئی ہے، اسکے اخیر میں خود بیرونی کی لکھی ہوئی ایک فہرست شامل ہے، جس میں اس نے اپنی تمام تصنیفات کی تفصیل لکھی ہے، کتاب الہند میں بھی جا بجا اپنی تصنیفات اور ترجموں کا ذکر کیا ہے، میں نے اس مقام پر ان ترجموں کی فہرست دی ہے، انہی دونوں کتابوں سے ماخوذ ہے، [۲] ابوالفضل نے ان تمام واقعات کو آئین اکبری میں آئین تصویر خانہ کے ذیل میں لکھا ہے،

اکبر نے سنسکرت کے سرمایہ میں بھی اضافہ کیا، یعنی عربی و فارسی کی کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کرائیں چنانچہ زیچ میرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا، جس کے ترجمہ میں فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی گنگادھر مہیش، مہانند، یہ سب فضلا شریک تھے،

ہر قسم کے علوم و فنون کے متعلق سنسکرت کی تصنیفات جو فارسی اور عربی میں ترجمہ ہوئیں، ان کا اگر استقصا کیا جائے، تو ایک مستقل رسالہ لکھنا پڑے گا، اور شاید میں اس محنت کو گوارا کرتا، لیکن بڑی دقت یہ ہے کہ عربی لب و لہجہ نے ناموں میں اس قدر تغیر پیدا کر دیا ہے، کہ اکثر کتابوں اور مصنفوں کے صحیح نام دریافت نہیں ہو سکتے، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ کنکہ ہندوستان کا سب سے نامور طبیب و حکیم تھا، اور اس کی حسب ذیل تصنیفات ہیں (یعنی جو عربی میں ترجمہ کی گئیں)

کتاب النمودار فی الاعمار، اسرار الموالید، القرانات الکبیر، القرانات الصغیر، کناش، کتاب فی التوہم کتاب فی احداث العالم والدور فی القرآن، کنکہ کی جن کتابوں کا نام ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے، شبہ ہے عربی میں موجود ہیں، لیکن ہم کو خود کنکہ کا پتہ نہیں چلتا، کہ اس کا اصلی نام سنسکرت تلفظ میں کیا ہے،

علامہ مذکور نے ہندوستان کے اور حکماء کے نام لکھے ہیں، یعنی باکھر، راجیہ، سکہ، داہر، انکل، جبہر، اندی، جاری، اور لکھا ہے کہ ان حکماء کی اکثر تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں، لیکن ہم ان ناموں کی صحت نہیں کر سکتے،

طبی تصنیفات میں صحیح تلفظ کے ساتھ ہم کو صرف دو تصنیفوں کا پتہ لگتا ہے، ایک چرکا کی کتاب جو آج سے پانچ ہزار برس پہلے نہایت مشہور طبیب تھا، اور جس کو ہندو بہت بڑا رشی مانتے تھے، یہ کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ کی گئی، پھر عبداللہ بن علی نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، دوسری ششرت (सुश्रुत) کی کتاب جو دس بابوں میں ہے، اس کتاب کا ترجمہ یحییٰ بن خالد کے حکم سے کیا گیا،

ناموں کی صحت سے مایوس ہو کر ہم ایک اجمالی نقشہ مورخین عرب کی تصریحات کے موافق

اس موقع پر درج کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ ہر علم و فن کے متعلق سنسکرت کی کون کون سی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں۔[1] ان میں بیرونی وغیرہ کے وہ ترجمے داخل نہیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا۔

کیفیت	نام کتاب
اس میں چار سو چار بیماریوں کا بیان ہے،	بدان
ابن دھن نے اس کا ترجمہ کیا،	سُند ہشان
یونانی اور ہندوستانی طب میں جو اختلافات ہیں، اسکا بیان ہے،	فیما اختلف فیہ الہند والروم
دواؤں کا نام، اس کا ترجمہ، منکہ نے اسحٰق بن سلیمان کے لیے کیا تھا،	تفسیر اسماء العقاقیر
سانپوں کے اقسام اور اُن کے زہر کا بیان،	رای کی کتاب
ابن دھن نے اس کا ترجمہ کیا،	استانکر کی کتاب
	حاملہ عورتوں کا علاج
اس میں سو بیماریوں اور سو علاجوں کا بیان ہے،	تاکشتل کی کتاب
عورتوں کے علاج میں،	ردوسا کی کتاب
	کتاب السکر
تاکشتل کی تصنیف ہے،	کتاب التوہم والامراض
شاناق کی تصنیف ہے، اور زہروں کا بیان ہے، اس کتاب کا ترجمہ اول فارسی میں ابو حاتم بلخی نے منکہ کی مدد سے کیا، پھر مامون کے حکم سے عباس بن سعید نے کیا،	کتاب السموم

[1] یہ فہرست یا نقشہ کتب ذیل سے ماخوذ ہے،

طبقات الاطباء جلد دوم ص۳۲ و ص۳۳، وکتاب الفہرست ص۳۰۳ و ص۲۴۵ و ص۳۱۴ وتاریخ یعقوبی جلد اول ص۱۰۵،

نام کتاب	کیفیت
کتاب البیطرہ	جانوروں کا علاج،
کتاب فی النجوم	شاناق ہندی کی تصنیف ہے،
کتاب الموالید	جودر کی تصنیف ہے،
توفا	منطق میں ہے،
ما تفاوت فیہ فلاسفۃ الہند والروم	یونانی اور ہندوستانی فلسفہ کے اختلافات،
سندباد	سندباد کا قصہ جو الف لیلہ میں شامل ہے، دراصل سنسکرت سے ماخوذ ہے،
بوداسپ و بلوہر	

ان کتابوں کے علاوہ ابن الندیم نے اور بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں، مثلاً کتاب البد کتاب آدب الہند والصین، کتاب دیک الہندی، کتاب ساویرم، کتاب ملک الہند، کتاب الاشربہ، کتاب بیدپا وغیرہ وغیرہ لیکن مبہم اور غیر صحیح التلفظ نام لکھتے لکھتے میں عاجز آگیا ہوں،

(از رسائل شبلی)

مطبوعہ ۱۸۹۸ء

کتب خانۂ اسکندریہ

منجملہ اُن افسوسناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق کسی زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں، اور اب تک قائم ہیں، ایک یہ واقعہ بھی ہے،

اگرچہ ایک زمانۂ دراز سے یورپ کو مسلمانوں کے حالات سے واقف ہونے کے ذریعے حاصل ہیں، لیکن موجودہ علم تاریخ کی ابتدا جس دور سے شروع ہوتی ہے، وہ کروسیڈ یعنی صلیبی لڑائیاں ہیں، اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کو جس حیثیت سے جانا اور پہچانا وہ صرف یہ حیثیت تھی کہ مسلمان جنگ جو ہیں، غارتگر ہیں، وحشی ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مقدس صلیب اور عیسائیوں کے قبلہ (بیت المقدس) کے دشمن ہیں،

یہی زمانہ یورپ کے عہدِ ظلمت سے نکلنے کا بھی ہے، کیونکہ جیسا کہ اکثر مورخوں نے تصریح کی ہے یورپ کی علمی اور تمدنی ترقی کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی،

اس زمانہ میں یورپ میں مسلمانوں کے متعلق عجیب عجیب روایتیں پیدا ہوگئیں، اور واقعات موجودہ کے لحاظ سے ایسا ہونا ضرور تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے مذہب، قومیت، معاشرت، تمدن کے متعلق یورپ میں جو غلط اور بے سروپا روایتیں پیدا ہوئیں، وہ رفتہ رفتہ اس قدر شہرت پکڑ گئیں کہ ضرب المثل کے طور پر عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہوگئیں، اور جب تصنیف و تالیف کا زمانہ شروع ہوا، تو تاریخوں، حکایتوں، ناولوں بلکہ فلسفہ کی کتابوں میں بھی بکثرت ان کا استعمال ہونے لگا، بیکن جو یورپ میں فلسفۂ حال کا بانی خیال کیا جاتا ہے، اس نے مضامین کا ایک مجموعہ لکھا ہے جس کا نام (Bacons Essays) ہے، وہ ایک مضمون میں جرأت اور دلیری کی مثال میں لکھتا ہے، کہ:

"محمد ایک دن لوگوں کو اپنی نبوت کا یقین دلا رہے تھے، چنانچہ حاضرین سے کہا کہ اس پہاڑ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تجھ کو محمدؐ نے طلب کیا ہے، لوگ گئے اور یہ پیغام سنایا، پہاڑ اپنی جگہ سے کیونکر حرکت کر سکتا تھا، محمدؐ نے یہ دیکھ کر بجائے اس کے کہ شرمندہ ہوتے، نہایت اطمینان اور جرأت سے کہا کہ کچھ پرواہ نہیں، اگر پہاڑ محمدؐ کے پاس نہیں آتا تو محمد خود پہاڑ کے پاس جا سکتا ہے۔"

لیکن کوئی مورخ نہ تھا، اور نہ اپنے خیال میں یہ واقعہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر کی غرض سے لکھا ہے، بلکہ جرأت اور حوصلہ مندی کی تعریف کرتے کرتے یہ مثال پیش کی ہے، لیکن چونکہ اس زمانہ میں اس قسم کی روایتیں یورپ کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی تھیں، اس لیے عام و خاص سب بے تکلف اصول موضوعہ کے طور پر ان کو استعمال کرتے تھے، اور صحیح سمجھتے تھے،

سو ڈیڑھ سو برس سے یورپ زیادہ تحقیقات پر مائل ہوا ہے، اور اس قسم کی روایتوں کی غلطی روز بروز کھلتی جاتی ہے، یہاں تک کہ یورپ کے نامور مورخ ان روایتوں کی نسبت تسلیم کرتے جاتے ہیں، کہ وہ یورپ کے لیے شرم کی باعث ہیں، مسٹر کارلائل اپنی کتاب لکچر ان دی ہیروز میں لکھتے ہیں کہ "جو جھوٹ باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں نے اس انسان (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت قائم کی تھیں، اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں۔" کارلائل صاحب نے یہ لکچر چونکہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت لکھا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کی، ورنہ یورپ میں اس قسم کی جھوٹ باتیں عام طور پر اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق شایع تھیں، موجودہ تحقیقات نے اگرچہ ان غلطیوں کو کم کر دیا ہے، لیکن مٹا نہیں دیا ہے، کیونکہ جو واقعات اس وسعت سے تمام قوم میں پھیل گئے تھے، اُن کی تحقیق پر مائل ہونا صرف ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں کو عام اجماع اور جمہوریت کا بوجھ دبا نہیں سکتا، وقلیل ماھم،

اس کے علاوہ ایک خاص سبب یہ ہے کہ ہر قوم میں محققین کا دائرہ جمہور سے الگ ہوتا ہے، اوراگر چہ اعتبار کے قابل صرف وہ واقعات ہوتے ہیں جن کو محققین نے غور و تحقیق کے بعد تسلیم کیا ہو لیکن ان کی تحقیقات ایک خاص دائرہ تک محدود رہتی ہے، عام لوگوں میں اور عام تصنیفات میں ان کو رواج نہیں ہوتا، یورپ میں جو نامور محقق ہیں، اکثر ان بیہودہ روایتوں کو غلط تسلیم کرتے جاتے ہیں، جو اسلامی واقعات کے متعلق وہاں پیدا ہو گئی تھیں، چنانچہ گبن، کارلائل، گاڈ فری ہگنز، باسورتھ، رینان، سیدیو وغیرہ نے عموماً ان واقعات سے صاف انکار کیا ہے لیکن عام تصنیفات اور عام روایتوں میں ان غلطیوں کا زور اب بھی کم نہیں ہوا،

اسی قسم کے واقعات میں اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے،

اس واقعہ کو یورپ نے جس بلند آہنگی سے مشہور کیا ہے۔ حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے، تاریخیں، ناولیں، حکایتیں، مثلیں، افسانے، قصہ طلب حوالے، روزمرہ کے محاورے، ایک چیز بھی اس صدا سے خالی نہیں، ادب اور لٹریچر کا تو کیا ذکر ہے، منطق و فلسفہ بھی اس کے اثر سے محروم نہ رہے، ایک سال[1] کلکتہ یونیورسٹی کے سوالات امتحان (ایف اے پرچہ علم منطق) میں یہ سوال تھا، کہ ذیل کے مغالطہ کو حل کرو "یعنی کتابیں اگر قرآن کے موافق ہیں تو ان کی کوئی ضرورت نہیں، اور مخالف ہیں تو ان کو برباد کر دینا چاہیئے "

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے، کہ یورپ کو کتب خانۂ اسکندریہ کے ساتھ اس قدر ہمدردی کیوں ہے؟ یہ مسلّم ہے کہ جس کتب خانہ کی نسبت بحث ہے، عیسائیوں سے اس کو کچھ واسطہ نہیں، اس کو بادشاہان مصر نے قائم کیا تھا، جو بت پرست تھے، اور حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے تھے، شاید یہ کہا جائے کہ یورپ کی عام قدردانی اور ہمدردی کا اثر ہے، لیکن اس حالت میں اسکندریہ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ انہی ممالک میں اور بھی بہت بڑے بڑے کتب خانے برباد ہوئے، ان پر یورپ میں یہ شور و غل کہاں ہوا؟ اسکندر نے ایران کے کتب خانے جو برباد کیے، ان کی

[1] یعنی ۱۸۸۴ء

تشہیر کس نے کی ؟ اسپین میں خود عیسائیوں نے مسلمانوں کی تمام علمی یادگاروں کو مٹا دیا، اور کئی لاکھ کتابیں برباد کر دیں، کس نے اس کا ماتم کیا؟ پھر کتبخانۂ اسکندریہ کے ساتھ یہ خاص ہمدردی کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے (جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے) کہ اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے برباد کیا تھا، اور بڑے بڑے پیشوایان مذہب اس کی بربادی میں شریک تھے، اس وقت تو یہ امر فخر کا باعث تھا، لیکن جب کسی قدر تہذیب و شائستگی کا زمانہ آیا تو یورپ نے دیکھا کہ اس کے دامن پر یہ بہت بڑا بدنما داغ ہے، اس کے مٹانے کی اس کے سوائے اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ یہ الزام کسی دوسری قوم کے سر منڈھا جائے، مسلمانوں نے جب مصر و اسکندریہ فتح کیا تو کتب خانۂ مذکور کا وہاں نام و نشان نہ تھا، متعصب عیسائیوں نے اس گمشدگی کو فاتحان اسلام کی طرف منسوب کر دیا، اور چونکہ اس زمانہ میں تمام یورپ تعصب سے لبریز تھا، اور کسی قسم کی علمی ترقی کا اثر نہ تھا، اس لیے کسی نے غور و تحقیق کی پرواہ نہ کی، اور نہایت تیزی سے یہ روایت تمام یورپ میں پھیل گئی، یورپ نے اس ہمدردی سے اس واقعہ کا ماتم کیا، کہ گویا وہ انہی کا خاص کتب خانہ تھا، چنانچہ عوام کا آج تک یہی خیال ہے، اس عام شہرت نے یہ بڑا فائدہ دیا کہ عیسائیوں کی طرف اس الزام کے منسوب کرنیکا کسی کو خیال بھی نہ آیا کیونکہ ظاہراً یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی قوم اپنا سرمایہ آپ نہیں برباد کر سکتی،

اب اس فرضی واقعہ کو جس کی صدا سے کسی زمانہ میں تمام یورپ گونج اٹھا تھا، تحقیق کر کے اسکی اصل کیا ہے؟ افسوس کچھ بھی نہیں!!! لیکن یہاں ایک سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرضی واقعہ کا اتنی مدت تک تمام ممالک یورپ میں اس طرح مشہور و مسلّم رہنا کیونکر ممکن ہے؟ یہ سوال بظاہر مشکل ہے، لیکن اس کا جواب بہت آسان ہے، یورپ کے عہد ظلمت تک تو اس شہرت پر کچھ تعجب نہیں، اس وقت ایسی اور بھی سیکڑوں بیہودہ روایتیں شایع تھیں، اور عموماً تسلیم کی جاتی تھیں، جیسا کہ ہم اس مضمون کے شروع میں لکھ آئے ہیں، تہذیب و ترقی کے زمانہ سے اس پر بحثیں شروع ہوئیں، اور بڑے بڑے نامور مصنفین نے اس کی صحت سے انکار کیا، البتہ یہ تعجب ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اس کی صحت کے قائل ہیں۔ حالانکہ اس کے بطلان کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا،

لیکن اس کی دو وجہیں ہیں، اول تو یہ کہ تہذیب و ترقی کے زمانہ میں بھی جاہلیت کے آثار بالکل فنا نہیں ہو جاتے، ورنہ ایسا ہونا ممکن ہے، دوسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے متعلق یورپ کا جو طرز بحث ہے، وہ اکثر کسی پہلو کا قطعی فیصلہ نہیں ہونے دیتا، اصل روایت کو چھوڑ کر درایت و قیاسات پر بحثیں شروع ہو جاتی ہیں، اور بہت سی فروعی باتیں بحث طلب قرار پا جاتی ہیں، رفتہ رفتہ ایک بڑا سلسلہ تیار ہو جاتا ہے، اور اصل بحث غیر مفصل رہ جاتی ہے، اس مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہوا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے،

یورپ میں ایک مدت سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے، اور اکثر مصنفوں نے اس کے متعلق مستقل مضامین لکھے، مسلمانوں سے متعلق جو عام تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی اکثر اس کا ذکر آجاتا ہے، اور مصنفین اس روایت کے نقل کرنے کے بعد اپنی خاص رائے (موافق یا مخالف) بیان کرتے ہیں، اس قسم کی جس قدر تحریریں ہماری نظر سے گذریں، اجمالاً ان کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، کیونکہ ہمارے مضمون میں اکثر جا بجا ان کے حوالے آئیں گے، اسی لحاظ سے ہم ان کتابوں کے مقامات بقید صفحہ و اڈیشن لکھتے ہیں،

سب سے پہلے مسٹر گبن نے جو ۱۷۹۴ء میں فوت ہوا، اس واقعہ سے انکار کیا، اور اپنی تاریخ رومن امپائر حصہ مسلمانان فتح اسکندریہ کے بیان میں اس کے متعلق مختصر مگر محققانہ ریمارک کیا، پروفیسر وائٹ نے اس کے ثبوت میں ایک مستقل آرٹیکل لکھا (دیکھو)

Aegyptiuca or Observation certain antiquities of Egypt by J.White D.D.Professor of Arabic in the University of Oxford 1801

Successors of Mohammad by Washington Irving E 113 Printed by Sall & Sons, London

The Saracens Second Edition Page 254

Story of Nation Series Edited 1889

History of Arabic Ancient and Modern Vol.I Page 393 by

Andrew Cricbten

History of the Conflict between Religion and Science 20th

Edition London 1887 page 104 & 103 by Draper M.D.

Professor New York College America

اسپکٹیٹر جو لندن کا مشہور اخبار ہے، اس میں متعدد مباحثے اس کے متعلق شائع ہوئے، جن میں سے بعض موافق تھے اور بعض مخالف۔

(دیکھو اسپکٹیٹر پرچہائے ۱۰ر جون ۱۸۹۸ء اور ۲۳ر جون ۱۸۹۸ء)

برٹش انسائیکلوپیڈیا ذکر اسکندریہ۔

میو سیدیو نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے، اور جس نے اسلام کی نہایت جامع اور مفید تاریخ لکھی ہے، اس پر مورخانہ نکتہ چینی کی، (دیکھو)

Histoire Generale Des Arabes Par L.A.Seddillot Tsm

Paris 1877 P.155

پروفیسر ڈیساسی فرانس کے مشہور عربی دان نے اس واقعہ کے متعلق مفصل بحث لکھی، دیکھو پروفیسر ڈیساسی (Desacy) کا ترجمہ و نوٹ کتاب عبداللطیف بغدادی مطبوعہ پیرس ۱۸۱۰ء، ص ۲۴۰۔

سب سے زیادہ جامع اور مفصل وہ آرٹیکل ہے، جو مسٹر کریل جرمنی نے اورینٹل کانفرنس میں پیش کیا، یورپ میں دس پندرہ برس سے ایک کانگریس قائم ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ کے متعلق نادر اور مفید تحقیقات بہم پہنچائے، اس کانگریس کا چوتھا اجلاس ستمبر ۱۸۷۸ء میں بمقام فلارنس

منعقد ہوا تھا، اس کے ایک اجلاس میں مسٹر کریل نے جو جرمنی کے مشہور عربی داں عالم ہیں، اس بحث پر جرمن زبان میں ایک رسالہ پیش کیا، جو کانگریس کی رپورٹ کے ساتھ شایع ہوا ہے، چنانچہ اس رسالہ کا ترجمہ بعینہٖ اس مضمون کے اخیر میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے،

اس مقام پر مجھ کو یہ بھی ظاہر کر دینا ضرور ہے، کہ مسٹر کریل کے مضمون کا ترجمہ میری درخواست کے موافق میرے معزز دوست، نہیں بلکہ میرے مخدوم شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی جیا جو لسٹ بی، اے، ایل انسپکٹر جنرل معدنیات حیدر آباد دکن نے کیا ہے، جو واقفیت السنۂ مختلفہ کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کے فارابی و کندی ہیں، فرنچ تصنیفات کے متعلق مجھ کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے، کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی فرنچ سیکھ لی ہے، اور اس لیے ان سے متمتع ہونا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا،

مقدم اور ضروری بحث

اس روایت کے متعلق سب سے مقدم اور ضروری بحث یہ ہے کہ اس کا اصلی مخرج یورپین تاریخیں ہیں، یا عربی تاریخیں؟ یہ سوال اگرچہ نہایت ضروری سوال ہے، لیکن کچھ مطلب نہیں کیونکہ مخالف و موافق دونوں نے اس سوال کا یکساں جواب دیا ہے، یورپ کے عام مورخین موافق ہوں یا مخالف، اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس اس روایت کا کوئی مخرج نہیں ہے، اور وہ اس مرحلہ میں صرف عربی تاریخوں کے دست نگر ہیں، لیکن اس بات کے ثابت کرنے سے پہلے ہم بتانا چاہتے ہیں، کہ یورپ میں یہ قصہ کیونکر مشہور ہوا، اور کس ذریعہ سے،

یورپ میں اول اول اس واقعہ کو ابوالفرج نے مشہور کیا

سب سے پہلے جس نے یورپ میں اس واقعہ کو مشہور کیا، وہ ابوالفرج ہے، اس کی مختصر سی لائف یہ ہے کہ وہ ایک یہودی طبیب ہارون نامی کا بیٹا تھا، اور شہر ملیٹن میں ۱۲۲۶ء میں پیدا ہوا، چونکہ اس کا باپ ترک مذہب کرکے عیسائی ہو چکا تھا، اس لیے ابوالفرج نے شروع ہی سے عیسائی مذہب کی تعلیم پائی، اس نے اپنے مذہبی علوم کے علاوہ عربی و سریانی زبان میں نہایت کمال پیدا کیا، اور اپنی لیاقت کی وجہ سے اکیس ہی سال کی عمر میں گویا کا بشپ مقرر ہوا، اور رفتہ رفتہ مافریان کے درجہ تک ترقی کی، جس کے بعد صرف بطریق یعنی پٹریارک کا رتبہ باقی رہ جاتا ہے، ابوالفرج نے سریانی زبان میں ایک نہایت بسیط تاریخ لکھی، جس کا ماخذ سریانی، عربی، فارسی اور یونانی کتابیں تھیں، اس بڑی کتاب کا اس نے عربی زبان

ابوالفرج کی مختصر لائف

یہ ایک خلاصہ لکھا، جس کا نام مختصر الدول ہے، اور جس کو ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے ۱۶۶۲ء میں لاطن ترجمہ کے ساتھ چھاپا۔ اس خلاصہ کے مختلف نسخے ہیں، اور سب ناکمل ہیں، اور بعض واقعات اصل سریانی کتاب سے زائد ہیں، یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ زائد واقعات خود ابوالفرج نے بڑھائے یا کسی اور نے الحاق کیے،

یہی خلاصہ ہے جس میں سب سے اول اسکندریہ کے کتب خانہ جلائے جانے کے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کے لاطن ترجمہ کے ذریعہ سے تمام یورپ میں یہ روایت پہنچی،

مسٹر گبن اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ جب ابوالفرج کی تاریخ لاطن میں ترجمہ ہو کر دنیا میں شایع ہوئی، یہ قصہ بار بار منقول ہوا۔ دانشگلی اور ڈاکٹر نقرگلین ایم اے و مسٹر کریچن اور بہت سے یورپین مصنفین نے صاف تصریح کی ہے کہ یورپ میں یہ روایت ابوالفرج کے ذریعہ سے پہنچی،

یہ زمانہ یورپ کے نہایت تعصب اور جہالت کا زمانہ تھا، اور اسی لیے وہاں مسلمانوں کے متعلق تمام اس قسم کی روایتیں بے درایت فوراً قبول کر لی جاتی تھیں، جن سے مسلمانوں کی نسبت نفرت انگیز خیالات پیدا ہوں، غرض یورپ کے ہر حصہ میں یہ واقعہ مشہور ہو گیا، اور نہایت تیزی سے وہ یورپین لٹریچر کا عنصر بن گیا، اس واقعہ کو جس عبارت میں ابوالفرج نے لکھا ہے[1] اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے،

ابوالفرج کی اصل عبارت کا ترجمہ

"اور اس زمانہ میں عربوں میں یحیٰ نحوی جو ہماری زبان میں غراماطیقوس کے لقب سے ملقب ہے مشہور ہوا، وہ اسکندریہ کا رہنے والا تھا، اور یعقوبی عیسائیوں کا عقیدہ رکھتا تھا، اور ساویری کے عقیدہ کی تائید کرتا تھا، پھر عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے منکر ہوا، اس پر مصر میں تمام پادری جمع ہوئے، اور اس سے درخواست کی کہ اس عقیدہ سے باز آئے، اس نے نہ مانا، اس پر پادریوں نے اس کا رتبہ گھٹا دیا، وہ بہت دنوں تک زندہ رہا، یہاں تک کہ حضرت عمروؓ بن العاص نے اسکندریہ کو فتح کیا، وہ حضرت عمروؓ کے پاس حاضر ہوا، (حضرت) عمروؓ اس کی لیاقت سے واقف ہو چکا تھا، اس

[1] دیکھو تاریخ مختصر الدول مصنفہ ابوالفرج مطبوعہ لندن ۱۶۶۳ء ص ۱۸۰، ۱۸۱،

لیے اس نے اس کی بہت عزت کی، اور اس سے وہ فلسفیانہ بحثیں سنیں جس سے اہل عرب کبھی آشنا نہ تھے، حضرت عمروؓ کے دل پر ان بحثوں نے بہت اثر کیا، اور وہ اس پر فریفتہ ہو گیا، حضرت عمروؓ عاقل، خوش فہم، صحیح الفکر شخص تھا، اسی لیے اس نے یحییٰ کی صحبت کو لازم پکڑ لیا، اور اس کو اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا،

ایک دن یحییٰ نے حضرت عمروؓ سے کہا کہ اسکندریہ کی تمام قسم کی چیزوں پر آپ قابض ہیں، جو جو چیزیں کہ آپ کے کام کی ہیں، میں ان سے تعرض کرنا نہیں چاہتا، لیکن جو چیزیں آپ کے کام کی نہیں اس کے تو ہمیں لوگ زیادہ مستحق ہیں، حضرت عمروؓ نے کہا، تم کو کیا درکار ہے، یحییٰ نے کہا فلسفہ کی وہ کتابیں جو شاہی کتب خانوں میں ہیں، حضرت عمروؓ نے کہا اس امر کی نسبت میں امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کی اجازت کے بغیر کوئی حکم نہیں دے سکتا حضرت عمروؓ نے یحییٰ کی درخواست کی اطلاع حضرت عمر بن الخطابؓ کو دی، وہاں سے جواب آیا کہ جن کتابوں کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر وہ خدا کی کتاب کے موافق ہیں، تو خدا کی کتاب کے ہوتے ان کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر ان کے مضامین خدا کی کتاب کے مخالف ہیں، تو تم ان کو برباد کرنا شروع کرو" حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان کتابوں کو اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کرنا اور اُن کو جلوانا شروع کیا، پس وہ چھ مہینے کی مدت میں جل کر تمام ہوئیں، سو جو کچھ ہوا، اس کو سنو اور تعجب کرو،

سب سے پہلے گبن نے اس واقعہ سے انکار کیا

یہ واقعہ اسی طرح برابر تسلیم ہوتا آتا تھا، اور کسی کو اس کی نسبت تحقیق و تفتیش کا خیال تک نہ آیا، سب سے پہلے مورخ گبن نے جو تاریخ کے طرز خاص کا بانی ہے، اس واقعہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھا، اور کہا کہ "میں اس واقعہ کی اصلیت اور اس کے نتائج دونوں کے انکار کی طرف مائل ہوں، گبن نے اپنے انکار کی مختلف وجہیں قائم کیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ابو الفرج واقعہ مبحوث فیہ کے پانچسو برس بعد پیدا ہوا، اور اس کے سوا اور کسی مورخ حتیٰ کہ خود عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا، اس لیے ابو الفرج کی شہادت کیونکر معتبر

ہوسکتی ہے، گبن کے اس انکار کے بعد یورپ خواب غفلت سے نکلا، اور متعدد علماء اس کی تحقیق میں مصروف ہوئے) اگرچہ گبن کے بعد اس واقعہ کے متعلق دو فریق موافق و مخالف قائم ہو گئے، لیکن اس قدر عموماً مسلم تھا کہ پہلی صدی ہجری میں اسلام کے متعلق یورپ میں کوئی تصنیف نہیں لکھی گئی، اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے حالات میں آج تک یورپ میں جس قدر تاریخیں لکھی گئیں، یا لکھی جا رہی ہیں، عموماً اسلامی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، اس لیے خود اس فریق کو بھی جو اس واقعہ کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے، عربی ہی تاریخوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

یورپ اس واقعہ کی روایت صرف عربی تاریخوں سے ماخوذ بتاتے ہیں

مسٹر کرچین جنہوں نے گبن کے انکار پر بہت غصہ ظاہر کیا، اپنی کتاب تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں، "اگر یہ واقعہ صرف اس اجنبی شخص (ابوالفرج) کے بیان پر جس نے چھ سو برس کے بعد اس واقعہ کو تحریر کیا، مبنی ہوتا تو ہم کو آرمینیا کے مورخ (ابوالفرج) کے بیان کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا، لیکن یہ واقعہ صرف اس کی سند پر مبنی نہیں ہے، بلکہ برخلاف اس کے مقریزی اور عبداللطیف نے جنہوں نے مصر کی تاریخ قدیم پر تصنیفات لکھی ہیں، اس واقعہ کو بیان کیا ہے، مسٹر کریل نے نہایت انصاف کے ساتھ اعلانیہ اس کا اعتراف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ واقعہ پہلے پہل عبداللطیف کی تاریخ میں جو اس واقعہ کے پانسو برس بعد پیدا ہوا مذکور ہے۔"

اس امر کے طے ہو جانے کے بعد کہ اس واقعہ کا ماخذ جو کچھ ہے، صرف عربی تاریخیں ہیں، ہم کو اس بحث کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہے، کیونکہ عرب کی تصنیفات سے واقف ہو جانے کا استحقاق یورپ کی بہ نسبت ہم کو زیادہ ہے، وصاحب البیت ادری بما فیہ "گھر کا حال گھر کا آدمی خوب جانتا ہے۔"

یورپین مصنفین جنھوں نے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے، سند میں عبداللطیف بغدادی، مقریزی، حاجی خلیفہ کا نام لیا ہے، اور کہا ہے کہ "یہ مورخین نہایت معتبر ہیں، اور ان کی شہادت

سے انکار نہیں کیا جا سکتا" میں نے جہاں تک دیکھا اور پڑھا یورپ نے ہمیشہ انہی مورخین کا نام لیا ہے، ایک ناواقف انگریز نے ابن خلدون کا بھی حوالہ دیا ہے، اور جھوٹ سے شرم نہ کر کے لکھا ہے کہ "ابن خلدون نے حضرت عمرؓ کے حالات میں یہ روایت بیان کی ہے" لیکن ابن خلدون کی تاریخ ایک عام اور مشہور کتاب ہے حضرت عمرؓ کی تمام تاریخ میں اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں، غرض ابن خلدون کے علٰحدہ کرنے کے بعد صرف تین مذکورۂ بالا مصنفین پر اس روایت کا مدار رہ جاتا ہے،

اب ہم مورخانہ اصول سے اس روایت کی تحقیق پر متوجہ ہوتے ہیں، جس کے ذیل میں ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ یورپین مورخین نے ان مصنفوں سے استناد کرنے میں کس قدر تدلیس اور فریب سے کام لیا ہے،

واقعات تاریخی کے ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں، روایت، درایت،

روایت سے یہ مطلب ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، اس کی سند اس شخص تک پہنچائی جائے جو خود اس واقعہ میں موجود رہا ہو، عرب کی تمام مستند تاریخیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں اخبرنا وحدثنا کے ذریعہ سے سند کا تمام سلسلہ مذکور کیا جاتا ہے، اور ان تمام راویوں کا نام لیا جاتا ہے، جن کے ذریعہ سے واقعہ کی سند اس شخص تک پہنچتی ہے، جو خود اس واقعہ میں شریک تھا، چوتھی صدی تک اسلامی تاریخوں کا یہی طرز رہا، اور گو زمانۂ مابعد میں اس کا رواج کم ہو چلا لیکن گذشتہ تین صدیوں کے واقعات میں اب تک اس کا لحاظ ہے، یعنی اس زمانہ کے انہی واقعات کا اعتبار کیا جاتا ہے، جو سلسلۂ سند کے ساتھ ثابت ہوں،

درایت سے یہ غرض ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، اس پر اس لحاظ سے غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتوں، منسوب الیہ کے حالات اور اس قسم کے اور قرائن کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، اگر وہ واقعہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت مشتبہ ہوگی یعنی احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے،

اس واقعہ کی تحقیق میں بھی ہم کو انہی دو اصول سے کام لینا چاہیے،

اس واقعہ کی تحقیق اصول روایت کے لحاظ سے

چونکہ اس بحث میں مقدمہ کے دو فریقوں میں سے ایک نافی اور دوسرا مثبت ہے، اور چونکہ

اس قسم کے مقدمات میں بار ثبوت ہمیشہ اس فریق پر ہوتا ہے جو ثبوت کا مدعی ہے، اس لیے اول ہم کو ان شہادتوں پر غور کرنا چاہیے جو واقعہ کے اثبات میں پیش کی جاتی ہیں، ہم کو جہاں تک معلوم ہے (اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص اس بحث میں اس سے زیادہ ثابت نہیں کرسکتا) یورپ کے تمام مصنفین جو اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کی دلیل روایت کی حیثیت سے صرف اس قدر ہے کہ "اس واقعہ کو عبد اللطیف بغدادی، مقریزی، حاجی خلیفہ نے بیان کیا ہے" اب امور تنقیح طلب یہ ہیں کہ کیا ان مصنفوں نے اس واقعہ کے متعلق ایسا کوئی بیان کیا ہے جو شہادت میں پیش ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس واقعہ کے متعلق ان کی شہادت کافی ہے؟

یورپ کے مورخین نے جو اس واقعہ کے مدعی ہیں فریب آمیز طور پر بار بار عبد اللطیف، مقریزی، حاجی خلیفہ کا نام لیا ہے، اور جن کو انکار ہے وہ ان مصنفوں کی شہادت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، اور اس طریق بحث نے ان یورپین مورخوں کی فریب آمیزی پر پردہ ڈال رکھا ہے، کیونکہ بحث اس پر محدود ہو گئی کہ عبد اللطیف وغیرہ قابل سند ہیں یا نہیں، حالانکہ پہلے یہ تحقیق ضروری تھی کہ عبد اللطیف وغیرہ نے کوئی شہادت بھی دی ہے یا نہیں۔

پہلی ضروری بحث یہ ہے کہ کیا ان تینوں مصنفوں کا بیان (جن کا بار بار نام لیا جاتا ہے) تین جداگانہ شہادتیں ہیں؟ مقریزی کی تاریخ مطبوعۂ مصر ہمارے پیش نظر ہے، اس نے جلد اول صفحہ ۱۵۹ میں عمود السواری کے بیان میں جو اسکندریہ کا ایک مشہور منارہ ہے، عمود السواری کے نام سے عنوان قائم کیا ہے، اور حرف بحرف وہ عبارت نقل کر دی ہے، جو اس مینار کے ذکر میں عبد اللطیف نے لکھی تھی، عبد اللطیف کی تحریر میں محض ضمنی طور پر اسکندریہ کے کتب خانہ کا ذکر آ گیا تھا، چونکہ مقریزی نے حرف بحرف عبد اللطیف کی عبارت نقل کی ہے، اس لیے کتب خانہ کے متعلق جو عبارت تھی وہ بھی اسی طرح منقول ہو گئی ہے، اس بنا پر موسیو لانگل نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے مجبورانہ تسلیم کیا ہے، کہ مقریزی کا بیان کوئی مستقل شہادت نہیں، بلکہ صرف عبد اللطیف کے فقرے کی نقل ہے۔[1]

---

[1] دیکھو پروفیسر ڈساسی کا نوٹ ترجمہ تاریخ عبد اللطیف بغدادی صفحہ ۲۴۴ مطبوعۂ پیرس ۱۸۱۰ء۔

موسیو لانگل کتب خانہ اسکندریہ کی بحث میں ہمارے مخالف ہیں۔ لیکن ان کو مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہی جن یوربین مورخوں نے مقریزی کی اصل کتاب نہیں دیکھی، وہ ایمان بالغیب کے طور پر بار بار مقریزی کا نام لیتے ہیں، لیکن موسیو لانگل ایسا نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ اس نے مقریزی کی کتاب کو خود پڑھا تھا مقریزی نے اسی کتاب میں اسکندریہ کی فتح کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن کتب خانہ کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعہ مذکورہ کو تاریخی واقعات کی فہرست میں شمار نہیں کرتا۔

مقریزی کے خارج ہونے کے بعد دو نام رہ جاتے ہیں، عبداللطیف اور حاجی خلیفہ۔ حاجی خلیفہ کا ذکر اگرچہ اکثر یوربین مورخوں نے کیا ہے، لیکن اس کی خاص عبارت کا حوالہ نہیں دیا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا دعویٰ غالباً کمزور ہو جاتا، ہم پروفیسر ڈ ساسی کے (جو ایک مشہور فرنچ مصنف ہیں، اور بڑے زور و شور سے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں) ممنون ہیں جنہوں نے اس راز کو ظاہر کر دیا ہے، اور حاجی خلیفہ کی عبارت نقل کر دی ہے جس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

وکانت العرب فی صدر الاسلام	اہل عرب شروع اسلام میں تمام علوم میں
لا تعتنی بشیء من العلوم الا بلغتها	سے بجز لغت و احکام شریعت وطب کے
ومعرفة احکام شریعتها وصناعة	کسی علم کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، مرقہ
الطب فانها کانت موجودة عند	علوم بوجہ عام حاجت کے بعض لوگوں کے پاس
افراد منهم لحاجة الناس طرا الیها	موجود تھے، اور اسکا یہ سبب تھا کہ چونکہ اسلام
وذلک منهم صونا لقواعد الاسلام	کے قواعد اور لوگوں کے عقائد مضبوط اور
وعقائد اهله عن تطرق الخلل من	راسخ نہیں ہو چکے تھے، اسلیے ڈر تھا کہ قدما
علوم الاوائل قبل الرسوخ والاحکام	کے علوم سے ان میں خلل نہ پیدا ہو جائے، یہانتک کہ بیان
حتی یروی انهم احرقوا ما وجدوا من	کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شہروں کے فتوحات
الکتب فی فتوحات البلاد،	میں جو کتابیں پائیں وہ جلا دیں،

اس عبارت میں اسکندریہ کا تو ذکر تک نہیں، عام طور پر کتابوں کے جلانے کا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی یردی کے لفظ سے جو ظاہر کرتا ہو کہ وہ ایک عامیانہ روایت ہے، اس عبارت کے طرز اور نظام سے ہرگز نہیں پایا جاتا کہ مصنف اس واقعہ کو واقعہ مسلمہ قرار دیتا ہے، حاجی خلیفہ شروع زمانۂ اسلام کی عدم اعتنا کا ذکر بیان کرتا ہے، اور اس کے ذیل میں ایک عامیانہ روایت کو اسی عامیانہ حیثیت سے ذکر کر جاتا ہے، اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جس طرح کوئی کہے کہ نپولین نے مصر میں اسلامی افسری کا دعویٰ کرنا چاہا، اور اس کیلئے بڑے جال پھیلائے، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ "اس نے جامع ازہر میں کلمۂ توحید پڑھا، اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھی" یہ طرز بیان کا ایک عام طریقہ ہے، کہ ایسے موقعوں پر ایک مقرر یا مضمون نگار ضعیف سے ضعیف روایت کا بھی ذکر کر جاتا ہے، غرض خاص کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا دعویٰ حاجی خلیفہ کی طرف منسوب کرنا ایسی تعجب انگیز جرأت ہے جو یورپین مورخوں کے سوا اور کسی سے نہیں ہو سکتی،

اب صرف عبد اللطیف بغدادی کی شہادت باقی رہ گئی، اور درحقیقت یورپین مورخوں کا اخیر سہارا یہی عبد اللطیف ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اللطیف نے مصر کی ایک تاریخ لکھی ہے جس کا نام "کتاب الافادة والاعتبار فی المشاهدة والحوادث المعائنة بارض مصر" ہے، یہ کتاب اس نے ۱۰ رشعبان ۶۰۳ھ میں تمام کی، اور اس کا موضوع صرف وہ حالات و واقعات ہیں جو عبد اللطیف نے خود مصر میں مشاہدہ کیے، اس میں ایک موقع پر عمود السواری کے لفظ سے ایک عنوان قائم کیا ہے، اس کے تمام حالات بیان کیے ہیں، اور لکھا ہے کہ اس ستون کے گرد چار سو اور چھوٹے چھوٹے ستون تھے، یہ حالات لکھتے لکھتے اخیر میں ضمناً یہ عبارت لکھی ہے،

ویذکر ان هذا العمود من جملة[1]	اور کہا جاتا ہے کہ یہ ستون منجملہ ان ستونوں
اعمدة کانت تحمل رواق ارسطاطالیس	کے ہے، جس پر وہ چھت قائم تھی جو ارسطو کا

[1] ایک نسخہ میں جو مصر میں چھپا ہے، اور نہایت غلط چھپا ہے بجائے یذکر کے اری کا لفظ ہے اگر یہی نسخہ صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ عبد اللطیف کی ذاتی رائے ہوگی۔

الذی کان یدرس به الحکمة	رواق تھا، اور جہاں ارسطو حکمت کا درس
وان کان دارا علم و فیه خزانة	دیا کرتا تھا، اور یہ کہ وہ دار العلم تھا، اور اس
کتب حرقھا عمرو بن العاص رضی	میں وہ کتب خانہ تھا جسکو عمرو بن العاص رضی نے
باشارة عمر رضی بن الخطاب	عمر رضی بن الخطاب کے اشارے سے جلا دیا،

اس عبارت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عبد اللطیف نے اس واقعہ کو کس حیثیت سے ذکر کیا ہے، عبد اللطیف کا یہ تمام قول بذکر کے تحت میں ہے، جس سے کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوسکتا کہ وہ اس موقع کو مورخانہ حیثیت سے لکھتا ہے، یا اس کو تسلیم کرتا ہے، مسٹر کریل جرمن اپنے مضمون میں عبد اللطیف کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں، " یہ بیان محض علی سبیل التذکرہ معلوم ہوتا ہے، اور اس سے خاص کوئی غرض نہیں معلوم ہوتی، یہ کسی خاص اصل واقعہ کو یاد دلانا نہیں ہے، بلکہ محض ایک مشہور بات کا اعادہ کردینا ہے، جس کو اس زمانہ کے سیاحوں نے بار بار کہا ہے، اور یہ من قبیل اسی قسم کی غیر معتبر اور خلاف عقل بیانات کے ہے، جو زمانۂ وسطیٰ کے سیاحوں میں بیت المقدس کے مقام کے بارہ میں مشہور تھے"

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ عبد اللطیف نے چونکہ بازاری گپوں کا ذکر کیا، اس لیے اس جملہ میں جتنے واقعات بیان کیے، اتفاق سے سب غلط تھے، نہ یہ مقام ارسطو کا رواق تھا، نہ ارسطو نے کبھی وہاں درس دیا، ایک مضمون نگار نے جس نے اسپکیٹر مورخہ ۱۳ جون میں اس مضمون پر ایک بحث لکھی ہے، عبد اللطیف کے بیان کی غلطی پر عجیب لطف سے استدلال کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ کتب خانہ کا جلایا جانا تو ایک طرف، عبد اللطیف نے اس کے ساتھ اور جو واقعات بیان کیے وہ کون سے سچ ہیں!!!

یورپین مورخوں کی تدلیس اور فریب دہی

یہ ہے حقیقت، ان سندوں اور روایتوں کی جن پر یورپین مورخوں نے چھاؤنی چھا رکھی ہے، ان مصنفوں نے اس بحث میں جس قسم کی تدلیس سے کام لیا ہے، حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے، عبد اللطیف وغیرہ کی جو اصل عبارتیں ہم نے نقل کی ہیں، ان سے ناظرین کو معلوم ہوسکتا ہے کہ

مقریزی نے خود اس واقعہ کو نہیں بیان کیا، بلکہ عمود السواری کے ذکر میں عبد اللطیف کی عبارت نقل کر دی ہے، جس میں ضمناً کتب خانہ کا بھی ذکر تھا، حاجی خلیفہ نے اسکندریہ کا نام تک نہیں لیا، البتہ عام طور پر کتب خانوں کا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی یذکر کے تحت میں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی مصدقہ روایت نہیں، لیکن یورپین مورخوں نے عبد اللطیف وغیرہ کا نام ہمیشہ اس حیثیت سے لیا ہے کہ گویا انہوں نے اس واقعہ کی صحت کا دعویٰ کیا ہے، اور اس پر کوئی مستقل مضمون لکھا ہے،

پروفیسر ڈیسایسی نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ جو اعتراضات ابوالفرج کے بیان پر کیے جاتے ہیں، ان میں یہ نہایت قوی اعتراض خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے مورخ ایک ایسے عظیم واقعہ کے متعلق خاموش ہیں" اس کے بعد پروفیسر ڈساسی اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ" لیکن اس اعتراض کا زور یقیناً عبد اللطیف اور مقریزی کی شہادت کے بعد گھٹ جاتا ہے" لطف یہ ہے کہ اسی عبارت کے بعد پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ اگرچہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ مقریزی کا قول صرف عبد اللطیف کے فقرہ کی نقل ہے"

مسٹر کریچٹن لکھتے ہیں کہ" یہ واقعہ صرف سند مذکورہ بالا (یعنی ابوالفرج کا بیان) پر مبنی نہیں ہے، بلکہ برخلاف اس کے مقریزی اور عبد اللطیف نے جنہوں نے قدیم تاریخ مصر پر تصنیفات لکھیں، اس واقعہ کا بیان کیا ہے"

پروفیسر وائٹ نہایت بلند آہنگی سے فرماتے ہیں کہ" ہم گبن کی منفیانہ دلیل کے مقابلہ میں دو عربی مورخوں کی اثباتی شہادت پیش کرنے کی جرأت کریں گے، جو ایسے مستند مصنف ہیں کہ ان کے مستند ہونے کی نسبت کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اور دونوں مذہب اسلام کے نہایت متعصب پیرو ہیں، اس سے عبد اللطیف و مقریزی کو مراد لیتا ہوں، جو اس واقعہ یعنی کتب خانہ کے جلانے کے ذکر ہی میں ہم زبان نہیں ہیں، بلکہ ٹھیک اس مقام کا نشان دیتے ہیں، جہاں کتب خانہ مذکور قائم تھا" پروفیسر وائٹ نے اس موقع پر کس چالاکی سے کام لیا ہے، عبد اللطیف نے ایک ستون کے ذکر میں ضمناً افواہی طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، پروفیسر وائٹ اس کو اصلی قالب میں ڈھالتے ہیں،

جس سے ایک ناواقف شخص کو یہ گمان ہوگا کہ عبداللطیف نے مستقل طور پر اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے، اور صرف اصل واقعہ کو ثابت نہیں کیا بلکہ واقعہ کا موقع و محل بھی متعین کر دیا ہے۔

اگرچہ یورپ کے اکثر مورخوں نے جو اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، صرف انہی تینوں یعنی عبداللطیف، مقریزی، حاجی خلیفہ پر استناد کا مدار رکھا ہے، اور ہم نے اس موقع پر انہی مصنفوں سے بحث کی ہے، بعض یورپین مصنفوں نے تدلیس (مخفی فریب) کے میدان میں اوروں سے بڑھ کر قدم رکھا ہے، اور فریب آمیز طور پر ظاہر کیا ہے، کہ اس واقعہ کی تائید کے لیے اور بھی متعدد شہادتیں موجود ہیں، مسٹر کریٹن صاحب اپنی کتاب کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ "ڈیسائی ڈساسی نے اپنے ایک لمبے نوٹ میں جو اس نے عبداللطیف کے ترجمہ پر لکھا ہے، (مصر کا بیان صفحہ ۲۴۲) عربی مصنفوں کی کتابوں سے مختلف شہادتیں جمع کی ہیں، جو پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں، اور ان شہادتوں سے ابوالفرج کا بیان قابل اعتبار ثابت ہوتا ہے، لیکن مغرور گبن نے ان تصنیفات کو نہیں دیکھا تھا،

اس عبارت سے ایک ناواقف اور خصوصاً وہ جس کو یورپین مصنفوں کے ساتھ عام خوش عتقادی ہو، بالکل دھوکے میں آجائے گا، اور یقین کرے گا، کہ پیرس کے عظیم الشان کتب خانہ میں ضرور اس واقعہ کے متعلق بہت کچھ مادہ موجود ہوگا، ورنہ تمام یورپ میں ایسا غلط واقعہ کیونکر مشہور ہوسکتا تھا،

لیکن ہمارے ناظرین کو پیرس کے پرشوکت نام سے مرعوب نہ ہونا چاہیے، اور ڈیساسی کا نوٹ اور وہ کتابیں جن کا انہوں نے حوالہ دیا ہے، ہمارے سامنے ہیں، بے شبہ ڈیساسی نے اس واقعہ کو بڑے زور و شور سے ثابت کرنا چاہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ جو زور ان کی طبیعت میں ہے، وہ دلائل میں نہیں، ہم اس موقع پر ان کی پوری تحریر کا لفظی ترجمہ نقل کرتے ہیں،

"ابوالفرج نے اپنی تاریخ خاندان عرب میں عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کی نسبت جو واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں متعدد مشہور مصنفوں نے شک کیا ہے، جو کچھ اس واقعہ پر لکھا گیا ہے۔ اس کے بیان کرنے اور اس کی حیثیت کے اندازہ کرنے میں ایک بڑی بحث ضرور ہونی چاہیے،

وہ دلیلیں جن کی بنا پر یہ شکوک کیے گیے ہیں، اس جرمن مباحثہ میں مل سکتی ہیں، جس کو

(Mch Rainhard) نے ۱۷۹۲ء میں بمقام (Gottingue) چھاپا تھا، اور اُن ریمارکوں میں جو اسکندریہ کے قدیم کتب خانوں کے متعلق ہیں، جن کو کہ (M. de sainelta) نے میگزین انسائیکلوپیڈیا، سال پنجم ص ۳۳۴ میں درج کیا ہے، موسیو لانگل (M. langle) اور وایٹ (White) عام خیال کی حمایت کرتے ہیں، لیکن ابوالفرج کے مبالغہ آمیز بیان کو قبول نہیں کرتے،

ابوالفرج کے بیان پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان میں یہ اعتراض قوی خیال کیا گیا ہے کہ عرب کے مورخ ایک ایسے عظیم واقعہ کے متعلق خاموش ہیں، لیکن اس اعتراض کا زور یقیناً عبداللطیف اور مقریزی کی شہادت کے بعد گھٹ جاتا ہے، اگرچہ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظاہراً مقریزی کا وہ فقرہ جیسا کہ موسیو لانگل نے نشان دیا ہے، صرف عبداللطیف کے فقرہ کی نقل ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ ان ریمارکوں سے جن کو میں بیان کر دوں گا، ایک ایسے عالم مصنف (موسیو لانگل مراد ہے) کے ساتھ میدان مبارزت میں آؤں، جس کی میں تہِ دل سے نہایت عزت اور محبت رکھتا ہوں، لیکن میں نے چند اور نئی خاص سندیں پیدا کی ہیں، اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہ واقعہ جس طرح کہ ابوالفرج نے بیان کیا ہے، گو اس میں ایسی تفصیلیں ہیں جو نکتہ چینی کی برداشت نہیں کر سکتیں تاہم یہ سچ ہے کہ وہ ایک تاریخی سچائی پر مبنی ہے، اور یہ کہ عربوں نے جب یہ شہر فتح کر لیا تھا، تو عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے فرمان کے مطابق یہ حکم دیا تھا کہ ایک مجموعہ جس میں بہت سی کتابیں تھیں اور جو اسکندریہ میں تھا، آگ پر رکھ دیا جائے،

اس کے بعد پروفیسر ڈساسی نے حاجی خلیفہ اور مقدمۂ ابن خلدون کی عبارت نقل کی ہے، اور ان سے کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ پر استدلال کیا ہے،

پروفیسر ڈساسی نے جو نئی خاص سندیں پیدا کی ہیں، ان کو دیکھنے کا ہم کو نہایت شوق تھا، مگر افسوس کہ وہ کچھ نہ نکلیں، پروفیسر موصوف نے پیرس کے اتنے بڑے عظیم الشان کتب خانہ کو چھان کر صرف دو سندیں مہیا کیں، ایک تو وہی حاجی خلیفہ کی عبارت جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، دوسری

مقدمہ ابن خلدون کا ایک فقرہ جس میں ایک موقع پر ضمناً اور اجمالاً ایران کے کتب خانہ کا ذکر آگیا ہے۔ یہ بھی عجیب منطق ہے کہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلائے جانے کا دعویٰ کیا جائے، اور دلیل میں ایران کا نام لیا جائے، اگرچہ ابن خلدون کا یہ قول بالکل غلط اور تمام صحیح اور مستند تاریخوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس مقام پر اس سے بحث نہیں کرتے کیونکہ ہمارا مضمون اسکندریہ کے کتب خانہ پر ہے، نہ ایران پر، شاید یہ کہا جائے کہ پروفیسر ڈ ساسی نے ابن خلدون کے قول کو تائیدی شہادت میں پیش کیا ہے لیکن اس سے مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے آگے کوئی نتیجہ نکلتا ہے، تو یہ نکلتا ہے کہ اسکندریہ کا واقعہ بالکل بے اصل ہے، ورنہ جس طرح ایران کا واقعہ ابن خلدون نے بیان کیا تھا، کوئی نہ کوئی عربی مورخ اسکندریہ کے واقعہ کا بھی اسی حیثیت سے ذکر کرتا، حالانکہ عربی کی سینکڑوں ہزاروں تاریخوں میں سے ایک میں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔

عبداللطیف و مقریزی کی اصل عبارت جو ہم نے نقل کی وہ تو کسی طرح شہادت میں پیش نہیں کی جا سکتی، لطف یہ ہے کہ خود ابوالفرج جو اس بحث میں ہمارا مدعا علیہ ہے، اس نے بھی اس واقعہ کو اس حیثیت سے نہیں لکھا جس سے ثابت ہو کہ وہ یقیناً اس کو تسلیم کرتا تھا، اور صحیح سمجھتا تھا، ابوالفرج کی اصلی تاریخ جو سریانی زبان میں ہے، اور جس میں فتح اسکندریہ کا حال تفصیلاً مذکور ہے، اس میں اس واقعہ کا ذکر تک نہیں، البتہ اس تاریخ کا خلاصہ جو عربی زبان میں ہے، اس میں یہ واقعہ جیسا کہ ہم اوپر نقل کر آئے مذکور ہے لیکن اس خلاصہ کی نسبت کافی اطمینان نہیں ہے کہ جو بیانات اس میں اصل سریانی تاریخ پر اضافہ کیے ہیں، وہ درحقیقت ابوالفرج ہی کے ہیں، یا کسی اور نے الحاق کر دیا ہے، مسٹر کریل جرمن اس خلاصہ کی نسبت لکھتے ہیں، کہ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اصل سریانی میں نہیں، اور یہ امر کہ آیا یہ مقامات زمانہ مابعد کے الحاق ہیں، یا خود ابوالفرج نے ان کو بڑھایا ہے، بخوبی معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس خلاصہ کے کل نسخے ناکامل ہیں، یہ واقعہ کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا جو عربی میں موجود ہے، اصل سریانی میں نہیں پایا جاتا، اس عبارت کے الحاق ہونے کا گمان اس سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے، کہ اس عربی خلاصہ کو پروفیسر پوکاک نے اپنے اہتمام و تصحیح

سے چھپوایا ہے۔ اور ان کو مسلمانوں کے خلاف واقعات گڑھ لینے میں نہایت کمال حاصل تھا۔

یہ تمام بحث تو اس لحاظ سے تھی کہ عبداللطیف و حاجی خلیفہ نے اس واقعہ کے متعلق کوئی شہادت دی بھی ہے یا نہیں، لیکن بطریق تنزل اگر ہم یہ مان بھی لیں، کہ درحقیقت ان مصنفوں نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہے، تو دوسری بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس امر کے متعلق ان مصنفوں کی شہادت قابل اعتبار ہے یا نہیں، عبداللطیف بغدادی ۵۵۷ھ میں پیدا ہوا، اور حاجی خلیفہ کو تو دو سو برس سے زیادہ نہیں گذرے، کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ایک ایسے واقعہ کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے شروع میں واقع ہوا ہو۔ وہ شہادت معتبر ہو سکتی ہے جس کو ان لوگوں نے بیان کیا ہو، جو اصل واقعہ کے پانچ سو برس کے بعد پیدا ہوئے، اور جس کی ان لوگوں نے سند بیان کی ہو، نہ کوئی حوالہ دیا ہو،

عبداللطیف و حاجی خلیفہ کا تاریخ میں کیا رتبہ ہے

ہم کو ان مصنفوں کی نسبت یہ بھی دیکھنا ہے، کہ فن تاریخ میں ان کو کیا رتبہ حاصل ہے، کیونکہ یورپین مورخوں نے اس موقع پر بھی تدلیس سے کام لیا ہے، وہ بڑے بڑے شاندار لفظوں میں حاجی خلیفہ اور عبداللطیف کی تعریف کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کی عظمت و شان کے لحاظ سے ان کا قول فرد تسلیم کے قابل ہے، یوروپین مصنفوں کے اس فریب کی پردہ دری کے لیے صرف ایک مختصر سا سوال کافی ہے، ہم بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ عبداللطیف اور حاجی خلیفہ بڑے پایہ کے مصنف ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کس فن میں ؟ عبداللطیف بے شبہ بہت بڑا طبیب تھا، طب میں اس کی متعدد تصنیفات موجود ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں اس کا مفصل تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کی طبی معلومات اور عظمت و شان کا اندازہ معلوم ہو سکتا ہے، لیکن کیا اس کو کسی نے مورخ کہا ہے ؟ کیا اس نے اپنی لائف میں کہیں فن تاریخ کا تذکرہ کیا ہے، اگر نہیں ہے تو تاریخی واقعات میں اس کی عظمت و شان کس کام آئے گی، فارابی، بوعلی سینا کے حوالہ سے اگر کوئی تاریخی واقعہ لکھا جائے تو کس حد تک اعتبار کے قابل ہوگا،

حاجی خلیفہ نے بے شبہ کشف الظنون نہایت مفید کتاب لکھی ہے، لیکن وہ کوئی تاریخ

کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اسلامی تصنیفات کی فہرست ہے، اس کے سوا حاجی خلیفہ کا کوئی کارنامہ ہم کو معلوم نہیں، تاریخ میں نہ اس کی کوئی کتاب ہے، نہ کسی نے اس کو مورخوں میں شمار کیا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مخالفوں کے لیے یہ نہایت شرم کی جگہ ہے، کہ ان کو ایک ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے جو بخیال آن کے چھ مہینے تک قائم رہا، اسلام کی سیکڑوں، ہزاروں تصنیفات میں سے کہیں کوئی سہارا ہاتھ نہ آئے، اور یہ مجبوری ان کو ایک طبیب اور فہرست نگار کے سایہ میں پناہ لینی پڑے،

واقعۂ مفروضہ کے غلط ہونے کا دعویٰ اور نفی کے دعویٰ کا طرز ثبوت

یہاں تک ہم نے جو بحث کی، وہ اس حیثیت سے تھی، کہ ہم نے مخالفین کو مدعی قرار دیا تھا، کیونکہ اصول مناظرہ کی رو سے درحقیقت وہی مدعی ہیں، لیکن اس سے بڑھ کر ہم خود مدعی بنتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے یہ کتب خانہ برباد نہیں ہوا، اور نہ کبھی مسلمانوں نے اس کو برباد کیا، لیکن پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے، کہ جو دعویٰ نفی کی صورت میں کیا جاتا ہے، اس کے لیے روایۃً و درایۃً استدلال کا کیا طریقہ ہے، مثلاً اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ فلاں واقعہ فلاں عہد میں نہیں ہوا، تو اس کی دلیل روایت کے لحاظ سے صرف یہ ہوگی، کہ اس عہد کے متعلق علم و واقفیت کے جس قدر ذریعے ہیں، ان سے اس واقعہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا، اور درایت کے لحاظ سے یہ کہ تمام قرائن اور شہادتیں اس واقعہ کے ثبوت کے خلاف ہیں، انہی وجوہ استدلال کے لحاظ سے ہم دعویٰ کرتے ہیں، کہ کتب خانۂ اسکندریہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہرگز برباد نہیں ہوا،

اسلام کی ابتدائی تاریخیں

اسلام میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ۱۴۰ھ سے ہوئی، اور اسی زمانہ میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب محمد بن اسحٰق نے لکھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہے، اس کے بعد اور مصنفین نے عام تاریخیں لکھیں، جن میں خلفائے راشدین کی فتوحات و واقعات تفصیل سے مذکور ہیں، اس دور کی تصنیفات میں سے آج جو موجود ہیں، یا جن کا نام و نشان معلوم ہے یہ ہیں:

فتوح البلدان بلاذری:- بلاذری خلیفہ متوکل باللہ کے عہد میں تھا، اس تاریخ میں اس نے تمام واقعات

سند متصل کے ساتھ بیان کیے ہیں،

تاریخ یعقوبی یعنی تاریخ احمد بن یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح کاتب العباسی یہ مصنف نہایت قدیم مصنف ہے، اور مامون الرشید کے درباریوں کا ہمعصر ہے، اس نے یہ تاریخ ۲۵۹ھ تک لکھی ہے اور غالباً اس سنہ میں وہ موجود تھا، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور ۱۸۸۳ء میں بمقام لیڈن چھاپی گئی،

تاریخ ابو حنیفہ دنیوری لیڈن میں چھاپی گئی،

تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری۔ یہ تاریخ اگرچہ مذکورہ بالا تاریخوں سے کسی قدر زمانۂ مابعد کی ہے کیونکہ اس کے مصنف نے ۳۱۰ھ مطابق ۹۲۲ء میں وفات پائی، لیکن اس نے تمام واقعات سند متصل کے ساتھ لکھے ہیں، اور ہر روایت میں تمام راویوں کے نام بیان کر دیے ہیں، یہ کتاب تمام ان روایتوں کا مخزن ہے، جو تاریخ اسلام کے متعلق آج موجود ہیں، یا کبھی موجود تھیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ تین سو صدیوں کے متعلق جو معتدبہ واقعہ اس کتاب میں نہیں ہے، وہ داخل تاریخ نہیں، یہ ایک نہایت ضخیم کتاب ہے، اور اس کی بارہ جلدیں ہالینڈ میں چھپ چکی ہیں، اور متعدد جلدیں اور باقی ہیں،

ابن الاثیر و ابن خلدون جن کی تاریخیں نہایت معتبر خیال کی جاتی ہیں، وہ تاریخ طبری ہی کا خلاصہ ہیں، اور خود ان مورخوں نے اس کا اعتراف کیا ہے، ان تاریخوں کے سوا تاریخ اسلام کے متعلق اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن قدیم واقعات کی نسبت ان سب کا ماخذ یہی چند کتابیں ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اور یہ صریح طور پر خود ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے،

ان کتابوں کے سوا مصر و اسکندریہ کے خاص حالات میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے جس قدر ہم دریافت کر سکے یہ ہیں،

خطط مصر لابی عمر الکندی المتوفی ۲۴۶ھ، کشف الممالک لابن شاہین، المتوفی ۳۸۵ھ

تاریخ مصر لعبد الرحمٰن الصوفی المتوفی ۳۴۷ھ ۔ تاریخ مصر لمحمد بن برکات النحوی المتوفی سنہ ۵۲۰ھ، اتعاظ المتامل إلی سنہ ۶۲۰ھ ۔ تاریخ مصر لمحمد بن عبد اللہ المتوفی سنہ ۴۲۰ھ ۔ تاریخ مصر للقفطی المتوفی سنہ ۶۴۶ھ، تاریخ مصر لقطب الدین الحلبی المتوفی ۷۳۵ھ تاریخ مصر لیحییٰ الحلبی المتوفی سنہ ۶۴۰ھ، الانتصار لابن دقماق المتوفی سنہ ۸۰۹ھ، عقود الجواہر، نزہۃ الناظرین، الدرۃ المضیئۃ، اشرف الطرف، نزہۃ السنیہ تفریج الکرۃ فرائد السلوک، بدائع الظہور، تحفۃ الکرام بہ اخبار الاحرام، اعلام تمین دلی مصر فی الاسلام، تاریخ مصر لابراہیم بن وصیف، جواہر البحور، مختار للقضاعی، النقط المعجم، الروضۃ البہیہ، المواعظ والاعتبار للمقریزی، جواہر الالفاظ، اتعاظ الحنفاء، نجوم الزاہرہ تاریخ مصر لابن عبد الحکم،

اگرچہ یہ تمام کتابیں آج نہیں ملتیں، لیکن زمانۂ مابعد کی متعدد تصنیفات ایسی موجود ہیں جن میں تمام قدیم کتابوں کی روایتیں جمع کردی گئی ہیں، مثلاً حسن المحاضرہ سیوطی، جس کے دیباچہ میں خود سیوطی نے لکھا ہے، کہ میں نے اٹھائیس[۲۸] تاریخیں دیکھیں، اور ان سے یہ کتاب تیار کی، سب سے مفصل و بسیط مواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار ہے، جو مقریزی کی تصنیف ہے، اور جس میں مصر و اسکندریہ کے متعلق ایک ایک جزئی واقعہ کا استقصا کیا گیا ہے،

یہ تمام معتبر کتابیں جن کا ذکر اوپر ہوا، اور جن کے سوا اس زمانہ کے حالات دریافت کرنیکا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ان میں سے کسی کتاب میں واقعۂ مبحوث فیہ کا مطلق پتہ نہیں چلتا، ان کتابوں میں اور خصوصاً طبری و فتوح البلدان بلاذری و حسن المحاضرہ و خطط والآثار للمقریزی میں اسکندریہ کی فتح کے نہایت تفصیلی حالات مذکور ہیں، لیکن کتب خانہ کا ذکر تک نہیں،

یہ کتابیں تو وہ ہیں جن میں اس واقعہ کو (اگر وہ واقع ہوتا) مستقل طور پر مذکور ہونا چاہیے تھا لیکن جن تصنیفات میں ضمنی اور اتفاقی طور پر اس کا تذکرہ آسکتا تھا، ان میں بھی واقعۂ مفروضہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا، مثلاً حکماء اور طبیبوں کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جن میں یحییٰ نحوی کا ذکر عموماً کیا گیا ہے، چنانچہ ابو الفرج نے یہ فرضی قصہ جو گڑھا، تو اسی یحییٰ نحوی کے تذکرہ میں گڑھا، اور یوں بیان کیا کہ یحییٰ نے عمرو بن العاص سے کتب خانہ کے لیے درخواست کی تھی، جس کے جواب میں عمرو رض

نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ کے جلا دینے کا حکم دیا، یحییٰ طبیب اور فلاسفر تھا اور عربی زبان
میں اس کی تمام کتابیں ترجمہ کی گئیں، اس لیے عربی تاریخیں جو حکما اور اطبا کے حالات میں ہیں، ان میں
یحییٰ کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست
میں یحییٰ کے تمام حالات، واقعات اور اس کی تصنیفات کے نام لکھے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عمروؓ ۸
ابن العاص کے پاس حاضر ہوا، اور عمروؓ نے اس کی بہت کچھ عزت کی۔ ابن الندیم کے خاص
الفاظ یہ ہیں:

ولما فتحت مصر علی ید عمروؓ ابن العاص دخل الیہ واکرمہ ورای لہ موضعا	یعنی جب مصر عمروؓ بن العاص کے ہاتھ سے فتح ہوا تو یحییٰ عمروؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، عمروؓ نے اسکی عزت و تکریم کی،

ان تمام تصریحات کے ساتھ کتب خانہ کا کہیں ذکر نہیں، جس سے علانیہ اس واقعہ کا بالکل بے اصل
ہونا پایا جاتا ہے،

ان تصنیفات کے علاوہ اور قسم کی تصنیفات مثلاً جغرافیوں، سفرناموں، بیوگرافیوں میں اس
واقعہ کا ذکر ضمناً آ سکتا تھا، لیکن ان کتابوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں، سچ یہ ہے کہ اگر یہ دعویٰ ۲
کیا جائے تو بالکل سچ ہے، کہ عبد اللطیف کی عبارت کے سوا جس کی حقیقت ہم اوپر ۳
بیان کر چکے، کل اسلام کا لٹریچر اس واقعہ کے ذکر سے خالی ہے، اس سے زیادہ اس واقعہ کے
بے اصل ہونے کی کیا دلیل ہوگی؟

اس سے بڑھ کر یہ کہ خود عیسائی قدیم تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں، یوٹیکس المتوفی ۹۴۰ء جو
دسویں صدی عیسوی میں اسکندریہ کا بطریق تھا، اس نے اسکندریہ کی فتح کا حال تفصیل سے لکھا ہے،
اسی طرح الکین جو واقعۂ مفروضہ کے تین سو برس بعد تھا، یعنی ابوالفرج سے دو سو برس پہلے، اس
نے تاریخ مصر خود مصر میں رہ کر لکھی اور اسکندریہ کی فتح کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے، لیکن ان ۰
دونوں کتابوں میں واقعۂ مفروضہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں، یہ دونوں مصنف متعصب عیسائی ۸

تھے، جن کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی بیجا طرفداری کا گمان نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ محقق اور علم دوست تھے، اور ان کی نگاہ میں اتنے بڑے علمی سرمایہ کا ضایع ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی تھی، مصر کے قیام اور ذاتی شوق کی وجہ سے مصر کے حالات کے متعلق ان کے وسائل معلومات نہایت وسیع تھے، ان باتوں کے ساتھ ان دونوں مورخوں کا واقعہ مبحوث فیہ کے متعلق ایک حرف نہ لکھنا صریح اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کچھ اصل نہیں چنانچہ انصاف پسند یورپین مصنفوں مثلاً گبن، کریل نے اس واقعہ کے بے اصل ہونے کیلئے عموماً اس سے استدلال کیا ہے،

اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل یہ ہے کہ جس کتب خانہ کا جلایا جانا بیان کیا جاتا ہے، وہ اسلام کے دور سے پہلے ہی برباد ہو چکا تھا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ کتبخانہ شاہان مصر نے جو بت پرست اور بہت سے خداؤں کے ماننے والے تھے، قائم کیا تھا، جب مصر میں عیسائیت کا دورہ ہوا، تو عیسائی بادشاہوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ان کتابوں کی بربادی شروع کی، اور ان کے اس ارادہ کو پادریوں نے اور بھی اشتعال دیا،

چنانچہ یورپ کے بڑے بڑے نامور مصنفوں اور مورخوں کو تسلیم کرنا پڑا، کہ یہ کتب خانہ اسلام سے پہلے برباد ہو چکا تھا، موسیو رینان جو فرانس کا ایک مشہور عالم ہے، اس نے ایک دفعہ یونیورسٹی میں اس عنوان پر لکچر دیا تھا "اسلام اور علم" یہ لکچر ایک رسالہ کی صورت میں بمقام پیرس ۱۸۸۳ء میں چھپا ہے، اگرچہ یہ لکچر مسلمانوں کے برخلاف نہایت تعصب آمیز تھا، یعنی اس میں نہایت شدومد سے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام اور علم کبھی جمع نہیں ہو سکتے، تاہم اس متعصب شخص نے کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق یہ الفاظ کہے "گرچہ یہ بار بار کہا گیا ہے کہ عمرؓ نے کتب خانہ اسکندریہ کو برباد کرادیا، لیکن یہ صحیح نہیں، کتب خانہ مذکور اس زمانہ سے پہلے ہی برباد ہو چکا تھا"

اس شاہی کتب خانہ کی تفصیلی کیفیت مسٹر کریل نے اپنے مضمون میں لکھی ہے، اور اس کے عہد بہ عہد کی بربادی کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے، لیکن چونکہ مسٹر کریل کا مضمون ہمارے رسالہ کے اخیر میں بطور ضمیمہ شامل ہے، اس لیے ہم اس کو یہاں نقل نہیں کرتے، اس کتب خانہ کا برباد ہونا ایسا یقینی امر

ہے، جس سے وہ یورپین مورخین بھی انکار نہیں کر سکے، جو اس واقعہ کے اثبات کے درپے ہیں، مسٹر ڈریپر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، کہ جولیس سیزر نے نصف سے زیادہ کتابیں جلادی تھیں، اور اسکندریہ کے بطریقوں نے نہ صرف قریباً کل باقی کتابوں کے منتشر ہونے کی اجازت دی، بلکہ اپنی نگرانی میں ان کو منتشر کرادیا، اور دسیس صاف بیان کرتا ہے کہ "بیس سال بعد اس واقعہ کے تھیوفلس نے شہنشاہ تھیوڈوسس سے تحریری اجازت کتب خانہ مذکور کی بربادی کی حاصل کی تھی، میں نے اسکی الماریاں اور خانے خالی دیکھے"۔

چونکہ اس کتب خانہ کی بربادی یقینی امر تھا، اس لیے مخالفوں نے ایک اور فریب سے کام لیا، یعنی یہ دعویٰ کیا کہ عمرؓ نے جو کتب خانہ تباہ کیا، وہ شاہی کتب خانہ نہ تھا، بلکہ سراپیم کا کتب خانہ تھا، چنانچہ اسپیکٹیٹر کے مضمون نگار نے ابوالفرج کی حمایت میں سراپیم ہی کے کتب خانہ کا حوالہ دیا ہے، لیکن یہ توجیہ القول بمالا یرضیٰ بہ قائلہ ہے، کیونکہ ابوالفرج نے اپنی تاریخ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ یحییٰ نحوی نے عمروؓ بن العاص سے کتابوں کے لیے درخواست کی، وہاں صاف یہ الفاظ لکھے ہیں؛ کتب الحکمۃ التی فی خزائن الملوکیۃ یعنی فلسفہ کی یہ کتابیں جو شاہی خزانوں (کتب خانوں) میں ہیں، لیکن اگر یہ تسلیم بھی کریں، کہ یہ حکایت سراپیم کے کتب خانہ کی نسبت ہے، تاہم ہمارے مخالفوں کو یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ سراپیم کا کتب خانہ فتح اسکندریہ کے وقت موجود تھا، بلکہ برخلاف اس کے یہ ثابت ہوگا کہ کتب خانہ مذکور کل یا کل کے قریب پہلے ہی برباد ہو چکا تھا،

مسٹر گرین لکھتے ہیں کہ سراپیم اور اس کے کتب خانہ کا حال اس وقت تک تاریکی میں چھپا ہوا ہے، یہ تو معلوم ہے کہ سراپیم کا معبد جس سے یہ کتب خانہ متعلق تھا، تھیوڈوسیس کے عہد میں ۳۸۹ء میں گرجا بنادیا گیا تھا، لیکن یہ امر کہ آیا اس تبدیلی کے وقت وہ کتب خانہ وہاں موجود تھا، یا ضایع ہوگیا تھا، یا کتابیں قسطنطنیہ کو منتقل ہو گئی تھیں، مطلق ثابت نہیں ہوتا۔ یہ اخیر خیال یعنی کتابوں کا قسطنطنیہ کو جانا زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ تھیوڈوسیس ثانی نے جو کتب خانہ پانچویں صدی میں بمقام قسطنطنیہ قائم کیا، وہ زیادہ تر مصر و ایشیائے کوچک کی کتابوں سے تیار ہوا تھا،

موسیو سیدیو فرانسیسی نے یہ تسلیم کرکے کہ کتب خانہ مبحوث فیہ سراپیم میں تھا، لکھا ہے کہ کسی ہمعصر مورخ نے اس واقعہ (یعنی عمرو بن العاص کا کتب خانہ کو برباد کرنا) کو بیان نہیں کیا لیکن اگر وہ صحیح بھی ہو تاہم وہ صرف معدودے چند کتابوں سے متعلق ہوگا، کیونکہ اس کتب خانہ کے حصے ۳۹۱ء میں سیزر کے عہد میں اور تھیوڈوسیس کے عہد میں برباد ہو چکے تھے،

اب ہم اصول درایت کے معیار سے اس واقعہ کی صحت و عدم صحت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، واقعۂ مذکورہ کو ابوالفرج (جو اس فرضی قصہ کا موجد اول ہے) نے جن خصوصیتوں کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ تو اس قدر لغو ہیں کہ عموماً تمام یورپین مورخین موافق ہوں یا مخالف اس کو افسانۂ باطل سمجھتے ہیں، پروفیسر ڈساسی جنہوں نے بڑے زور شور سے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے، تسلیم کیا ہے کہ ابوالفرج کے بیان میں جو تفصیلیں ہیں، صحیح نہیں۔ برٹش انسائیکلوپیڈیا کے لکھنے والوں نے بھی اس کی ہنسی اڑائی ہے، اور درحقیقت ایک کتب خانہ کا حماموں میں (جن کی تعداد چار ہزار تھی) تقسیم کیا جانا، اور چھ مہینے تک کتابوں کا جلتے رہنا، اور ایندھن کے کام آنا، افسانہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ابوالفرج نے اگرچہ مصر کے تمام حماموں کی تعداد نہیں بتائی، لیکن یہ صحیح طور پر معلوم ہے کہ وہ چار ہزار تھے، اس لیے حمامہائے مصر اور چار ہزار کی تعداد کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہیے، جیسا کہ اکثر یورپین مورخوں نے سمجھا، اب اگر دیکھا جائے کہ اربعۂ متناسبہ کی رو سے فی حمام ہر روز کیا تعداد پڑتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر روز فی حمام ایک کتاب کا بھی پڑتا نہیں پڑتا، بلکہ نصف کتاب سے متجاوز نہیں ہوتا، یا تو حمام ایسے مختصر تھے کہ ایک دن کے لیے ایک کتاب بلکہ نصف کتاب کافی ہوتی تھی، یا کتابیں اس قدر ضخیم تھیں کہ ایک کتاب کا آدھا حصہ حمام کے لیے سارے دن ایندھن کا کام دے سکتا تھا،

یہ بھی مسلم ہے کہ اس زمانہ میں کتابیں چمڑے کے کاغذ پر لکھی جاتی تھیں، جو ایندھن کا کام نہیں دے سکتا تھا، اس لیے کتابوں کا اس کام کے لیے استعمال کرنا اور بھی بے ہودہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈریپر صاحب لکھتے ہیں کہ ہم کو یقین ہے کہ اسکندریہ کے حمام والے جب تک کوئی اور

شی جلائے جانے کے لیے پا سکتے تھے، انھوں نے چمڑے کا کاغذ (جس پر کتابیں لکھی تھیں) نہیں جلایا ہوگا، اور ان کتابوں کا بہت بڑا حصہ چمڑے ہی کے کاغذ کا بنا ہوا تھا،

اس قصے کے گھڑنے والوں نے یہ قصہ مسلمانوں کے بدنام کرنے کے لیے گھڑا، لیکن ان کو خیال نہ آیا کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں سے زیادہ عیسائی موجب الزام ٹھہرتے ہیں، عمرو بن العاص نے اگرچہ اس قدر کتابیں حمام میں بھجوا دیں، لیکن حمام والے جس قدر تھے عیسائی تھے، وہ کتابوں کو بچا سکتے تھے، اور بجائے اس کے ایندھن سے کام لے سکتے تھے، عمرو بن العاص نے اس کے بعد اسکندریہ میں چھ مہینے تک قیام بھی نہیں کیا تھا، کہ ان کی باز پرس کا ڈر ہوتا۔

اگرچہ یہ سرسری اور عام فہم قیاسات واقعۂ مفروضہ کے ابطال کے لیے کافی ہیں، لیکن زیادہ تدقیقات سے اور بھی اس کی رہی سہی قلعی کھل جاتی ہے، اس واقعہ کو اگر ہم درایت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیں، تو ہم کو ان امور پر لحاظ کرنا ہوگا، اسکندریہ پر کس قدر اور کن شرائط کے ساتھ قبضہ کیا گیا؟ اس حیثیت سے اور ممالک جو فتح ہوئے وہاں کیا برتاؤ ہوا؟ اس قسم کے موقعوں میں حضرت عمرؓ کا عموماً طرز عمل کیا تھا؟ عمرو بن العاص کا ذاتی میلان اور مذاق طبیعت کیا تھا؟

اسکندریہ کے علمی خزانے کے آثار اسلام میں ملتے ہیں، یا نہیں؟ ان میں سے ہر سوال کا جواب اس بحث کا کم و بیش فیصلہ کر سکتا ہے،

یہ امر تمام صحیح تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسکندریہ فتح ہونے کے بعد ذمیانہ عہد میں داخل ہوگیا، یعنی وہاں کی تمام رعایا ذمی قرار دی گئی، فتوح البلدان بلاذری میں جو نہایت قدیم تصنیف ہے، اور جس کا مصنف تمام واقعات اپنی سند روایت سے بیان کرتا ہے، لکھا ہے:

ثم ان عمرو رض فتحها بالسیف وغنم	یعنی عمروؓ نے اسکندریہ کو تلوار سے فتح
ما فیها وابقی اهلها ولم یقتل	کیا اور غنیمت لوٹی، اور وہاں کے لوگوں کو

ولم یسب وجعلهم ذمة،	باقی رکھا، اور قتل و قید نہیں کیا، اور لوگوں کو ذمی قرار دیا،

یہی الفاظ ابن الاثیر و ابن خلدون وغیرہ میں بھی ہیں،

ذمیوں کے جو حقوق قرار دیے گئے تھے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ ان کی جان، مال نقد، اسباب، مویشی، مکانات وغیرہ سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا، فارس و شام کی فتوحات میں جو تحریری معاہدے ذمیوں سے ہوئے، وہ تمام تاریخوں میں منقول ہیں، اور سب میں اس حق کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، خود مصر کے معاہدے کے یہ الفاظ ہیں:

هذا ما اعطى عمرو بن العاص اهل مصر من الامان على انفسهم ودمهم واموالهم وصاعهم ومدهم وعددهم	یعنی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اہل مصر کو ان کی جان، خون، مال صاع اور مد کو امان عطا کی،

معجم البلدان میں ایک اور صحیح روایت سے نقل کیا ہے کہ معاہدے میں یہ الفاظ یا مضمون داخل تھا،

ان لهم ارضهم واموالهم لا يتعرضون في شئ منها،	یعنی ان کی زمین اور مال انہی کا رہے گا، اور ان میں سے کسی چیز میں تعرض نہ کیا جائے گا

اہل ذمہ کے ساتھ حضرت عمرؓ کا جو طرز عمل تھا، اس کی پوری تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے، لیکن اجمالاً اس قدر کہنا ضروری ہے کہ انھوں نے ذمیوں کی جان و مال کو ہمیشہ مسلمانوں کی جان و مال کے برابر سمجھا، شہر حیرہ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر ڈالا تھا، اس کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، اور اس حکم کی علانیہ تعمیل کرائی، مفلس ذمیوں کے لیے بیت المال سے روزینے مقرر کیے، فارس و شام کی تمام فتوحات میں گرجے اور معبد محفوظ رکھے، اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ مرنے کے وقت جو تین وصیتیں کیں، ان میں ایک یہ تھی:

اوصی الخلیفۃ من بعدی بذمۃ	میرے بعد جو خلیفہ مقرر ہوگا، اس کے لیے میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہؐ کے ذمہ کو وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں
ان یوفی لھم بعھدھم وان	کے معاہدوں کو بجالائے اور ان کی حفاظت
یقاتل من ورائھم ولا یکلفوا	کے لیے ان کے دشمنوں سے لڑے، اور انکی
فوق طاقتھم،	طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے،

یورپ کے متعصب مصنفین اگرچہ حضرت عمرؓ کی شدت اور جبروت کے شاکی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ جس وقت جو کچھ ان کی زبان و قلم سے نکلا، وہ اسی طرح برتا گیا، متعصب سے متعصب مورخین عیسائی ان کی تمام زندگی کا ایک واقعہ بھی نہ بتا سکے جس میں ان کا عمل قول کے مخالف تھا،

جب یہ مسلّم ہے کہ اسکندریہ والے ذمی قرار دیے گئے، اور ذمیوں کے ساتھ جو کچھ حضرت عمرؓ کا طرز عمل تھا، وہ تفصیلاً معلوم ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اسکندریہ والوں کی ایک بڑی یادگار (کتب خانہ) کو اس بے رحمی سے برباد کیا جاتا؟ کیا یہ کتب خانہ مسلمانوں کو گرجاؤں اور آتشکدوں سے زیادہ ناگوار ہو سکتا تھا؟ تمام ممالک مفتوحہ میں جب سیکڑوں ہزاروں گرجے اور آتشکدے قائم رکھے گیے، اور ان کی حفاظت کے لیے تمام فرامین میں یہ خاص الفاظ لکھے گیے،

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ	یعنی کوئی گرجا اور عبادت گاہ ڈھایا نہ جائیگا
داخل المدینۃ ولا خارجھا،	نہ شہر کے اندر اور نہ باہر،

تو کتب خانہ کی نسبت ایسا ظالمانہ برتاؤ کیونکر قیاس میں آسکتا ہے،

سچ یہ ہے کہ ابوالفرج کو (جو اس فرضی قصہ کا موجد ہے) جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا تھا، وہ اگر اس واقعہ کو عین محاصرہ اور فتح کی حالت میں بیان کرتا، تو قیاس میں آسکتا تھا، کیونکہ حملہ اور مقابلہ کا جوش کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن یہ تسلیم کر کے کہ شہر کو امن دے دیا گیا، اہل شہر ذمی قرار دیدیے گیے، حملہ اور معرکہ آرائی کا جوش ختم ہو چکا تو اس وقت ایسا ظالمانہ عمل صرف ابوالفرج

ہی کے قیاس میں جائز ہو سکتا ہے، پروفیسر سیدیو نے اسی بنا پر ابو الفرج کے بیان کو ناقابل اعتبار سمجھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ فتح کے پہلے دلہ میں شہر غارت نہیں کیا گیا، تو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایسے وحشیانہ کام کا اس وقت حکم دیا گیا ہو جب کہ فاتحین کا خون سرد ہو چکا تھا، (حضرت) عمروؓ بن العاص کی قابلیت، اور مذاق کا خود ابو الفرج نے اعتراف کیا ہے، چنانچہ وہ یحییٰ نحوی کے تذکرہ میں لکھتا ہے،

دخل علی عمرو وقد عرف موضعه من العلوم فاکرمه عمرو وسمع الفاظه الفلسفية التی لم تکن للعرب بها انسة ماهاله وکان عمرو عاقلا حسن الاستماع صحیح الفکر فلازمه وکان لا یفارقه۔	یعنی وہ (یحییٰ نحوی) عمرو کے پاس حاضر ہوا عمرو نے اس کے علمی مرتبے سے واقف ہو کر اس کی عزت کی، عمرو نے اس کے وہ فلسفیانہ الفاظ سنے جن سے عرب کبھی مانوس نہ تھے، اس لیے وہ اس پر مفتون ہو گیا، اور عمرو عاقل خوش فہم، صحیح الفکر شخص تھا، اس لیے اس نے یحییٰ نحوی کی صحبت کو لازم پکڑ لیا، اور اس کو کبھی جدا نہیں کرتا تھا،

اب خیال کرو کہ ایسا قابل اور علم دوست شخص جس نے باوجود مذہبی جوش کے ایک عیسائی عالم کو اپنا رفیق و ہمدم بنا لیا ہو اس کے ساتھ اس کو علمی مباحث بلکہ فلسفہ کا چسکا پڑ چکا ہو، وہ اس بے رحمی سے مدت تک کتب خانہ کو برباد کرتا، جو ایک جاہل سے جاہل شخص بھی نہیں کر سکتا تھا، مانا کہ وہ خود مختار نہ تھے، لیکن حضرت عمرؓ کو جو خط لکھا تھا، اس میں کتب خانہ کے لیے سفارش تو کر سکتے تھے، عمروؓ نے بہت سے کاموں میں اکثر زور ڈال کر حضرت عمرؓ سے اجازت حاصل کی تھی، مصر و اسکندریہ پر لشکر کشی کے لیے حضرت عمرؓ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے، عمروؓ نے ان کو مجبور کیا، اور ذمہ داری لی کہ اس کا فتح کرنا کچھ مشکل نہیں، اس وقت حضرت عمرؓ نے اجازت دی، بلکہ علامہ بلاذری (جو نہایت مشہور اور مستند مؤرخ ہے) کی روایت کے مطابق عمروؓ بن العاص نے حضرت عمرؓ کی اجازت کا بھی

انتظار نہ کیا، اور مصر کو روانہ ہو گئے، اور یہ تو عموماً مسلم ہے کہ مصر و سکندریہ کی فتح جس شرط پر ہوئی اور معاہدہ میں جو شرطیں قلمبند ہوئیں، وہ بالکل عمروؓ نے اپنی رائے سے لکھیں، حضرت عمرؓ کو ان کی اطلاع البتہ دی، اور انھوں نے اس کو منظور کر لیا، کیا کتب خانہ کی نسبت عمرو بن العاصؓ ایسا نہیں کر سکتے تھے،

اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ کی فتح کے بعد دربار خلافت میں جو خط بھیجا، اس میں ایک ایک چیز کی تفصیل کی ہے، چنانچہ فتح کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ "اس شہر میں چار ہزار حمام، چار ہزار قصر، چالیس ہزار خراج گذار یہودی، چار سو شاہی سیرگاہیں، بارہ ہزار باغ جن کی ترکاری بکتی ہے، موجود ہیں۔" لیکن ان تفصیلوں میں ہم کو اپنے دوست ابو الفرج کے فرضی کتب خانہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا،

تمام واقعات تاریخی پر غور کرنے سے حقیقت واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسکندریہ میں جس قدر قدیم کتب خانے تھے، اسلام کے زمانہ سے پہلے ہی برباد ہو گئے تھے، جس کے اسباب و اتفاقات مورخوں نے بہ تفصیل لکھے ہیں، لیکن ان آفتوں پر بھی علمی آثار بالکل معدوم نہیں ہو گئے تھے، اور ایسے ایک شہر میں جو سیکڑوں برس تک دار العلوم رہ چکا تھا، علمی یادگاروں کا یک لخت معدوم ہو جانا ممکن بھی نہ تھا، چنانچہ زمانہ اسلام سے کسی قدر پہلے اسکندریہ میں سات نہایت مشہور طبیب اور فلاسفر موجود تھے، جن کے نام یہ ہیں، سطفن، جاسیوس، انا دو سیوس، اکیلاؤس، انفیلاؤس، فلادیوس، یحییٰ نحوی، ان سب میں یحییٰ نحوی نے زیادہ عمر پائی، اور عمرو بن العاصؓ کے زمانہ تک زندہ رہا، اسکندریہ کے کتبخانے تو بہت پہلے برباد ہو چکے تھے، لیکن اخیر زمانہ میں جو علمی سرمایہ مہیا ہوا تھا، وہ اسلام کی فتح کے وقت موجود تھا، اور زمانۂ مابعد تک بھی باقی رہا، چنانچہ دولت عباسیہ کے زمانہ میں جب علمی یادگاروں کی تلاش ہوئی، تو اسکندریہ سے معتدبہ ذخیرہ ہاتھ آیا، ہارون الرشید و مامون الرشید و متوکل باللہ کے عمال جو شام و فلسطین، ایشیائے کوچک، سائپرس میں فلسفی اور طبی تصنیفات ڈھونڈتے پھرتے تھے، اسی غرض سے اسکندریہ بھی گئے تھے، اور بہت سی کتابیں حاصل کیں، حنین بن اسحاق نے لکھا ہے، کہ

جالینوس کی کتاب البرہان کی تلاش میں میں جزیرہ، شام، فلسطین، مصر کے تمام شہروں میں پھرا، یہاں تک کہ اسکندریہ پہنچا، لیکن کتاب مذکور کا کہیں پتہ نہ چلا، صرف دمشق میں اس کے چند حصے وہ بھی بے ترتیب ملے۔" حنین کو اگرچہ اس کتاب کے ملنے میں اس وجہ سے ناکامی ہوئی کہ قدیم کتب خانے اسلام سے پہلے ہی برباد ہو چکے تھے، لیکن زمانۂ مابعد کی تصنیفات جو شروع اسلام تک محفوظ تھیں، تقریباً کل ہاتھ آئیں، جن سات حکیموں کا اوپر ذکر ہوا ان کی تمام تصنیفات محفوظ ہیں، اور عربی زبان میں ان کے ترجمے کیے گئے، یحیٰ نحوی کی کتابوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، چنانچہ اسکی جس قدر کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

تفسیر کتاب[1] قاطیغوریاس لارسطو، تفسیر[2] کتاب انالوطیقا ے الاولیٰ لارسطو، تفسیر[3] کتاب انالوطیقا الثانی لارسطو، تفسیر[4] کتاب طوبیقا لارسطو، تفسیر[5] کتاب السماع الطبیعی لارسطو، تفسیر[6] کتاب الکون والفساد لارسطو، تفسیر[7] کتاب مابال لارسطو، تفسیر کتاب[8] الفرق لجالینوس، تفسیر کتاب[9] الصناعۃ لجالینوس، تفسیر کتاب[10] النبض الصغیر لجالینوس، تفسیر[11] کتاب اغلوقن لجالینوس، تفسیر[12] کتاب الاسطقسات لجالینوس، تفسیر[13] کتاب القوی الطبیعیۃ لجالینوس، تفسیر[14] کتاب التشریح الصغیر لجالینوس، تفسیر[15] کتاب العلل والاعراض لجالینوس، تفسیر[16] کتاب الحمیات لجالینوس، تفسیر[17] کتاب تعرف علل الاعضاء الباطنۃ لجالینوس، تفسیر[18] کتاب النبض الکبیر لجالینوس، تفسیر[19] کتاب البحران لجالینوس، تفسیر[20] کتاب ایام البحران لجالینوس، تفسیر[21] کتاب منافع الاعضاء لجالینوس، تفسیر[22] کتاب تدبیر الاصحاء لجالینوس، تفسیر[23] کتاب المزاج لجالینوس، جوامع[24] کتاب الترياق لجالینوس، جوامع[25] کتاب الفصد لجالینوس، کتاب[26] الرد علی برقلس، کتاب[27] فی ان کل جسم متناہ فقوتہ متناہیۃ، کتاب[28] الرد علی ارسطو، کتاب[29] الرد علی نسطورس، شرح[30] کتاب ایساغوجی لفرفوریوس، ان کے سوا اور بھی کتابیں ہیں جن کی تفصیل طبقات الاطباء و کتاب الفہرست لابن الندیم میں ملتی ہے۔ اگر اسکندریہ کا کتب خانہ عمرو بن العاص کے زمانہ میں برباد ہوا، تو سب سے پہلے یحیٰ نحوی کی تصنیفات برباد ہونی چاہیے تھیں، جو عمرو بن العاص کا ہمعصر اور بقول ابو الفرج کے کتب خانۂ مذکور کا مہتمم تھا،

غرض مصر و اسکندریہ وغیرہ میں اسلام کے زمانہ تک جو سرمایہ محفوظ رہ گیا تھا، وہ ہرگز ضایع نہیں ہونے پاتا، البتہ جو کچھ اسلام سے پہلے تلف ہو چکا تھا، اس کو وہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تھا، ہم کو تاریخوں سے اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ کی بھی کوئی چیز اگر زمانۂ اسلام تک کسی وجہ سے محفوظ رہ گئی، تو وہ ہرگز برباد نہیں ہونے پائی بلکہ زمانۂ ما بعد میں نہایت قدردانی کے ساتھ یادگار کے طور پر اس کو محفوظ رکھا گیا، ابن البندی نے جو مصر کا رہنے والا اور علم اصطرلاب کا بڑا ماہر تھا، لکھا ہے کہ:

"وزیر ابو القاسم علی بن احمد الجرجانی نے ۴۳۵ھ ہجری میں قاہرہ کے کتب خانہ کا جائزہ لیا، اور قاضی ابو عبداللہ القضاعی وابن خلف وراق کو حکم دیا کہ کتابوں کی فہرست تیار کریں، اور جلدیں جو خراب ہو گئی ہیں، ان کی مرمت کرائیں، میں بھی ان دونوں بزرگوں کے ساتھ اس غرض سے وہاں گیا کہ اپنے مذاق کی کتابوں کی سیر کروں، چنانچہ صرف نجوم و ہندسہ و فلسفہ کے متعلق جو اجزا رتھے، انکی تعداد چھ ہزار پانچ سو تھی، یہیں میں نے ایک تانبے کا کرہ دیکھا، جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا، میں نے اس کی قدامت کا اندازہ کرنا چاہا، تو حساب سے ثابت ہوا کہ دو ہزار دو سو پچاس برس کی مدت کا ہے، یہیں مجھ کو ایک اور کرہ ملا، جو چاندی کا تھا، اور جس کو ابو الحسن صوفی نے عضد الدولہ کے لیے بنایا تھا، اس کا وزن تین ہزار درم تھا، اور تین ہزار دینار (پندرہ ہزار روپیے) کو خریدا گیا تھا۔"

اگرچہ ہم نے اس بحث کو مجتہدانہ اصول کے ساتھ طے کر دیا ہے، اور اس وجہ سے ہم کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ یورپ کے مورخین ہم زبان ہیں یا نہیں، تاہم تقلید پسندوں، اور بالخصوص ان لوگوں کی تسلی کے لیے جن کو یورپ کے ساتھ نہایت حسن عقیدت ہے، یہ کہہ ضرور ہے کہ واقعۂ مفروضہ گو ایک زمانہ میں تمام یورپ میں تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن جس قدر تاریخی تحقیقات کو ترقی ہوتی گئی، اسی نسبت سے اس کی تصدیق کا زور گھٹتا گیا، یہاں تک کہ حال کے مصنفین میں زیادہ تر ان ہی لوگوں کی تعداد ہے، جو اس کو غلط اور مشکوک واقعہ

قرار دیتے ہیں، آج تک اس قدر ہوا ہے، اور امید ہے کہ وہ دن بھی آئے جب زیادہ غور اور تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہوکر علانیہ کہدے، کہ

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا،

(رسائل شبلی)

(۱۸۹۸ء)

الجزیہ

غیر مذہب والوں نے ہمیشہ اس لفظ کو نہایت ناگواری سے سنا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسلام ہی لفظ کا موجد ہے، اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا، جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا، ان کا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا، جس سے بچنے کے لیے اسلام کا قبول کر لینا بھی گوارا کیا جاتا تھا، اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا، لیکن یہ تمام غلط خیالات ان ہی غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں، جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت ہیں، ہم اس موقع پر تین حیثیتوں سے جزیہ پر بحث کرنی چاہتے ہیں، جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے، اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے، ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے قائم ہوئی، اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا،

پہلی بحث

جزیہ گو اب مصطلح معنی میں خاص ہو گیا ہے، لیکن لغت کی رو سے وہ خراج اور جزیہ کیلئے یکساں موضوع ہے، قاموس میں ہے الجزیۃ خراج الارض وما یوخذ من الذمی، جوہری و صاحب قاموس نے اس لفظ کے اصل و اشتقاق سے کچھ بحث نہیں کی، صاحب کشاف نے اسکو "جزی" سے مشتق خیال کیا ہے، اصل یہ ہے کہ غیر زبانوں کے جو الفاظ عربی میں مستعمل ہو گئے ہیں، ان کی نسبت ہمارے مصنفین اکثر غلطی کرتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ خاص اس قسم کے الفاظ نہایت استیعاب سے جمع کیے گئے ہیں، اور یہ فن لغت کی ایک شاخ بن گئی ہے، تاہم جو کتابیں اس موضوع

پر لکھی گئی ہیں، مثلاً شفاء العلیل وغیرہ، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غیر زبانوں کے ماہر نہ تھے، منجنیق اور صوفی صاف یونانی الفاظ ہیں، جن کی اصل مکانک اور سوف ہے لیکن ہمارے علمائے لغت منجنیق کی اصل "من چہ نیک" بتاتے ہیں، اور صوفی کو صوف سے ماخوذ سمجھتے ہیں، جو ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے، اس قسم کے اور سیکڑوں الفاظ ہیں،

غیر زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات کے متعلق نہایت صحیح اور مستند کتاب جو عربی زبان میں لکھی گئی، وہ "مفاتیح العلوم" ہے، یہ کتاب صاحب کشف الظنون کا ماخذ ہے، اور علامہ مقریزی نے اسکی نسبت لکھا ہے، کتاب جلیل القدر، اس میں جزیہ کی نسبت لکھا ہے، وجزاء رؤس اھل الذمۃ جمع جزیۃ وھو معرب گزیت وھو الخراج بالفارسیۃ،[1]

یعنی ذمیوں سے جزیہ لیا جاتا ہے، یہ معرب لفظ ہے، جس کی اصل گزیہ ہے، اور اس کے معنے فارسی میں خراج کے ہیں،

فارسی لغت نویسوں نے گزیت کی لغت میں تصریح کی ہے، کہ جزیہ اسی کا معرب ہے،

برہان قاطع میں ہے گزیت بفتح الاول وکسر ثانی زرے باشد کہ حکام ہر سالہ از رعایا گیرند آنرا خراج ہم گویند وزرے را نیز گویند کہ از کفار ذمی ستانند، نظامی گوید،

گش خاقان خراج چین فرستند   گش قیصر گزیت دین فرستند

واو نچہ شہرت دارد بہ کسر اول وفتح ثالث است ومعرب آں جزیہ باشد، فرہنگ جہانگیری کے مصنف نے دوسرے معنی کے سند میں حکیم سوزنی کا یہ شعر سنداً نقل کیا ہے،

کتاب خویش بخواہم در وعمل نکنم   کہ تا گزیت رسانند نا نخوار اہل کتاب

اور یہ بھی لکھا ہے کہ جزیہ اسی کا معرب ہے،

ہم کو اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ جزیہ اصل میں فارسی کا لفظ ہے، تصریحات لغت کے علاوہ تاریخی قرینہ نہایت قوی موجود ہے، یہ مسلّم ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں جزیہ کا لفظ مستعمل ہو چکا تھا،

---

[1] دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۵۹،

یہ بھی مسلم کہ فارسی میں گزیت کا لغت اسی معنی میں قدیم سے شایع ہے، تاریخی شہادتوں سے (جیسا کہ ہم آیندہ بیان کریں گے) ثابت ہو کہ نوشیرواں نے جزیہ کے قواعد مقرر کیے تھے، اور اس زمانہ میں نوشیرواں کے عمال یمن اور مضافات یمن پر منصوب تھے، اس طرح گزیت کا لفظ قانونی طور پر عرب میں پھیلا، اور معرب ہوکر جزیہ ہوگیا، یہ عام قاعدہ ہے کہ محکوم ملک میں جب فرماں روا زبان کے الفاظ دخل پانے لگتے ہیں، تو سب سے پہلے وہ الفاظ آتے ہیں جو سلطنت کے قانونی الفاظ ہوتے ہیں، زبانِ عرب میں جس قدر فارسی الفاظ معرب ہوکر شایع ہوگیے ہیں، کسی اور زبان کے نہیں ہوتے، اس پر طرہ یہ کہ جزیہ کا لفظ معرب ہونے کے لیے گویا پہلے ہی آمادہ تھا، صرف ایک حرف کی تبدیل اور دو ایک تغیر سے وہ عربی قالب میں پورا اتر گیا،

دوسری بحث

جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ایران و عرب میں خراج و جزیہ کے وہ قواعد جو بادنیٰ تغیر اسلام اسلام میں رائج ہیں، نوشیرواں کے عہد میں مرتب ہوئے، امام ابوجعفر طبری جو بہت بڑے محدّث اور مورّخ تھے، نوشیرواں کے انتظامات ملکی کے بیان میں لکھتے ہیں، والزم الناس الجزیۃ ماخلا اھل البیوتات والعظماء والمقاتلۃ والھرابذۃ والکتاب ومن کان فی خدمۃ الملک وصیروھا علی طبقات، اثنی عشر درھما وثمانیۃ وستۃ واربعۃ ولا یلزموا الجزیۃ من کان اتی لہ من السن دون العشرین او فوق الخمسین[1]،

یعنی لوگوں پر جزیہ مقرر کیا گیا، جس کی شرح بارہ[2] درہم اور آٹھ[3] و چھ[4] و چار[5] تھی، لیکن خاندانی شرفا، اور امرا، اور اہل فوج اور پیشوایان مذہب اور اہل قلم اور عہدہ داران دربار جزیہ سے مستثنیٰ تھے اور وہ لوگ بھی جن کی عمر پچاس[5] سے زیادہ اور بیس[2] سے کم ہوتی تھی،

امام موصوف اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں، وھی الوضایع التی اقتدی بہا

[1] تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۹۶۲،

عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد الفرس، یعنی حضرت عمرؓ نے جب فارس کو فتح کیا، تو ان ہی محاصل کی تقلید کی، علامہ ابوحنیفہ دینوری نے بھی کتاب الاخبار الطوال میں بعینہٖ اس تفصیل کو نقل کیا ہے[1]

جس غرض سے نوشیرواں نے جزیہ کا قاعدہ جاری کیا، اس کی وجہ علامہ طبری نے نوشیرواں کے اقوال سے یہ نقل کی ہے، کہ "اہل فوج ملک کے محافظ ہیں، اور ملک کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں، اس لیے لوگوں کی آمدنی سے ان کے لیے ایک رقم خاص مقرر کی گئی کہ ان کی محنتوں کا معاوضہ ہو"

خراج و جزیہ کے متعلق جو کچھ ان مورخوں نے لکھا۔ اس کی تائید فردوسی کے اشعار سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ بعض امور میں دونوں کا بیان مختلف ہے، ہم ان اشعار کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

همه با دستاهان شدند انجمن — زمیں را بسنجید و بر زو سن
گزیتے نهادند بر یک درم — گرا یدون کہ دہقان نبودے دژم
گزیت زر بار در شش درم — بخرماستاں بر ہمیں زد رقم
کسے کش درم بود و دہقاں نبود — نبودے غم و رنج کشت و درود
گذارندہ از دہ درم تا چہار — بہ سالے از و بستدے کاردار
و بیر دبیر ستندۂ شہریار — نبودے بہ دیوان کسے را شمار

دونوں روایتوں کے فرق کو ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں،

تیسری بحث

اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اس کی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کیلئے مجبور کیا جا سکتا تھا، یہ قاعدہ کچھ آسان قاعدہ نہ تھا، اور لوگ اگر ذرا بھی اس سے بچنے کا حیلہ پا جاتے تھے، تو اس سے

---

[1] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۷۳،

فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار جب جزیرہ سسلی میں مکت کے معنی اس جبر سے بری کردیئے گئے تو سیکڑوں آدمیوں نے اور کام چھوڑ کر یہی پیشہ اختیار کرلیا[۱]

اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں جس طرح نوشیروان عادل نے عموماً اہل فوج کو اس جزیہ سے بری رکھا تھا لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے، اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، انکو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پُرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے تھے، اس لیے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا، جو فارسی لغت سے معرب کیا گیا تھا، لیکن اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کیلئے آمادہ ہونا گوارا کیا، تو وہ جزیہ سے بری کردیئے گیے، جیسا کہ ہم آیندہ تاریخی شہادت سے ثابت کریں گے،

جزیہ کا معاوضۂ حفاظت ہونا، علمی و عملی طور سے ہمیشہ مسلّم رہا۔ اور سچ یہ ہے کہ اسی خیال نے اکثر اہل لغت کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا، کہ جزیہ فارسی زبان کا لفظ ہے، وہ سمجھے کہ یہ لفظ جزاء سے نکلا ہے، جس کے معنی بدلے کے ہیں، اور چونکہ یہ بھی ایک معاوضہ اور بدلہ ہے، لہذا اس مناسبت سے اس کا نام جزیہ رکھا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں، ان سے عموماً پایا جاتا ہے، کہ جزیہ ان لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا، اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے "یحفظوا و یمنعوا" یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے، اور دشمنوں سے بچائے جائیں۔[۲] حضرت عمرؓ نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں، وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں، اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے ان کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہیے، اس موقع پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں، جن سے نہایت صاف اور صریح طور پر ثابت

---

[۱] دیکھو معجم البلدان یاقوت حموی، ذکر صقلیہ، [۲] دیکھو فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۵۹،

ہوتا ہے، کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا، اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھے، یہی سمجھ کر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے،

ھذا کتاب من خالد بن الولید لصلوبا بن نسطونا و قومہ انی عاھدتکم علی الجزیۃ والمنعۃ فلک الذمۃ والمنعۃ ما منعناکم فلنا الجزیۃ والا فلا، کتب سنۃ اثنی عشرۃ فی صفر[1]	یہ خالد بن الولید کی تحریر ہے، صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لیے، میں نے تم سے معاہدہ کیا جزیہ اور محافظت پر، پس تمہاری ذمہ داری اور محافظت ہم پر ہے، جب تک ہم تمہاری محافظت کریں، ہم کو جزیہ کا حق ہے، ورنہ نہیں، صفر ۱۲ سنہ لکھا گیا،

عمالانِ اسلام نے عراق عرب کے اضلاع میں وہاں کے باشندوں کو جو عہد نامے لکھے، اور جن پر بہت سے صحابہؓ کے دستخط تھے، ان کے ملتقط الفاظ یہ ہیں:

براءۃ لمن کان من کذا وکذا من الجزیۃ التی صالحہم علیھا الامیر خالد بن الولید وقد قبضت الذی صالحہم علیہ خالد والمسلمون لکم ید علی من بدل صلح خالد ما اقررتم بالجزیۃ وکنتم امانکم امان و صلحکم صلح ونحن لکم علی الوفاء،[2]	ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس اس تعداد کا جزیہ دینا قبول کیا ہے، اور جن پر خالد بن ولید نے ان سے مصالحت کی ہے، یہ برأت نامہ ہے، خالد اور مسلمانوں نے جس تعداد پر صلح کی وہ ہم کو وصول ہوئی، جو شخص خالد کی صلح کو بدلنا چاہے، اس کو تم لوگ مجبور کر سکتے ہو، بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے رہو، تمہاری امان امان ہے، اور تمہاری صلح صلح، یعنی جس سے تم

---

[1] تاریخ کبیر ابو جعفر طبری مطبوعہ یورپ جزء رابع صفحہ ۲۰۱۵، [2] تاریخ طبری ص ۲۰۵۰

صلح کرو ہم بھی صلح کریں گے، اور جسکو تم امان
دو گے ہم بھی امان دیں گے)

اس کے مقابلے میں عراق کی رعایا نے یہ تحریر لکھی،

انا قد ادینا الجزیۃ التی عاھدنا علیھا خالد ان یمنعونا وامیرھم البغی من المسلمین وغیرھم، (طبری صفحہ مذکور)

ہم نے وہ جزیہ ادا کر دیا جس پر خالدؓ سے معاہدہ کیا تھا، اس شرط پر کہ مسلمان اور نیز اور تمام قومیں اگر ہم کو گزند پہونچانا چاہیں، تو جماعت اسلام اور ان کے افسر ہماری حفاظت کے ذمہ دار ہوں،

ان تحریری معاہدوں کے علاوہ جہاں جہاں صحابہؓ نے دعوت اسلام دی، جزیہ کی نسبت یہی خیال ظاہر کیا، مثلاً ۱۴ھ میں یزدگرد کے پاس جب صحابہؓ گیے، تو نعمان بن مقرن نے جو سفارت کے سردار تھے گفتگو کے خاتمہ پر کہا۔ وان اتقیتمونا بالجزاء قبلنا ومنعنا یعنی اگر جزیہ ادا کرنے کے ذریعے سے جان بچاؤ گے تو ہم قبول کریں گے، اور تم کو تمہارے دشمنوں سے بچائیں گے یا جب سپہ سالار فارس سے گفتگو ہوئی تو حذیفہ بن محصن نے کہا او الجزاء ونمنعکم ان احتجتم الی ذالک، یعنے یا جزیہ دو اور اس صورت میں جب تم کو ضرورت ہوگی تو ہم تمہاری حفاظت کریں گے، یہ معاہدے اور تقریریں صرف زبانی باتیں نہ تھیں، بلکہ ہمیشہ اس پر عمل کیا گیا،

ابو عبیدہ جراحؓ نے شام میں جب متواتر فتوحات حاصل کیں، تو ہرقل نے ایک عظیم الشان فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار کی، مسلمانوں کو اس کے مقابلہ میں بڑی مستعدی سے بڑھنا پڑا، ان کی تمام قوت و توجہ فوجوں کی ترتیب میں مصروف ہوئی، اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ امین افسر فوج نے اپنے تمام عمال کو جو شام کے مفتوحہ شہروں پر مامور تھے، لکھ بھیجا کہ جس قدر جزیہ و خراج جہاں جہاں وصول کیا گیا ہے سب ان لوگوں کو واپس دے دو جن سے وصول ہوا تھا، اور ان سے کہدو کہ ہم

نے تم سے جو کچھ لیا تھا، اس شرط پر لیا تھا کہ تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کر سکیں، لیکن اب اس واقعہ کے پیش آ جانے کی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے، حضرت ابوعبیدہؓ کے خاص الفاظ جن میں عیسائیوں سے خطاب ہے، یہ ہیں: **انما رددنا عليكم اموالكم لانه قد بلغنا ماجمع لنا من الجموع وانكم قد اشترطم علينا ان نمنعكم وانا لا نقد رعلى ذلك ورددنا عليكم ما اخذنا منكم** عیسائیوں نے مسلمانوں کو دل سے دعا دی اور کہا کہ خدا پھر تم کو ہمارے شہروں کی حکومت دے، رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی لے لیتے، چنانچہ سب سے پہلے اس حکم کی تعمیل حمص میں ہوئی، جہاں حضرت ابوعبیدہؓ خود مقیم تھے، انہوں نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر کہا کہ جو کچھ ذمیوں سے وصول ہوا ہے، سب ان کو واپس کر دو، اس کے بعد ابوعبیدہؓ دمشق میں آئے اور سوید بن کلثوم کو اس کام پر مقرر کیا کہ ذمیوں سے جس قدر رقم وصول ہوئی ہے، سب ان کو واپس کر دی جائے[۱]۔

ان سب باتوں سے زیادہ یہ امر اس دعویٰ کے لیے دلیل بین ہے کہ اگر کسی غیر قوم نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی تو وہ اسی طرح سے جزیہ سے بری رہے جس طرح خود مسلمان۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب حبیب بن مسلمہ نے قوم جراجمہ[۲] پر فتح پائی تو ان لوگوں نے فوجی خدمتوں میں بہ وقت ضرورت شریک ہونا خود پسند کیا اور اس وجہ سے تمام قوم جزیہ سے بری رہی، نہ صرف جراجمہ بلکہ بہت سے نبطیوں اور ان کے متصل کی آبادیوں نے یہ امر اختیار کیا اور جزیہ سے بری رہیں، خلیفہ واثق باللہ عباسی کے زمانے میں وہاں کے عامل نے غلطی سے ان لوگوں پر جزیہ لگایا، تو انہوں نے خلیفہ کو اطلاع دی اور دربارِ خلافت سے ان کی براءت کا حکم صادر ہوا[۳]، جزیہ کا معاوضۂ حفاظت ہونا اس قدر صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ معاہدوں میں یہاں تک تصریح کر دی جاتی تھی کہ ذمی اگر

---

[۱] دیکھو کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۸۱ و فتوح البلدان ص ۱۳۷ و فتوح الشام ازدی ص ۱۳۷ [۲] ایک عیسائی قوم تھی اور شہر جراجمہ اور اس کے مضافات میں آباد تھی، معجم البلدان میں اس مقام کا ذکر تفصیلاً لکھا ہے [۳] تاریخ کبیر طبری

صرف ایک سال فوجی خدمت میں شریک ہوں گے، تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دیا جائیگا، چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کثرت سے یہ معاملہ پیش آیا، عتبہ بن فرقد نے جب آذربائیجان فتح کیا تو معاہدے میں یہ الفاظ لکھے، علی ان یؤدوا الجزیۃ علی قدر طاقتہم [illegible] حشر منہم فی سنۃ وضع عنہ جزاء تلک السنۃ، یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ جزیہ ادا کریں، اور جو شخص کسی سال لڑائی میں بلایا جائیگا، تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا، اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب آرمینیہ کے [illegible] سے فتح ہوئے، تو سپہ سالار نے معاہدہ میں یہ الفاظ لکھے، ان ینفروا لکل غارۃ وینفذوا لکل امر ناب اولم ینب رآہ الوالی صلاحا علی ان توضع الجزاء عمن اجاب الی ذالک ومن استغنی عنہ منہم وقعد فعلیہ مثل ما علی اہل آذربائیجان من الجزاء، یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ یہ لوگ جب لڑائی چھڑ جائے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں، اس صورت میں ان پر جزیہ نہیں لگایا جائیگا لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وہ بیٹھ رہے تو اس کو آذربائیجان والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا، اسی معاہدہ میں یہ لفظ بھی ہے، اور وہ صاف صاف ہمارے دعویٰ کی توضیح ہے، والحشر عوض من جزائہم یعنی لڑائی میں ذمیوں کا شریک ہونا، جزیہ کا قائم مقام ہے[1]، خود حضرت عمرؓ نے متعدد دفعہ یہ احکام بھیجے تھے، کہ اگر ذمی سے اتفاقیہ کسی موقع پر مدد لو، تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دو، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جرجان وغیرہ ممالک میں جو معاہدہ ہوا، اس میں یہ الفاظ تھے، ومن استعنا بہ منکم فلہ جزاءہ فی معونتہ عوضا عن جزاءہ، یعنی ہم اگر کسی ذمی سے اعانت لیں گے تو اس اعانت کے بدلے میں جزیہ چھوڑ دیا جائے گا،

معاہدات میں یہ تصریح کہ جزیہ کے عوض میں ہم تمہاری اندرونی و بیرونی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، جب حفاظت پر قدرت نہ ہو تو جزیہ واپس کر دینا، جو قومیں فوجی خدمت پر آمادہ ہوں ان کو جزیہ سے بری رکھنا، کیا ان واقعات کے ثابت ہونیکے بعد بھی شبہہ رہ سکتا ہے، کہ جزیہ کا مقصد وہی تھا، جو ہم نے تیسری بحث کے آغاز میں بتایا ہے،

جزیہ کے مصارف یہ تھے، لشکر کی آراستگی، سرحد کی حفاظت، قلعوں کی تعمیر، ان سے بچا تو سڑکوں اور پلوں کی تیاری، سررشتۂ تعلیم، بے شبہہ اس طرح اس خاص رقم سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہونچتا تھا، اور پہونچنا چاہیے تھا، مسلمان لڑائیوں میں شریک ہوتے، جانیں لڑاتے، ملک کو تمام خطروں سے بچاتے تھے،

---

[1] تاریخ کبیر طبری،

پس جس طرح ان کے جسم وجان سے ذمی رعایا مستفید ہوتی تھی، اگر ذمیوں کے مال سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہو تھا، تو کیا بے جا تھا، اس کے علاوہ صدقہ کی رقم جو خاص مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی، اس میں ذمی رعایا برابر کی شریک تھی، حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال کے داروغہ کو لکھ بھیجا تھا کہ خدا کے اس قول میں اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ، صدقات فقیروں اور مسکینوں کیلئے ہیں، مسکینوں سے عیسائی اور یہودی مراد ہیں۔[1]

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۴۸ روپیہ سالانہ تھی، کسی کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو اس سے زیادہ دینا نہیں پڑتا تھا، عام شرح چھ روپے اور تین روپے سالانہ تھی، بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہو، یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے، اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پرخطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیروان عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے، جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے، کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے، جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیئے، کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے مضمون کے عنوان سے یہ بحث کسی قدر دور پڑ جاتی ہے، اس لیے اس موقع پر ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے،

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ

(سنہ ۱۸۸۹ء)

میکینکس اور مسلمان

میکینکس یونانی لفظ ہے، انگریزی میں یہی لفظ مشین بن گیا ہے، جس کو ہماری زبان میں کل سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ فن آج کل اگرچہ بے انتہا ترقی کر گیا ہے، لیکن اس کا وجود بہت قدیم زمانہ سے ہے، یونان میں وہ علمی حیثیت سے حاصل کیا جاتا تھا، اور مسلمانوں نے جب یونان کے علوم و فنون سیکھے، تو صرف علم پر قناعت نہیں کی بلکہ اس فن سے عملی کام بھی لیے، عربی زبان میں اس کا نام علم الحرکات اور علم الحیل ہے، لیکن یونان کا اصلی لفظ بھی صورت بدل کر مستعمل ہے، لفظ منجنیق جو عربی اور فارسی میں کثرت سے مستعمل ہے وہ اس کے اشتقاق کے بیان میں ہمارے علمائے لغت نے سخت غلطیاں کی ہیں، در اصل اسی یونانی لفظ میکانک کا معرب ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ منجنیق کا استعمال اب عام حیثیت سے نہیں رہا، بلکہ ایک خاص آلہ کا نام رکھ دیا گیا ہے،

مسلمانوں میں اس فن کی ابتدا اس وقت سے ہوئی، جب دولت عباسیہ میں یونانی تصنیفات ترجمہ ہونی شروع ہوئیں، چنانچہ اور علوم و فنون کے ساتھ اس فن کی بھی تمام کتابوں کا ترجمہ ہو گیا، ان میں سے ہم کو جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے، ان کی تفصیل ذیل میں ہے،

کتاب عمل الآلات التی تطرح الماء درق تصنیف ارشمیدس،

کتاب الدوائر والدوالیب تصنیف ایرن حلّا جار،

کتاب فی الاشیاء المتحرکہ من ذاتہا تصنیف ایرن

کتاب آلۃ الزمر ابولونی، کتاب آلۃ الزمر المرجی،

کتاب الدوالیب تصنیف مارطس،

مستشرقین جلد (۱)

کتاب الارغنون[1]

کتاب ایرن فی البحر الثقیل

ان کتابوں میں سے اول اور آخر کتاب آج بھی لندن کے کتب خانہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، پہلی کتاب میں تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں[2]، یونانی تصنیفات سے مطلع ہوکر مسلمانوں نے خود اس فن میں نئی نئی باتیں اختراع کیں اور مستقل اور جدید کتابیں لکھیں، بنو موسیٰ نے جو مامون کے دربار کے مشہور فلاسفر تھے، اس فن میں جو کتاب لکھی اور جس کا نام غلطی سے کتاب الحیل مشہور ہوگیا، نہایت محققانہ اور ایجادانہ کتاب ہے، مورخ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں کئی طرح کے مکانیکل عمل کا بیان ہے، مورخ ابن خلکان نے جو ساتویں صدی ہجری میں موجود تھا، لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا ہے، اس میں عجیب عجیب نادر باتیں ہیں اور اس فن کی تمام کتابوں سے افضل ہے۔

پروفیسر سیدیو (Setiuat) جو فرانس کا مشہور مصنف ہے، اپنی کتاب (Historic GeneratbdUSArabes) صفحہ ۲۴۹ جلد دوم میں لکھتا ہے، کہ ہم کو اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں مکینکس کا فن کمال کی کس حد تک پہنچ گیا تھا۔

پروفیسر لیبان فرانسیسی (Lebone) اپنی کتاب لاسٹ لیٹرسن ڈس عربس میں لکھتا ہے کہ عربوں کو مکینکس کی اور خصوصاً عملی مکینکس کی بہت واقفیت تھی، وہ آلات جو ان کے بنائے ہوئے آج بھی ہم کو مل سکتے ہیں اور وہ واقعات جو ان کے متعلق قدیم مورخوں نے لکھے ہیں، ان سے عربوں کی لیاقت کا ایک بلند خیال پیدا ہوتا ہے، یہ امر یقینی ہے کہ عرب کے پاس پنڈلم (لنگر) والی گھڑیاں تھیں، جو پانی کی گھڑیوں سے بالکل مختلف تھیں، یہ بات ان بیانات سے جو چند مصنفوں نے لکھے ہیں، ثابت ہوتی ہے، خصوصاً طالید (Indeta) بنجمن صاحب کے بیان سے جو بارہویں صدی عیسوی میں فلسطین گیا تھا اور جس نے دمشق کی مسجد

---

[1] دیکھو کتاب الفہرست مطبوعہ یورپ ص ۲۸۵ [2] دیکھو فہرست کتب عربی موجودہ کتب خانہ برٹش میوزیم بہ زبان لاتن ص ۶۱۹ [3] کتاب الفہرست مطبوعہ یورپ ص ۲۸۵

کی گھڑی کا حال لکھا ہے[1]۔

سب سے پہلی ایجاد اس فن کے متعلق جو بیان کی جاتی ہے، وہ وہ گھڑی ہے جو ہارون الرشید نے شارلمین شہنشاہ فرانس کو بھیجی تھی، یورپ کے اکثر مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور پروفیسر سیدیو نے میکانیکس کی ترقی کے ثبوت میں اس گھڑی کا نام لیا ہے، ان مورخوں کا بیان ہے کہ اس گھڑی میں چھوٹے چھوٹے بارہ دروازے تھے، ہر گھنٹہ کے گزرنے پر گھنٹوں کی تعداد کے موافق دروازے کھلتے تھے اور اسی تعداد کے موافق تانبے کی گولیاں ایک آہنی توے پر گر کر آواز دیتی تھیں، یہ دروازے برابر کھلے رہتے تھے یہاں تک کہ جب دورہ پورا ہو جاتا تھا تو بارہ سوار دروازوں سے نکل کر گھڑی کی بالائی سطح پر چکر لگاتے تھے۔

مسٹر پامر نے اس گھڑی کے وجود سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ عرب کے مورخ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتے، لیکن مسٹر پامر کو معلوم نہیں کہ مورخین عرب نے سیکڑوں ہزاروں واقعات قلم انداز کر دیے ہیں جن کا ثبوت اور اور طریقوں سے قطعاً معلوم ہے، مورخین عرب نے تو سرے سے شارلمین کی سفارت ہی کا ذکر نہیں کیا ہے، کیا مسٹر پامر کو اس سے بھی انکار ہوگا، یورپ کے مورخوں نے جو اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، نہایت قوی حوالوں کے ساتھ کیا ہے، مثلاً پروفیسر سیدیو نے مارٹجنی (Maritigny) اور ارنجی ٹارٹ (Eginrsarty) کی تصنیفات کی شہادت پیش کی ہے اور آخر الذکر شخص خود شہنشاہ شارلمین کے زمانہ میں موجود تھا۔

البتہ یہ تعجب ہے کہ ہارون الرشید نے شارلمین کو جو تحفے بھیجے تھے، وہ اب تک فرانس کے معبد پانیتون میں موجود ہیں، لیکن گھڑی کا پتہ نہیں، احمد ذکی مصری جس نے ۱۸۹۲ء میں یورپ کا سفر کیا، وہ اس عمارت کے ذکر میں لکھتا ہے کہ یہاں ایک مشرقی سیاح کے لیے جو چیز زیادہ دلچسپی کا سبب ہو سکتی ہے وہ وہ کمرہ ہے جس کی دیواروں پر شارلمین کی تصویر اس ہیئت سے بنائی گئی ہے کہ وہ ہارون الرشید کی سفارت کا استقبال کر رہا ہے اور سفارت کے ہاتھ میں بیت المقدس کی کنجیاں ہیں، جو ہارون الرشید کو شارلمین نے تحفہ میں بھیجی ہیں، یہاں دو ریشمی پردے بھی ہیں، جن کی قیمت چونسٹھ ہزار روپیے ہیں۔

---

[1] دمشق کی مسجد کی گھڑی کا حال آگے کسی قدر تفصیل سے آتا ہے۔

بہرحال اس گھڑی کا وجود ثابت ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ مسلمانوں کے عہد میں اور بہت سی گھڑیاں اور میکانیکل آلات تیار ہوئے ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ہم اس موقع پر کرتے ہیں،

علامہ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں شام و حجاز کا سفر کیا تھا، اپنے سفرنامہ میں دمشق کی جامع مسجد کے ذکر میں ایک گھڑی کا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے، کہ "باب جیرون کی دیوار میں طاق کی شکل کا ایک دریچہ ہے اور اس میں بارہ چھوٹے پیتل کے طاقچے ہیں، ان طاقچوں میں بارہ بارہ چھوٹے چھوٹے دروازے ہیں، پہلے اور طاقچے کے نیچے دو باز بنے ہوئے ہیں، جو پیتل کی تھالیوں پر کھڑے ہیں، جب ایک گھنٹہ گذرتا ہے تو دونوں باز اپنی گردنیں بڑھاتے ہیں، اور اپنی چونچ سے اُن تھالیوں میں اس انداز سے پیتل کی گولیاں گراتے ہیں، کہ جادو معلوم ہوتا ہے، گولیوں کے گرنے سے گونج پیدا ہوتی ہے، اور طاقچہ کا دروازہ جو اس گھنٹہ کے لیے بنا ہے، خود بخود بند ہو جاتا ہے، اسی طرح جب ایک دن پورا ہو جاتا ہے، تو تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں،

دنیا میں اول اول جب گھڑی کی ایجاد ہوئی، تو اس سے صرف گھنٹہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا، لیکن جتنے گھنٹے گذر چکے تھے، ان کی تعداد معلوم نہیں ہو سکتی تھی، مسلمانوں میں بھی اول اول اس قسم کی گھڑیاں رائج ہوئیں، دمشق کی اس گھڑی میں دونوں باتیں دو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتی تھیں، یعنی گھنٹہ کے گذرنے کی اطلاع گولیوں سے ہوتی تھی، جو مصنوعی بازوں کے منہ سے گرتی تھیں، اور گھنٹوں کی تعداد دروازوں سے معلوم ہوتی تھی، کیونکہ جتنے گھنٹے گذرتے تھے، اسی تعداد کے موافق دروازے خود بخود بند ہو جاتے تھے،

اس گھڑی میں رات کے لیے اور تدبیر تھی، اور وہ یہ کہ جو دائرہ ان طاقچوں کے گرد تھا، اس میں تانبے کے بارہ حلقے بنے ہوئے تھے، ہر حلقہ میں دیوار کی طرف شیشہ لگا ہوا تھا، شیشوں کے پیچھے شمع تھی، جو پانی کے ذریعہ سے حرکت کرتی تھی، شمع گھنٹوں کی ترتیب کے موافق ان حلقوں کے سامنے آتی جاتی تھی، اور جس حلقہ کے سامنے آتی تھی، وہ سرخ دکھائی دینے لگتا تھا، یہاں تک کہ صبح ہوتے ہوتے تمام حلقے سرخ ہو جاتے تھے،[1]

---

[1] سفرنامہ ابن جبیر مطبوعہ یورپ ص ۲۷۱ و ص ۲۷۲،

خلیفہ المستنصر باللہ عباسی المتوفی ۶۴۰ھ نے بغداد میں جو مشہور مدرسہ قایم کیا تھا اور جس کا نام مستنصریہ تھا، اس کے لیے ایک نہایت عجیب وغریب گھڑی تیار کرائی تھی، اس گھڑی کی صورت یہ تھی کہ لاجورد کا ایک حلقہ آسمان کی شکل کا بنایا تھا اور اس میں ایک آفتاب تھا جو برابر حرکت کرتا رہتا تھا، علامہ ابن جوزی نے اس گھڑی کی تعریف میں یہ چند اشعار لکھے ہیں:

تھدی الی الطاعات ساعاتہ — الناس وبالنجم ھم یھتدون

صور فیہ فلک دائرہ — والشمس تجری مالھا من سکون

دائرۃ من لا زورد حلت — نقطۃ تبر فیہ سر مصون[۱]

گھڑیوں کے سوا اس قسم کے اور آلات کا بھی پتہ لگتا ہے، سلطان عبد المومن جو مراکش کا مشہور بادشاہ گزرا ہے، اس کو حضرت عثمانؓ کے ان قرآنوں میں سے ایک قرآن مجید ہاتھ آ گیا تھا، جو انہوں نے اپنے اہتمام سے لکھوا کر مصر وشام وبصرہ وکوفہ میں بھجوایے تھے، عبد المومن نے اس قرآن کی نہایت قدر کی اور اس کے لیے ایک کل کا صندوق تیار کرایا، جس کی کیفیت علامہ مقری نے اس طرح لکھی ہے، "یہ صندوق عجیب حکمت سے بنایا گیا تھا، جب اس میں کنجی ڈال کر پھراتے تھے تو اس کے پٹ کھل جاتے تھے اور اندر سے ایک خانہ نکلتا تھا، جس میں ایک رحل ایک کرسی پر رکھی ہوتی تھی، رحل بغیر کسی کے ہاتھ لگایے خود کھلتی تھی، جب رحل اور چوکی بالکل باہر آ جاتی تھی تو خانہ ازخود بند ہو جاتا تھا، کنجی جب الٹی طرف پھیرتے تھے تو خانہ پھر کھل جاتا تھا اور چوکی اور رحل خود صندوق میں جا کر بند ہو جاتی تھیں[۲]۔

البتہ یہ افسوس ہے کہ اس فن سے کوئی بڑا کام نہیں لیا گیا، نہ عام پبلک کاموں میں اس سے کچھ مدد لی گئی، علم جرثقیل پر مسلمانوں کی مستقل تصنیفات موجود ہیں، لیکن ہم کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے ہر حصہ میں جو بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں، ان میں کبھی جرثقیل سے کام لیا گیا، خلیفہ المتوکل باللہ عباسی کے عہد میں کچھ خفیف سا پتہ چلتا ہے، لیکن وہ اس قدر غیر معین اور مشتبہ ہے کہ ہم اس موقع پر اس کا ذکر نہیں کر سکتے۔ (رسائل شبلی مطبوعہ امرتسر)

---

۱ یہ تمام تفصیل آثار البلاد قزوینی میں ہے، دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ ۱۸۴۸ء مقام جرمنی ص ۲۱۱

۲ نفح الطیب مطبوعہ یورپ جلد اول ص ۴۰۵۔

حقوق الذمیین

یعنی

اسلام میں غیر مذہب والوں کے حقوق

دنیا کے عجیب سے عجیب واقعات کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے، تو یہ واقعہ ضرور اس میں درج کرنے کے قابل ہوگا، کہ مسلمانوں کے متعلق اگرچہ یورپ کی واقفیت کے ذریعے نہایت وسیع ہوگئے ہیں، اور ہوتے جاتے ہیں، اسلامی آبادیوں کا بہت بڑا حصہ اس کے قبضہ میں آگیا ہے، سیکڑوں عربی داں علماء پیدا ہوگئے ہیں، عربی تصنیفات کثرت سے یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں، مسلمانوں کے نہایت نایاب تاریخی ذخیرے اصلی زبان میں شائع ہوتے جاتے ہیں، اورینٹل کانفرنس نے مشرق اور مغرب کا ڈانڈا ملادیا ہے، تاہم غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے افق پر چھایا تھا، اب تک نہیں ہٹا، بہت سے بہت یہ ہوا کہ وہ کسی قدر ہلکا ہوگیا ہے، لیکن فضا میں اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىھَا (ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا) یہ غلط معلومات اوّل اوّل مذہبی راستے سے آئے تھے، اور چونکہ یورپ میں مذہب کا زور خود گھٹ گیا ہے، اس لیے مذہبی حیثیت کے لحاظ سے اب ان کا اثر بھی چنداں قوی نہیں رہا، تاہم جب کبھی پولیٹکل ہوا چلتی ہے، تو یہ دبی چنگاریاں اس قدر جلد بھڑک اٹھتی ہیں کہ تمام یورپ میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے،

آرمینیا کے جھگڑے میں ترکوں پر جو مشتبہ الزامات لگائے گئے ابھی اس کی تحقیق بھی نہیں شروع ہوئی تھی، کہ یورپ کے اہل قلم نے دنیا میں غلغلہ ڈال دیا، کہ خود مسلمانوں کے مذہب میں عیسائی رعایا سے ایسا سلوک

کرنا جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس وجہ سے یہ یقین کرتا کہ ترکوں نے وہ تمام ظالمانہ کارروائیاں کی ہوں گی، گویا اس بات کا یقین کرنا ہے کہ ترک اپنے مذہب کے پابند ہیں اور یورپ ہے پابند ہیں۔

اسی سلسلہ میں ٹائمس [illegible] مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۹۵ء میں پادری ملکم مکال نے بڑے دعوے کے ساتھ ایک آرٹیکل لکھا [illegible] پایا کہ مذہب اسلام، عیسائیوں کے حق میں نہایت سخت ظالمانہ قانون ہے، اور اسلامی حکومتوں [illegible] قانون پر عمل درآمد رہا ہے، دلی کے مشنریوں نے اس آرٹیکل کا ترجمہ چھاپ کر شایع کیا، اور دیباچہ [illegible] تمہید لکھی کہ "یہ آرٹیکل اس قدر مدلل اور پرزور ہے کہ خود ٹائمس کا وہ مسلمان مضمون نگار جو مذہب اسلام کی حمایت میں مضامین کا سلسلہ لکھ رہا تھا، اس آرٹیکل کے بعد بالکل بند ہو گیا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔"

آج کل کے مصنفین اسلام نے یورپ کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان مسئلہ پر توجہ نہیں کی، کتب خانہ اسکندریہ، عورتوں کے حقوق، جزیہ، یہ سب جزئی مباحث ہیں، لیکن ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے، کہ اگر اسکا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا، میں یہ مضمون اسی خیال سے لکھتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ یہ بھی اسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا، جس طرح اس سے پہلے کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو چکی ہے،

اس رسالہ کا موضوع جس پر بحث کا تمام سلسلہ قائم ہے یہ ہے کہ اسلام میں ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ یہ جملہ تین لفظوں پر مشتمل ہے، اسلام، ذمی، حقوق، اسلام سے ہماری مراد قرآن یا وہ احادیث نبوی ہیں، جن کی صحت اصول حدیث کی رو سے ثابت ہو چکی ہے، ذمی ان رعایا کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں آباد ہوں، اور جن کا مذہب اسلام نہ ہو، لفظ حقوق کی تفسیر کی ضرورت نہیں، موضوع کے جو الفاظ ہیں اگرچہ ان کی تشریح یہی ہے، جو ہم نے کی، لیکن ہمارا دعویٰ اس سے زیادہ وسیع ہے جو موضوع سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی جس طرح ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مذہب اسلام نے ذمیوں کے حقوق نہایت فیاضی سے قائم کیے، اسی طرح ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ صرف تحریری قانون نہ تھا، بلکہ تیرہ سو (۱۳۰۰) برس کی وسیع مدت میں من حیث الاغلب طریق

عمل بھی اسی کے مطابق رہا،

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یعنی آغاز نبوتؐ سے فتح مکہ تک جو سنہ میں واقع ہوئی لڑائیوں کا ایک ایسا متصل سلسلہ قائم رہا، جس کی وجہ سے یہ موقع ہی نہیں نصیب ہوا کہ اسلام کو حکومت اور سلطنت کی حیثیت حاصل ہوتی، اور رعایا کے ساتھ سلطنت کو جو تعلقات ہونے چاہئیں، اُس کے متعلق قانون اور قاعدے منضبط ہوتے، قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے اس باب میں جن احکام کا پتہ لگتا ہے، وہ خاص مسلمانوں سے متعلق ہیں، یعنی غیر مذہب والوں سے ان کو واسطہ نہیں، اس وقت تک غیر مذہب والوں سے جو تعلقات پیدا ہوئے تھے، وہ اسی قدر تھے کہ کسی قوم سے کچھ معاہدہ ہو گیا، کسی سے چند شرائط کے ساتھ صلح ہو گئی، مختصر یہ کہ اس وقت تک غیر مذہب والے اسلام کی رعایا نہیں کہلاتے تھے، خیبر کی آبادی فتح ہو کر بھی صرف اسی قدر ہوا کہ یہودیوں سے بٹائی پر معاملہ ہو گیا، اور زمین ان کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی، فتح مکہ کے بعد یمن، بحرین، عمان، عدن وغیرہ فتح ہوئے، ان اضلاع میں کثرت سے دوسری قومیں یعنی یہود، عیسائی، پارسی آباد تھے، چونکہ اس وقت امن وامان قائم ہو چکا تھا، اور اسلام کو پوری قوت حاصل ہو چکی تھی، اسلام نے صاف صاف ان کو رعایا کے لقب سے پکارا، اور خود ان کو بھی اس لقب سے عار نہیں رہا، لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے مجموعۂ احکام نافذ ہونے کے بجائے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ان پر جزیہ مقرر کیا گیا، اور اس کے معاوضے میں ان کو چند حقوق دیئے گئے، سب سے پہلے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً سنہ میں نجران کے عیسائیوں پر جزیہ مقرر ہوا، ان کے بعد ایلہ، اذرح، اذرعات وغیرہ وغیرہ پر بھی جزیہ لگایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تمدن سلطنت کا آغاز تھا، اور اس وجہ سے تاریخوں میں مسلمان یا ذمی رعایا کے حقوق کی تفصیل نہیں مل سکتی، تاہم اس معاملے کے متعلق جس قدر سرمایہ مل سکے، اس کو نہایت تلاش سے مہیا کرنا چاہیے، کیونکہ گو وہ مختصر اور سادہ ہوں، لیکن ان سے حقوق الذمیین کے قانون کے اصول معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ زمانۂ مابعد میں ذمیوں کے متعلق جو مفصل قانون بنا، اس کا مایۂ خمیر کیا تھا،

بانیٔ اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا، اُن کو تحریر کے ذریعے سے

[1] فتوح البلدان ص ۶۵،

مفصلۂ ذیل حقوق دیے ۔

(۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا، تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں ۔ یمنعوا[1]

(۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا ، خاص الفاظ یہ ہیں : لایفتنوا عن دینھم ،

(۳) جزیہ جو ان سے لیا جائے گا، اس کے لیے محصّل کے پاس خود جانا نہیں پڑے گا ،

(۴) اُن کی جان محفوظ رہے گی ،

(۵) ان کا مال محفوظ رہے گا ،

(۶) ان کے قافلے اور کارواں (یعنی تجارت) محفوظ رہیں گے ،

(۷) ان کی زمین محفوظ رہے گی ،

(۸) تمام چیزیں جو ان کے قبضہ میں تھیں بحال رہیں گی ،

(۹) پادری رہبان ، گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیے جائیں گے ،

(۱۰) صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہونچایا جائے گا ،

(۱۱) ان سے عشر نہیں لیا جائے گا ،

(۱۲) ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی ،

(۱۳) پہلے سے ان کا جو کچھ مذہب اور عقیدہ تھا ، وہ بدلوایا نہیں جائے گا ،

(۱۴) ان کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا ، زائل نہیں ہوگا ،

(۱۵) جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں ، یہ احکام ان کو بھی شامل ہوں گے ،

پہلی اور دوسری دفعہ کے سوا باقی تمام حقوق جس معاہدے سے قائم ہوتے ہیں ، وہ ذیل میں بعینہٖ منقول ہے

ولنجران وحاشیتھا جوار اللہ وذمۃ محمد النبی رسول اللہ علی انفسھم وملتھم وارضھم واموالھم وغائبھم وشاھدھم وغیرھم وبعثھم وامثلتھم لایغیر ما کانوا علیہ

[1] فتوح البلدان ص ۵۹ ،

ولا یغیر[10] حق من حقوقھم وامثلتھم لا یغیر[11] اسقف من اسقفیتہ ولا راھب من رھبانیۃ
ولا واقہ من وفاھیۃ علی ما تحت[12] ایدیھم من قلیل او کثیر ولیس[13] علیھم رھق ولا دم[14]
جاھلیۃ ولا یحشرون[15] ولا یعشرون[16] ولا یطاء[17] ارضھم جیش[1] الخ

ذمیوں کے متعلق اسلام کا جو اصلی قانون ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں، کیونکہ اسلام صرف ان مسائل اور احکام کا نام ہے، جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں، اس کے سوا جو کچھ ہے، گو اس نے قوم میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو، لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہیں ہے،

ذمیوں کے حقوق کے متعلق اگرچہ یہ مختصر قواعد ہیں، اور اسلام کو ابتدائی زمانہ میں غیر قوموں کے ساتھ جس قدر کم تعلق پیدا ہوا تھا، اس کے لحاظ سے اس سے زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، تاہم انہی قواعد میں نہایت اہم باتوں اور امور کا ماخذ موجود ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ذمیوں کے حقوق کے متعلق گو کتنا ہی مفصل مجموعۂ قوانین بنایا جاوے، لیکن اس کی جزئیات ان اصول سے باہر نہیں جا سکتیں،

اب ہم نہایت تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں، کہ زمانۂ مابعد میں جب کہ غیر قوموں سے نہایت وسیع اور قوی تعلقات قائم ہو گیے، ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومتوں کا طرز عمل کیا رہا؟ سب سے زیادہ جس زمانے کے واقعات اس بحث کے تصفیہ کے لیے کام آ سکتے ہیں، وہ خلافت فاروقی کے واقعات ہیں، ان کی خلافت کا زمانہ ایک ممتد زمانہ ہے، اوّل اوّل انہی کے وقت میں غیر قوموں کے ساتھ سلطنت و رعیت کے تعلقات قائم ہوئے، ان کی نسبت مخالفوں نے کہا ہے کہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ سختی سے برتاؤ کرتے تھے، ان کے عہد میں رعایا کے جس قدر حقوق قائم ہو سکتے ہیں، ہو چکے تھے، اور ہر ایک حق کی نسبت صاف صاف فیصلہ کر دیا گیا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی حکومت اسلامی حکومت کی اصلی تصویر خیال کی جاتی ہے،

حقوق میں سب سے مقدم قصاص کا حق ہے، یعنی یہ کہ قتل و خون کے معاملہ میں فاتح اور مفتوح کے حقوق برابر سمجھے جائیں، آج جن ملکوں میں تمدن اور تہذیب کی حکومت ہے، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس مساوات کو قائم رکھا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے یا عمل کے ذریعہ سے؟ میں ان کا فیصلہ ان لوگوں پر

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۷۵، قاضی ابو یوسف نے بھی اس معاہدہ کو کتاب الخراج میں نقل کیا ہے،

چھوڑتا ہوں جو رات دن اپنی آنکھوں سے اس کی مثالیں دیکھتے رہتے ہیں، اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا،

قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا تھا، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی، انھوں نے لکھ بھیجا کہ "قاتل مقتول کے وارثوں کو حوالہ کر دیا جائے" چنانچہ قاتل حنین نام ایک شخص کو جو مقتول کے وارثوں میں تھا سپرد کر دیا گیا، اور اس نے اس کو قتل کر دیا[1] جہاں تک ہمیں معلوم ہے، حضرت عمرؓ کے اس طریق عمل سے کسی زمانہ میں اختلاف نہیں کیا گیا، بلکہ حضرت علیؓ نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا کہ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا و دیتہ کدیتنا یعنی "جو لوگ ذمی ہو چکے ان کا خون ہمارا خون ہے، اور ان کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے، حضرت علیؓ کو یہ موقع خود بھی پیش آیا اور انھوں نے صاف حکم دے دیا کہ قاتل جو مسلمان تھا قتل کر دیا جائے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مقتول کے وارثوں نے آکر عرض کیا کہ ہم نے خون معاف کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا[2]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جن کو دوسرا عمرؓ کہا جاتا ہے، ان کے عہد میں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا، اور انھوں نے بھی یہی حکم دیا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ وارثوں نے اس کو بے تکلف قتل کر دیا[3]

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ولید بن عقبہ جو صحابی تھے، کوفہ کے گورنر تھے، ایک دفعہ ایک یہودی نے ان کے سامنے شعبدہ بازی کے تماشے دکھائے، اس وقت اور بہت سے تماشائی موجود تھے، ان میں جندب بن کعب ازدیؒ بھی تھے، جو بڑے مشہور تابعی ہیں، اور صحیح ترمذی میں ان کی روایتیں منقول ہیں، وہ ان شعبدوں کو شیطان کا اثر سمجھے، اور یہودی کو قتل کر دیا، ولید نے اسی وقت ان کو گرفتار کر لیا، اور یہودی کے قصاص میں قتل کر دینا چاہا، لیکن چونکہ وہ بڑے جتھے کے آدمی تھے، ان کے قبیلے والے ان کی حمایت کو کھڑے ہو گئے، ولید نے اس وقت دفع الوقتی کے لیے ان کو قید خانہ بھیج دیا اور ارادہ کیا کہ موقع پا کر قتل کر دیں گے، داروغہ جیل کو ان پر رحم آیا اور کہا کہ تم چپکے سے بھاگ جاؤ، انھوں نے کہا کیوں؟ کیا درحقیقت میں قتل کر دیا جاؤں گا، داروغۂ جیل نے کہا، خدا کی خوشنودی کے لیے تمہارا قتل کر دینا کچھ بڑی بات نہیں، غرض وہ بھاگ گئے، صبح کو

[1] زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعۂ دہلی صفحہ ۲۳۰ و ۳۳۹، [2] زیلعی ص ۲۸، [3] ایضاً،

ولید نے جندب کو قصاص کے لیے طلب کیا، داروغہ نے کہا کہ وہ تو چھپ کر بھاگ گیا، ولید نے اس کے بدلے داروغہ کی گردن ماردی[1] ہم کو اس امر سے بحث نہیں کہ داروغہ جیل کا قتل کر دینا جائز تھا یا نہیں، بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ باوجودیکہ جندب بڑے رتبہ کے آدمی تھے، اور یہودی ایک معمولی بازیگر تھا، تاہم ولید کو ایک حکم شرعی کی تعمیل کے لحاظ سے جندب کے قتل کر دینے میں کچھ تامل نہ ہوا،

اسی سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بھی سننے کے قابل ہے، حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام فیروز تھا، جو مجوسی النسل تھا، اور عیسائی مذہب رکھتا تھا، حضرت عمرؓ کے بڑے بیٹے عبید اللہ سے لوگوں نے بیان کیا کہ اور لوگ بھی اس سازش میں شریک تھے، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰنؓ نے چشم دید واقعہ بیان کیا، عبید اللہؓ تلوار ہاتھ میں لے کر نکلے اور فیروز کے بیٹے اور جفینہ و ہرمزان کو جن پر سازش کا شبہہ تھا، قتل کر دیا، ان میں سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا، باقی عیسائی تھے، عبید اللہ اسی وقت گرفتار کر لیے گئے، اور حضرت عثمانؓ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ عبید اللہؓ کی نسبت کیا کرنا چاہیے، حضرت عثمانؓ نے صحابہ کو بلا کر رائے طلب کی، تمام مہاجرین یعنی ان بزرگوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے، اور جو مذہبی پابندی میں سب سے زیادہ پکے جاتے تھے، یک زبان ہو کر کہا کہ عبید اللہؓ کو قتل کر دینا چاہیے[2] حضرت علیؓ بھی اس مجمع میں موجود تھے، اور انھوں نے بھی یہی رائے دی، اگرچہ حضرت عثمانؓ بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے، اور (جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے) حضرت عثمانؓ کی خلافت کی یہ پہلی کمزوری تھی، تاہم انھوں نے تینوں مقتولوں کے بدلے بیت المال سے خون بہا دلایا، شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ لوگوں نے عبید اللہ کا قتل کیا جانا جو تجویز کیا تھا، وہ ہرمزان کے قصاص میں تھا اور ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا، لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، اولاً تو روایتوں میں اس قسم کی تخصیص کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے تینوں کا جو خون بہا دلایا، اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی،

ہم کو جہاں تک معلوم ہے، اسلام کی تمام تاریخ میں اس کے خلاف کوئی مثال نہیں ہے، بعض مسلمان

---

[1] مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ کتاب الاوائل میں اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ [2] مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ کتاب الاوائل میں بھی اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے،

مورخوں نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک مسلمان نے کسی ذمی کو مار ڈالا، قصاص میں مسلمان ماخوذ ہوا، لیکن کسی خاص وجہ سے ہارون الرشید کو اس کی رعایت منظور تھی، اور اس لیے اس نے چاہا کہ وہ قتل سے بچ جائے، چنانچہ قاضی ابویوسفؒ صاحب کو بلاکر اس کی تدبیر پوچھی، قاضی صاحبؒ نے فرمایاکہ شہادت سے یہ ثابت نہیں کہ وہ مارے جانے کے وقت بھی قانوناً ذمی تھا، اگرچہ ہمارے نزدیک یہ واقعہ ثابت نہیں، تاہم اگر اس کو مان لیا جائے تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل سے بچانا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس کے حیلہ پیدا کرنے کے لیے قاضی ابویوسفؒ جیسے شخص کی ضرورت پڑی، اور وہ بھی اس کے سوا کچھ حیلہ نہ بتا سکے کہ اسکا ذمی ہونا مشتبہ ٹھہرائیں،

مال اور جائداد کے حقوق جن کو انگریزی میں "رائٹ آف پراپرٹی" اور "رائٹ آف لینڈ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں بھی مسلمان اور ذمی برابر درجہ رکھتے تھے، ذمیوں کے قبضہ میں جس قدر زمینیں تھیں، اسلام کے بعد عموماً بحال رکھی گئیں، یہاں تک کہ اگر خلیفۂ وقت یا بادشاہ کو مسجد یا کسی اور عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو معاوضہ دیکر لی جاتی تھی،

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لیے ایک رمنہ بنانا چاہا، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جو بصرہ کے گورنر تھے، لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو، اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنووں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے۔[1] خلیفہ منصور عباسی نے جب بغداد کو دارالخلافہ بنانا چاہا تو آس پاس کی قومیں جو وہاں کی زمیندار تھیں، ان سے قیمت دیکر زمین مول لی،[2] حیرہ میں قدیم زمانہ کے محل اور ایوان تھے جو اسلام کے زمانہ میں ویران ہو چکے تھے، حضرت عمرؓ کے عہد میں کوفہ میں جو جامع مسجد بنی، اس میں کچھ ملبہ وہاں کے مکانات سے آیا تھا، اگرچہ ان کا کوئی قانونی وارث نہ تھا، تاہم چونکہ ذمیوں کی زمین تھی، اس لیے ذمیوں کو ان کی قیمت ان کے جزیہ میں مجرا دی گئی،[3] اس کے سوا سیکڑوں واقعات ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ذمیوں کے مال اور جائداد سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا،

---

[1] فتوح البلدان ص ۳۰۱، [2] ایضاً ص ۲۹۵، [3] ایضاً ص ۲۸۶

آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ بڑے معرکہ کے ساتھ طے ہوگیا تھا، کہ غیر مذہب والے جو اسلام کی رعایا بن گئے ہیں، ان کی مقبوضہ زمینیں ان کے قبضہ سے نکالی نہیں جاسکتیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عراق فتح ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ جس قدر مفتوحہ زمین ہے اہل فوج کو تقسیم کردی جائے، حضرت عمرؓ نے انکار کیا، اور دیر تک بحث رہی، آخر یہ ٹھہرا کہ تمام مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے، چنانچہ ایک بڑا مجمع ہوا اور انصار میں سے دس شخص جو اپنے اپنے قبیلہ کے وکیل اور قائم مقام تھے مجمع میں حاضر ہوئے، تمام بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ وغیرہ بھی موجود تھے، حضرت عمرؓ نے کھڑے ہوکر نہایت توضیح سے اس مسئلہ کو بیان کیا، حضرت بلالؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ اب بھی مخالف رہے، لیکن عام رائے یہ ہوئی کہ ذمی اپنی زمینوں سے بے دخل نہیں کیے جاسکتے، حضرت بلالؓ اس پر بھی قائل نہیں ہوتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے جب قرآن مجید کی ایک آیت استدلال میں پیش کی تو ان کو مجبور ہونا پڑا، اور بلا اختلاف تمام صحابہؓ کے اتفاق سے یہ مسئلہ طے ہوگیا،[1]

اسی بناء پر فقہ کا یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ اگر بادشاہ یا امام وقت کسی زمانہ میں زمین کو ذمیوں کے قبضہ سے نکالنا چاہے، تو نہیں نکال سکتا، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

ولیس له ان یاخذ ما بعد	یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہیں کہ اس کے
ذالك منهم وهى ملك لهم	بعد ان سے زمین کو چھین لے، وہ زمین ان کی
يتوارثونها ويتبايعون	ملک ہے، ان میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی
	رہیگی، اور وہ اسکو خرید و فروخت کرسکتے ہیں

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جاگیرات کا ایک صیغہ قائم کیا تھا، یعنی حقوق اسلامی کے لحاظ سے جن کو مناسب سمجھتے تھے، اس کو جاگیر عطا کرتے تھے، لیکن چونکہ اراضیات بالکل ذمیوں کی مملوکہ تھیں، اور حضرت عمرؓ کو ان میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہ تھا، اس لیے اس غرض کے لیے خاص وہ زمینیں مخصوص کی تھیں جو کسی کی ملک نہ تھیں، چنانچہ اس قسم کی زمینیں حسب ذیل تھیں، جاگیرات خالصہ جو نوشیروان نے

---

[1] یہ پوری تفصیل کتاب الخراج ص ۱۴ و ۱۵ میں ہے،

خاندان شاہی کے لیے مخصوص کی تھیں، لاوارث اشخاص کی زمین، دریا برآمد، ڈاک خانہ کے متعلق زمین۔

اس کے ساتھ یہ اصول بھی قرار پایا کہ جو ملک بزور فتح کیا جائے۔ وہاں کے باشندوں کی جائداد فروخت کرنے پر بھی مسلمانوں کے ہاتھ منتقل نہیں ہوسکتی، یہ قاعدہ اگرچہ اس لحاظ سے مقرر ہوا تھا کہ مسلمان کے قبضہ میں آجانے سے زمین دہ یکی ہو جاتی ہے، اور خراج کو نقصان پہونچتا ہے، تاہم اس قاعدے نے ذمیوں کو بہت بڑا فائدہ یہ پہونچایا کہ زمین کسی حالت میں ان کے خاندان اور ان کی قوم کے قبضہ سے باہر نہیں جاسکتی تھی، چنانچہ اس کے خلاف اگر کبھی عمل ہوا تو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا گیا، امام لیث بن سعد نے مصر میں تھوڑی سی زمین مول لی تھی، اس پر وہاں کے بڑے بڑے علما، مثلاً ابن لہیعہ اور نافع بن یزید سخت معترض ہوئے[1]، عقبہ بن عامرؓ ایک بڑے بزرگ صحابی تھے، اور امیر معاویہؓ نے ان کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا، وہ مصر کے ایک گاؤں میں اپنی سکونت کے لیے مکان بنوانا چاہتے تھے، چنانچہ امیر معاویہؓ نے اس غرض سے ان کو ایک ہزار جریب زمین عطا کی، انہوں نے خراب اور افتادہ زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی انتخاب کی، اور جب ان کے نوکر نے کہا کہ کوئی عمدہ قطعہ لیجئے، تو انھوں نے کہا، یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ معاہدہ میں جو شرطیں ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ذمیوں کی زمین ان کے قبضہ سے نکالی نہیں جائے گی[2]، ان سب سے بڑھکر یہ کہ اکثر ممالک میں جو خراج ذمیوں پر مقرر کیا گیا، اس کے ساتھ یہ شرط بھی لکھدی گئی کہ آیندہ کبھی اس پر اضافہ نہ کیا جائے گا، خود مصر کے معاہدہ میں یہ شرط داخل تھی، چنانچہ امیر معاویہؓ نے جب مصر کے عامل وردان کو لکھا کہ خراج کے مقدار میں اضافہ کیا جائے، تو اس نے صاف انکار کیا، اور جواب میں لکھا کہ معاہدہ میں شرط ہوچکی ہے کہ خراج مقررہ پر اضافہ نہ ہوگا، اگرچہ اس میں شبہہ نہیں ہوسکتا کہ زمانۂ مابعد میں خراج کی مقدار بدلتی رہی، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اصل جمع پر اضافہ ہوا، بہت سی زمینیں نئی آباد ہوگئی تھیں، اور ان پر اضافہ ہونا خود مقتضائے انصاف تھا،

سب سے مقدم اور ضروری بحث مذہبی حقوق کی ہے، یورپ میں جس گروہ نے اسلام کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنا رکھا ہے، ان کی حوصلہ آزمائی کا بڑا جولان گاہ یہی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی بالکل نہیں ہے، اور قدیم اسلامی حکومتوں نے غیر قوموں کے مذہبی حقوق بالکل پامال کردیئے تھے، لیکن ہم دکھانا

---

[1] مقریزی ص ۲۹۵، [2] ایضاً ص ۲۰۸،

چاہتے ہیں، کہ اسلام نے تمام دنیا کی قوموں کو جس حد تک مذہبی آزادی دی، کبھی کسی قوم نے نہیں دی، نہ اب دینے کا دعویٰ کرسکتی ہے، یورپ دو سو برس پہلے تو مذہبی آزادی کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا، آج بے شبہ اس کو یہ دعویٰ ہے، مگر کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کو خود مذہب کی پروا نہیں رہی، بے شبہ یورپ گرجا اور مسجد کے جھگڑے میں انصاف کا پلہ برابر رکھتا ہے، لیکن اگر ایک سڑک اور مسجد کا معاملہ پیش آجائے تو مسجد بے تکلف برباد کردی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس فیاضی پر ناز ہے، وہ مذہبی آزادی نہیں بلکہ مذہبی بے پروائی کا اثر ہے،

مذہبی آزادی کے متعلق اسلام کا جو اصول ہے، ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجرانیوں کے معاہدوں میں تحریر فرمائے تھے، اور جس کو بتمامہا ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں نقل کرچکے ہیں، یعنی یہ کہ پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہیں گے، اور مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا جائے گا، یہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں، اور اس لیے دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں، اس سے یہ بھی قیاس ہوسکتا ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کے یادگار رکھتے، اس باب میں ان کا طرزِ عمل کیا رہا ہوگا؟ لیکن ہم صرف قیاس پر قناعت نہیں کرتے، تاریخ کی مستند کتابوں، مثلاً بلاذری، طبری، ازدی، وغیرہ میں سیکڑوں معاہدے اصلی الفاظ میں مذکور ہیں، جن کا قدر مشترک یہ ہے کہ کسی مذہب سے تعرض نہ کیا جائے گا، چنانچہ مزید اطمینان کے لیے ہم بعض معاہدوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں، حضرت خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھدیا،

لایھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ و	یعنی ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں گے، نہ
لا یمنعون من ضرب النواقیس ولا	ان کو سنکھ بجانے سے منع کیا جائے گا، نہ عید کے
من اخراج الصلبان فی یوم عیدھم[1]	دن صلیب نکالنے سے روکا جائے گا،

عانات پر جب حضرت خالدؓ کا گذر ہوا، تو وہاں کا پادری ان کے پاس حاضر ہوا، اور انھوں نے ان شرائط پر اس سے صلح کرلی،

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۴،

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة و	یعنی ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں گے، وہ
على ان يضربوا النواقيس الا في	نماز کے وقتوں کے سوا، رات دن میں جس
ساعة شاؤا من ليل او نهار الا	وقت چاہیں، ناقوس بجا سکیں
في اوقات الصلوٰة وعلى ان يخرجوا	اور تمام تیوہاروں میں صلیب
الصلبان في ايام عيدهم[1]	نکالیں،

قاضی ابو یوسف صاحب نے کتاب الخراج میں ان احکام کو نقل کر کے لکھا ہے کہ " خالدؓ کے ان معاہدوں پر حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کسی نے کبھی اعتراض نہیں کیا، اس لحاظ سے اگر فقہی اصطلاح کے موافق کہا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ مابعد میں جب کبھی کسی متعصب فرمان روا نے اس کے خلاف کرنا چاہا، مذہبی پیشواؤں نے فوراً مخالفت کی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی تلافی کر دی گئی، ہارون الرشید، جب نائس فورس قیصر روم کی بار بار بغاوت سے نہایت برہم ہوا تو عیسائیوں کی طرف سے اس کے خیالات بہت کچھ بدل گیے تھے، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اس نے قاضی ابو یوسف صاحب سے جو مذہبی صیغہ کے افسر کل تھے، پوچھا کہ عیسائیوں کے گرجے اسلام میں کیوں محفوظ رہے، اور آج ان کو کیوں یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ علانیہ صلیب نکالتے ہیں؟ اس کا جواب جو قاضی صاحب نے لکھا اس کے خاص الفاظ یہ ہیں:

انما كان الصلح جرى بين المسلمين واهل الذمة في اداء الجزية وفتحت المدن على ان لا تهدم بيعهم ولا كنائسهم داخل المدينة ولا خارجها وعلى ان تلوا من ناداهم من عدوهم وعلى ان يخرجوا الصلبان في اعيادهم فافتتحت الشام كلها والحيرة الا اقلها على هذا، فلذلك تركت البيع والكنائس ولم تهدم[2]

یعنی مسلمانوں اور ذمیوں سے جزیہ کی بنا پر جو صلح ہوئی تھی، اس شرط پر ہوئی تھی کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے شہر کے اندر ہوں یا باہر برباد نہ کیے جائیں گے، اور یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان پر چڑھ آئے، تو ان کی طرف سے

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۴، [2] ایضاً ص ۸۴،

مقابلہ کیا جائے گا، اور یہ کہ وہ تیوہاروں میں صلیب نکالنے کے مجاز ہیں، چنانچہ تمام شام اور حیرہ (باستثناء بعض مواقع کے) ان ہی شرائط پر فتح ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ خانقاہیں اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیئے گئے، اور برباد نہیں کیے گئے۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں سنہ ۱۶۹ھ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا، تو حضرت مریم کے گرجا اور چند گرجوں کو منہدم کرا دیا، ہادی نے ایک سال کی خلافت کے بعد وفات پائی، اور ہارون الرشید تخت نشین ہوا، اس نے علی کو معزول کر کے سنہ ۱۷۱ھ میں موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا، موسیٰ نے گرجوں کے معاملہ میں علماء سے استفتا کیا، اس وقت مصر کے تمام علماء کے پیشوا لیث بن سعد تھے، جو بہت بڑے محدث اور نہایت مقدس اور بزرگ تھے، انہوں نے علانیہ فتویٰ دیا، کہ منہدم شدہ گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دیے جائیں، اور دلیل یہ پیش کی کہ مصر میں جس قدر گرجے ہیں خود صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تعمیر ہوئے تھے چنانچہ تمام گرجے سرکاری خزانے سے تعمیر کرا دیئے گئے۔[۱] علامہ مقریزی نے تاریخ مصر میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

فبنیت کلہا بمشورۃ اللیث بن سعد وعبد اللہ بن لہیعۃ وقالا ہو من عمارۃ البلاد واحتجابات الکنائس التی بمصر لم تبن الا فی الاسلام فی زمن الصحابۃ والتابعین۔[۲]

اسی طرح دمشق کا ایک گرجا ایک رئیس کی بے جا فیاضی سے خاندان بنی نصر کے قبضہ میں آ گیا تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں اس کو بنی نصر سے چھین کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں، لیکن اس موقع پر ہم ایک ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں، جو صرف ایک جزئی واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اس سے جانشینان اسلام کے عام طرز عمل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دمشق کی جامع مسجد ایک گرجے کے متصل تھی، جس کا نام یوحنا کا گرجا تھا، امیر معاویہؓ نے اپنے عہد خلافت میں ضرورت کی وجہ سے چاہا کہ گرجا کو مسجد میں شامل کریں، لیکن عیسائیوں نے انکار کیا، امیر معاویہ مجبور رہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں عیسائیوں سے درخواست کی اور معاوضہ پیش کیا،

[۱] النجوم الزاہرہ واقعات سنہ ۱۶۹ھ، [۲] مقریزی جلد دوم ص ۵۱۱،

عیسائی پھر راضی نہ ہوئے، اور عبدالملک کو باز رہنا پڑا، ولید نے اپنے زمانۂ خلافت میں عیسائیوں کے آگے ایک بڑی رقم پیش کی، وہ اسی طرح انکار کرتے رہے، ولید نے غصہ میں آکر کہا کہ تم خوشی سے نہیں دیتے تو میں جبراً لے لوں گا، عیسائیوں نے کہا کہ جو شخص کسی گرجے کو نقصان پہونچاتا ہے، وہ پاگل یا کوڑھی ہوجاتا ہے، ولید کو اس پر زیادہ غصہ آیا، خود اپنے ہاتھ میں کدال لے کر گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی، اور بالآخر گرجا مسجد میں شامل کر لیا گیا، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں عیسائیوں نے اس تعدی کی شکایت کی، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے دمشق کے عامل کو لکھ بھیجا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے، وہ عیسائیوں کو واپس کر دیا جائے، اس پر مسلمانوں کو نہایت رنج ہوا کہ ہم جس مسجد میں نماز پڑھ چکے اور اذانیں دے چکے، اس کو کیونکر ڈھائیں، آخر عیسائیوں کے پاس جا کر خوشامد کی اور کہا کہ آغاز فتح میں غوطۂ دمشق کے جس قدر گرجے مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، اور اب تک ہیں، وہ سب واپس کر دیئے جائیں گے، اگر تم اس مسجد کے ڈھا دینے سے باز آؤ" عیسائی اس پر راضی ہوئے، اور عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کو اس کی اطلاع دی گئی، انھوں نے عیسائیوں کی خواہش کے موافق مسجد کا منہدم کرنا روک دیا، اور انکو غوطۂ دمشق کے تمام گرجے دلا دیئے[1]،

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر مذہب والوں کی کسی عبادت گاہ پر تصرف کرنا کس قدر پرخطر کام سمجھا جاتا تھا، اور مقدس خلفاء کہاں تک گرجاؤں وغیرہ کا لحاظ رکھتے تھے،

یورپین مصنفوں کی طرف سے بڑا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ "مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بت خانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی، لیکن یہ ان کی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے، یہ بحث خود صحابہؓ کے زمانہ میں پیش آچکی تھی، اور اس کا فیصلہ کر دیا گیا تھا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا، تو انھوں نے جواب دیا کہ جو شہر مسلمانوں کے خاص آباد کردہ ہیں، وہاں غیر مذہب والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ گرجا اور بت خانہ بنائیں، یا ناقوس بجائیں، باقی جو قدیم شہر ہیں وہاں

---

[1] یہ پوری تفصیل فتوح البلدان ص ۱۲۵ میں مذکور ہے،

ذمیوں سے جو معاہدہ ہے، مسلمانوں کو اس کا پورا کرنا ضرور ہوگا[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ فتویٰ بھی اس لحاظ سے تھا کہ اس وقت تک مسلمان، اور دوسری قومیں اچھی طرح ملے جلے نہیں تھے، لیکن جب یہ حالت نہیں رہی، تو وہ فیصلہ بھی نہیں رہا، چنانچہ خاص اسلامی شہروں میں اس کثرت سے گرجے، بت خانے، آتشکدے بنے کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا، بغداد خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے، وہاں کے گرجوں کے نام معجم البلدان میں کثرت سے ملتے ہیں، قاہرہ میں جو گرجے بنے وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے، یوتکیس نے جو ۳۲۲ھ میں اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا، اپنی کتاب میں جو عربی زبان میں ہے، اور جس کو پروفیسر پوکاک نے لاٹین ترجمہ کے ساتھ چھاپا ہے، اس قسم کے بہت سے گرجوں کا نام اور ان کے حالات لکھے ہیں؛

خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں عراقین کا گورنر تھا، اور عرب کے نہایت نامآور لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے، اپنی ماں کے لیے جو عیسائی مذہب رکھتی تھی، تو ایک گرجا تعمیر کرادیا تھا، عضد الدولہ نے جو بہت بڑا نامور شہنشاہ گذرا ہے، اور نہایت صاحب فضل وکمال تھا، اپنے وزیر نصر بن ہارون کو چرچ اور گرجاؤں کے بنانے کی عام اجازت دی تھی،[2] چنانچہ اس نے ۳۶۹ھ میں نہایت کثرت سے تمام ممالک اسلامیہ میں چرچ اور گرجے تعمیر کرائے،

مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ پرانے معبد قائم رکھے یا نئے معبدوں کی تعمیر کی اجازت دی بلکہ انہوں نے نہایت انصاف سے معبدوں کے متعلق تمام عہدے اور تمام وہ جائدادیں بحال رہنے دیں، جو ان معبدوں پر وقف تھیں، یہاں تک کہ پجاریوں اور مجاوروں کے جو روزینے پہلے سے مقرر تھے، وہ بھی اپنے خزانے سے جاری رکھے، عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر آراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں، اسی طرح بحال رہنے دیں، چنانچہ اس قسم کی جو آراضیات ۵۵ھ ہجری تک موجود تھیں، ان کی مقدار پچیس ۲۵ ہزار فدان تھی[3] محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو برہمنوں کو بلا کر بتخانوں کے متعلق جو اختیار دیئے، اس کو مورخ علی بن حامد نے اپنی تاریخ سندھ میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

"پس اکابر ومقدمان وبراہمہ را فرمود کہ معبود خود را عبادت کنند، وفقرائے برہمنان

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۸، [2] ابن الاثیر واقعات ۳۶۹ھ، [3] دیکھو مقریزی جلد دوم ص ۴۹۹،

را باحسان و تعہد تیمار دارند و اعیاد و مراسم خود بہ شرائط آبا و اجداد قیام نمایند، و صدقاتے کہ پیش ازین در حق براہمہ می دادند بر قرار قدیم بدہند۔"

بنیامین جو مصر کا پیٹریارک تھا، اور ایرانیوں کے قبضہ کے زمانہ میں مصر سے بھاگ گیا تھا، اس کو خود عمرو بن العاص نے [illegible] امان کی تحریر بھیجکر مصر میں بلوایا، اور پیٹریارک کے عہدے پر مامور کیا،[1] محمد ثانی نے جب ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو یونانی کلیسا کا خود محافظ بنا، اور تمام پادریوں کو ہر قسم کے قانون کے احکام سے بری کر دیا،

اسلام میں غیر مذہب والوں کے مذہبی احکام کا جو لحاظ کیا جاتا تھا، اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی [illegible] گرجا بنانے کی وصیت کر جائے، تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کرے گی، اور [illegible] وصیت کر جائے تو ناجائز، چنانچہ صاحب ہدایہ نے باب الوصیۃ میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب [illegible] کرکے ان کی طرف سے یہ دلیل پیش کی ہے، نحن امرنا بان نترکھم وما یدینون یعنی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم غیر مذہب والوں کو ان کے احکام مذہبی پر چھوڑ دیں،

ایک دفعہ جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک عورت نے مسلمانوں کی ہجو کے اشعار گائے، اور ایک افسر نے اس جرم پر اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے تو حضرت ابوبکرؓ نے اس افسر کو خط لکھا کہ اگر وہ عورت مسلمان تھی تو کوئی معمولی سزا دینی چاہئے تھی، اور اگر ذمی تھی تو جب ہم نے اس کے شرک اور کفر سے درگذر کی تو ہجو تو شرک سے بہرحال کم ہے۔[2]

عیسائی نکتہ چینوں کی نسبت ہم کو صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلامی تاریخوں سے ناآشنا ہیں بلکہ افسوس یہ ہے کہ وہ خود اپنے قدیم عیسائی بزرگوں کی روایتوں سے واقفیت نہیں رکھتے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مرو کا جو پیٹریارک تھا، اور جس کا نام (JESUAH) تھا، اس نے ایران کے لارڈ بشپ (SIMEON) کو [illegible] لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے، "عرب جن کو خدا نے اس وقت جہان کی بادشاہت دی ہے [illegible] مذہب پر حملہ نہیں کرتے بلکہ برخلاف اس کے [illegible] مذہب کی امداد کرتے ہیں، ہمارے پادریوں

[1] مقریزی [illegible]

اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں، اور گرجوں اور خانقاہوں کیلئے عطیہ دیتے ہیں"

مذہبی اور قانونی حقوق کے بعد جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے، یہ امر زیادہ قابل لحاظ ہے کہ ذمیوں کو رتبہ اور اعزاز کے لحاظ سے اسلامی گورنمنٹ اور اسلامی پبلک میں کیا درجہ حاصل تھا، فاتح اور مفتوح کی تمیز ایک ایسا فطرتی اثر ہے، جو کسی طرح کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا، پچھلی دنیا میں تو یہ امتیاز اس حد تک پہونچا تھا، کہ فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوحین کو جانوروں سے کچھ ہی زیادہ سمجھا، ہنود آرین ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح خاک میں ملا دیا، کہ ان کو شودر کے لقب سے خود عار نہیں رہا، رومن نے تمام مفتوحہ قوموں کو گویا غلام بنا رکھا تھا، دنیا اسی حالت میں تھی کہ اسلام کا قدم آیا، اس کے گرد و پیش ہر طرف اسی قسم کی مثالیں موجود تھیں، لیکن اس نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ دنیا کے اس رواج یافتہ قاعدے کو دفعۃً مٹا دیا، اور قول و فعل دونوں کو بتا دیا کہ حقوق عامہ میں جس قدر آدمی آسمان کے نیچے ہیں، سب برابر ہیں، اسلام ہی نے یہ بات سکھلائی تھی، کہ جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر خود ان کی خلافت کے زمانہ میں ایک زرہ کا دعویٰ کیا، تو جنابؓ ممدوح کو اس کی جواب دہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا پڑا، اور وہ بغیر کسی عذر کے معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے، یہ اسلام ہی کی تعلیم تھی کہ جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبد الملک پر جو بڑی عظمت اور اقتدار کا خلیفہ گذرا ہے، ایک جائداد کا دعویٰ کیا، اور حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمرؒ نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دہی کرو، ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا، حضرت عمرؒ نے کہا نہیں، تم خود سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، ہشام نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی، حضرت عمرؒ نے نہایت سختی سے ڈانٹا، اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑوں گا، چونکہ روداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا، اس کو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اس نے پیش کی تھی، چاک کر دی جائے۔[1]

تاریخ اسلام میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، لیکن ہم نے صرف ان بزرگوں کے نمونے پیش کیے ہیں جو خود اسلام کے نمونے تھے،

اسلامی حکومتوں میں مسلمان اور ذمی عموماً برابری کی حیثیت سے رہتے تھے، سرکاری مناصب میں، مجالس عامہ

---

[1] عیون والحدائق ص ۶۰،

ہیں، عام معاشرت میں، فاتح مفتوح کی کچھ تمیز نہ تھی، لیکن قبل اس کے کہ ہم اس دعویٰ کو تفصیلی طور سے ثابت کریں ہم کو ان شبہات کا جواب دینا چاہیے، جو اس موقع پر خواہ مخواہ پیدا ہوں گے، عیسائی مصنفین نے ہمیشہ نہایت زور کے ساتھ اسلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے دوسری قوموں کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا، اور ذلت کی مشہور علامتیں قائم کیں، اسلام نے یا اسلام کے جانشینوں نے یہ قاعدے بنائے کہ ذمی ایک خاص قسم کا لباس اختیار کریں، جو ان کی محکومی اور ذلت کی علامت ہو گھوڑے پر نہ سوار ہوں، راستے میں تا دبا مسلمانوں سے بچ کر نکلیں، بڑے بڑے عہدے نہ پائیں، ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہ کیا جائے،

ہم بے شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات میں ذمیوں کی نسبت یہ احکام موجود ہیں، لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں، اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ احکام کسی زمانے میں رواج نہیں پائے، کسی کسی ظالم بادشاہ نے جوش تعصب میں اس قسم کی کارروائی کی تو وہ اسی عہد تک رہی، مورخین نے عام طور پر لکھا ہے، کہ سب سے پہلے جس نے ذمیوں کا لباس بدلا، وہ المتوکل باللہ عباسی تھا" اس سے یہ امر تو علانیہ ثابت ہے کہ متوکل باللہ سے پہلے یہ لباس نہ تھا، متوکل نے ذمیوں پر اور بھی طرح طرح کی سختیاں کیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی متوکل ہے، جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مزار مبارک کو کھدوا کر خاک کے برابر کر دیا، اور منادی کرادی کہ کوئی شخص زیارت کو نہ آنے پائے، جس شخص نے خود جگر گوشۂ رسولؐ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہو، اس سے کسی فعل پر کیا استدلال ہو سکتا ہے،

یہ سچ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی ذمیوں کے لیے ایک خاص لباس کی تعیین کی تھی، لیکن یہ وہی لباس تھا، جو مدت سے ان کا قومی لباس چلا آتا تھا، اور اس وجہ سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس سے تحقیر اور ذلت مقصود تھی، اس بحث کو ہم نے مختصراً سیرۃ النعمان میں لکھا ہے، اور ان شاء اللہ الفاروق میں اس بحث کا قطعی تصفیہ کر دیں گے، یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم آیا کوئی مذہبی اور انتظامی حیثیت رکھتا تھا، یا صرف ان کا مذاق طبیعت تھا، جس کے معنی صرف یہ تھے کہ تمام قومیں اپنی اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں،

اس امر کے فیصلہ کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ لباس کے بارے میں حضرت عمرؓ کے احکام کس حد تک عمل میں آسکے۔

حضرت عمرؓ نے جہاں غیر قوموں کو عرب کے لباس کے اختیار کرنے سے روکا تھا، اہل عرب کو بھی عجم کی وضع سے پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی، چنانچہ عتبہ بن فرقد کو جو فرمان لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے: **علیکم بلباس ابیکم اسمٰعیل وایاکم والتنعم وزی العجم والقراانحفاف والقرا السراویل** یعنی تم کو اپنے باپ اسمٰعیل کا لباس پہننا چاہیے، خبردار عیش طلبی اور اہل عجم کی وضع نہ اختیار کرنا، موزہ اور پاجامہ پہننا چھوڑ دو۔

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ بیت المقدس کے معاہدہ کے لیے شام تشریف لے گیے، تو تمام افسران فوجی رومیوں کے لباس میں تھے، اس پر ناراضی بھی ظاہر فرمائی، لیکن جب ان لوگوں نے اس کا سبب بتایا تو چپ ہوگیے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مصر فتح ہوا، تو اہل فوج کی خوراک اور لباس کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ عیسائی ہر سال غلہ اور کپڑوں کی ایک تعداد مقررہ جزیہ کے ساتھ ادا کرتے رہیں، ان کپڑوں میں عمامہ اور جبہ کے ساتھ موزے اور پاجامے بھی شامل تھے[1]، حالاں کہ موزہ اور پاجامہ کے استعمال کو حضرت عمرؓ اپنے سابق فرمان میں منع کرچکے تھے، حضرت عمرؓ کی ان دو مختلف کارروائیوں کی تاویل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اول اول ان کی وہ رائے تھی، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ طبائع کے میلان عام کو وہ روک نہیں سکتے، تو انہوں نے اس خیال کو جانے دیا۔

غیر قوموں کو حضرت عمرؓ نے جو روک ٹوک کی تھی وہ بھی نہ چل سکی، عیسائیوں اور یہودیوں نے مسلمانوں کی بہت سی خصوصیتیں اختیار کرلیں، یہاں تک کہ عمرؒ بن عبدالعزیز نے جو حضرت عمرؓ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے، اپنے ایک عامل کو کہا کہ: **وقد ذکرلی ان کثیر ممن قبلك من النصاریٰ قدراجعوا لبس العمائم وترکواالمناطق**[2] یعنی مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اکثر عیسائی عمامہ باندھنے لگے ہیں اور پٹیاں لگانی چھوڑ دی ہیں۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۱۵ [2] کتاب الخراج ص ۷۳۔

ایک خاص قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مسلمان جہاں جہاں گئے اور جہاں جہاں ان کی حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے خود مفتوح قوموں کا لباس اختیار کر لیا، اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کا لباس ذلت اور تحقیر کی علامت ہوتا تو مسلمان ذلت اور تحقیر کو کیونکر گوارا کرتے، عباسیوں کی سلطنت کا آغاز درحقیقت منصور کے عہد سے سمجھا جاتا ہے، اس نے عجمیوں کی جو ٹوپی اختیار کی وہ وہی مجوسیوں کی ٹوپی تھی، جو خاص ان کی قومی علامت تھی، معتصم باللہ جس کے زمانہ میں دولت عباسیہ پورے شباب پر پہونچ گئی تھی، اس نے بالکل شاہان عجم کی وضع اختیار کر لی تھی، مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے،

وغلب علیہ التشبہ بملوک الاعاجم فی الآلۃ ولبس القلانس والشاشیات فلبسھا الناس اقتداءً بفعلہ وایتماماً بہ فسمیت المعتصمیات[1]

یعنی وہ ٹوپی اوڑھنے، پگڑی باندھنے اور ساز و سامان رکھنے میں رئیسان عجم کی تقلید کا بہت شائق تھا، چنانچہ اس کو دیکھ کر سب نے یہ وضع اختیار کر لی، اور اس وضع کا نام معتصمی پڑ گیا،

سندھ وغیرہ میں جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی، اور اس کے مختلف حصوں میں خاص عرب کی نسل کے سلاطین فرمانروا ہوئے، تو تمام مسلمانوں نے ہندوؤں کی وضع اختیار کر لی، چنانچہ ابن حوقل بغدادی جس نے چوتھی صدی کے آغاز میں ان ممالک کا سفر کیا تھا، کھنبات کی نسبت اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے:

وزی المسلمین والکفار بھا واحد فی اللباس وارسال الشعر

یعنی یہاں مسلمان اور کافروں کی ایک وضع ہے، دونوں ایک سا لباس پہنتے ہیں، اور بال بڑے بڑے رکھتے ہیں،

وہی مؤرخ سندھ اور منصورہ کی نسبت لکھتا ہے:

وزیھم زی اھل العراق ان زی ملوکھم یقارب زی ملوک الھند

یعنی یہاں کے مسلمانوں کا لباس عراق کا سا ہے، لیکن یہاں کے بادشاہوں کی وضع

---

[1] مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ،

ہندوراجاؤں کے قریب قریب ہے۔

مخالفوں کی طرف سے بلکہ خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو، چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ نادانستگی میں ایک عیسائی کو سلام کیا تو پھر اس سے جا کر کہہ آئے کہ تو میرا اسلام پھیر دے، یہ اور اس قسم کی روایتیں بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس راز سے بالکل پردہ اٹھا دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں جو یہود رہتے تھے، ان میں اس قدر تعصب تھا کہ بات بات میں اس کا اثر پایا جاتا تھا، وہ مسلمانوں کو سلام کرتے تھے تو السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ''تم کو موت آئے'' رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جب یہود اس طرح سے سلام کریں تو تم صرف یہ کہہ دو کہ ''علیکم'' یعنی ''تم پر[1]'' یہی روایت ہے جو مختلف پیرایوں میں ادا کی گئی ہے اور جس کا حاصل صرف یہ ہے کہ ''جس طرح لوگ تم سے پیش آئیں تم بھی ان سے اسی طرح پیش آؤ'' بے شبہہ عبداللہ بن عمرؓ نے سلام کہہ کر واپس لیا تھا، لیکن اولاً تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ عیسائی ذمی یعنی اسلام کی رعیت تھا اور ہماری بحث یہاں صرف ذمیوں کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اصلی بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی یہ ذاتی رائے تھی اور دوسرے صحابہؓ جو علم وفضل، تحقیق اور اجتہاد میں ان سے بڑھ کر تھے، ان کی رائے اس کے بالکل خلاف تھی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو جن کو بحر العلوم کا خطاب ملا تھا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست، سب کے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہیے، جس طرح وہ تم کو سلام کرتا ہے، کیوں کہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ:

اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْرُدُّوْهَا	یعنی تم کو جب کوئی شخص سلام کرے تو تم اس سے زیادہ عمدہ طور پر اس کا جواب دو، یا عمدہ طور سے نہیں تو برابر طور سے سہی۔

عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول، امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں نقل کیا ہے، ابوموسیٰ اشعریؓ

---

[1] ادب المفرد امام بخاریؒ ص ۵۹

جو بڑے رتبہ کے صحابیؓ تھے، انہوں نے ایک عیسائی راہب کو خط لکھا تو سرنامہ پر سلام لکھا، اس پر ایک شخص نے اعتراض کیا، انہوں نے جواب دیا کہ اس نے مجھ کو خط میں سلام لکھا تھا، تو میں نے بھی لکھا، امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کر کے **لو قال لی فرعون بارك الله فيك قلت و فيك** یعنی اگر فرعون بھی مجھ کو یہ الفاظ کہے کہ خدا تجھ کو برکت دے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ خدا تجھ کو برکت دے۔

حاصل یہ کہ اسلام کا یہ اصول تھا اور اسی پر ہمیشہ عمل درآمد رہا کہ جو قوم جس طرح اسلام کے ساتھ پیش آتی تھی، اسلام بھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتا تھا، جو عیسائی یا یہودی وغیرہ دوستانہ اور مہذبانہ برتاؤ کرتے تھے، ان کے ساتھ اسی طریقے سے برتاؤ کیا جاتا تھا، البتہ اسلام میں عیسائیوں کی طرح یہ فیاضی نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو وہ دوسرا گال پھیر دے کہ یہ بھی حاضر ہے۔

ذمیوں کو معاشرت کے تمام امور میں جو مساویانہ درجہ حاصل تھا، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اسلامی تذکروں میں جہاں کسی صاحب علم عیسائی یا یہودی کا ذکر آتا ہے، تو اس کا نام اسی معزز اور مدح آمیز طریقے سے لیا جاتا ہے، جس طرح ایک مسلمان اہل کمال کا لیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ اگر مذہب کی تصریح نہ ہو تو کسی طرح امتیاز نہیں ہوسکتا کہ یہ کسی مسلمان کا تذکرہ ہے، یا کسی غیر مذہب کے آدمی کا، بختیشوع، جبریل، سلمویہ، حنین بن اسحٰق، یوحنا بن ماسویہ، ابواسحٰق صابی کا تذکرہ اسلامی تاریخوں میں جس عظمت سے کیا گیا ہے، ان کتابوں کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے، میں اس موقع پر نمونے کے لیے صرف ابن التلمیذ کی نسبت جو بغداد کا ایک معزز عیسائی تھا، مورخانِ اسلام کے چند فقرے نقل کرتا ہوں، عماد کاتب نے جو سلطان صلاح الدین کا میر منشی تھا، اس کو سلطان الحکما کے لقب سے مخاطب کر کے یہ الفاظ لکھے ہیں: **ورايته وهو شيخ بهى المنظر حسن الرواء لطيف الروح بعيد الهم عالى الهمة مصيب الفكر حازم الراى وكنت اعجب فى امره كيف حرم الاسلام مع كمال فهمه وغزارة علمه۔**

کیا کوئی قوم کسی دوسری قوم کا ذکر اس سے زیادہ مدح اور تعریف کے ساتھ کرسکتی ہے، آج کل کے

مقدس علماء کے آگے اگر دنیاوی حیثیت میں بھی کسی انگریز کا ذکر مدح کے ساتھ کیا جائے، تو وہ اس کو اسلامی شان کے خلاف سمجھیں گے۔ مگر اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ان کو تاریخ پر نظر نہیں، اور ان کو معلوم نہیں کہ وہ جن بزرگوں کے نام لیوا ہیں، ان کا طریق عمل کیا تھا،

خلفائے عباسیہ کے دربار میں غیر مذہب والوں کو جو اعزاز اور رتبہ حاصل تھا، اس سے کون انکار کرسکتا ہے، عباسیوں کے دربار کا یہ خاص آئین تھا کہ کسی شخص کا نام دربار میں لقب یا کنیت کے ساتھ نہیں لیا جاتا تھا اس قاعدے سے کوئی ایسا ہی بڑی عزت اور مرتبے کا آدمی مستثنیٰ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے علماء کو یہ عزت نصیب نہیں ہوتی تھی، باوجود اس کے مامون الرشید، جبریل بن بختیشوع کا نام دربار میں کنیت کے ساتھ لیتا تھا، ہارون الرشید نے عام حکم دے دیا تھا کہ جس شخص کو مجھ سے کچھ کہنا ہو یا کوئی عرض پیش کرنی ہو تو جبریل بن بختیشوع کے ذریعہ سے کرے، چنانچہ بڑے بڑے افسران فوجی ہارون الرشید سے جو کچھ عرض معروض کرتے تھے جبریل کے ذریعہ سے کرتے تھے، متوکل باللہ نے باوجود اس کے کہ ذمیوں کی نسبت سخت احکام جاری کیے تھے، تاہم اس کے دربار میں ذمی اہل کمال کو یہ عزت حاصل تھی کہ بختیشوع دربار میں خود متوکل کا سا لباس پہن کر آتا تھا، اور اکثر صحبتوں میں متوکل کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا تھا، یہاں تک کہ ایک دفعہ بختیشوع متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا تو اتفاق سے وہ اس وقت دیوان خاص کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا، بختیشوع بھی وہیں چوکھٹ پر اس کے ساتھ برابر بیٹھ گیا، سلمویہ بن بنان کو جو عیسائی مذہب رکھتا تھا، معتصم باللہ کے دربار میں یہ عزت حاصل تھی کہ معتصم کے جس قدر فرمان صادر ہوتے تھے، سلمویہ کے دستخط سے ہوتے تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں سلمویہ کی نسبت معتصم کا یہ فقرہ نقل کیا ہے، اکبر عندی من قاضی القضاۃ یعنی سلمویہ میرے نزدیک قاضی القضاۃ سے بڑھ کر ہے، سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود عیادت کو گیا، اور افسوس کے ساتھ رو دیا، سلمویہ نے جب وفات کی تو اس رنج میں تمام دن کھانا نہیں کھایا، اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ ایوان شاہی میں لا کر رکھا جائے، اور عیسائی مذہب کے موافق شمع اور بخور جلا کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھی جائے،

خلیفہ المعتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء، امراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف وزیر اعظم

اور ثابت بن قرۃ کو بیٹھنے کی اجازت تھی، حالانکہ ثابت بن قرۃ مذہباً صابی تھا، اور ذمی تھا، اور ایک دن معتضد ثابت بن قرۃ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہل رہا تھا، دفعۃً معتضد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ثابت خوف سے کانپ اٹھا، معتضد نے کہا "ڈرو نہیں، میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا، لیکن چونکہ تم علم و فضل میں مجھ سے بڑھ کر ہو اس لیے تمہارا ہاتھ اوپر ہونا چاہیے"

سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس، نہایت پابند شریعت اور متقی و پرہیزگار تھا، اس کے دربار میں کثرت سے عیسائی تھے، اور وہ ان کی نہایت عزت و توقیر کرتا تھا، ان ہی میں سے ابن المطران ایک عیسائی تھا، صلاح الدین کی عادت تھی کہ وہ لڑائی کے معرکوں میں ایک سرخ خیمہ نصب کراتا تھا، اور جب لڑائی سے فارغ ہو کر بیٹھتا تھا تو اسی خیمے میں بیٹھتا تھا، چونکہ یہ امتیاز کی علامت تھی، اس لیے حکم تھا کہ اور کوئی شخص اس رنگ کا خیمہ نہ رکھے، ابن المطران چونکہ شان و شوکت اور تمام باتوں میں خود سلطان صلاح الدین کی ہمسری کرنا چاہتا تھا، اس نے اپنا خیمہ بھی سرخ رنگ کا تیار کرایا، اور اسی میں بیٹھا کرتا تھا، سلطان صلاح الدین نے دیکھا تو کہا کہ ہم کو اس سے کوئی اعزاز مقصود نہیں تھا، صرف ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تاکہ لوگ میرے خیمہ کو باسانی پہچان لیں، یہ کہہ کر اس کا خیمہ اکھڑوا دیا، ابن المطران اس پر سخت برہم ہوا، اور دو دن تک دربار میں نہیں آیا، آخر صلاح الدین نے بڑی استمالت سے اس کو راضی کیا، اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں، کوئی کہاں تک گنوائے،

یورپ والو! اگر اسلامی حکومتوں میں ذمیوں کی اسی طرح ذلت اور تحقیر کی جاتی تھی، تو کاش تم اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھ اسی ذلت اور تحقیر کا برتاؤ کرتے،

اعزاز اور توقیر کی نسبت شاید کہا جائے کہ یہ پالٹیکس کی بنا پر تھا، اس لیے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور جانشینان اسلام ذمیوں کی نسبت دلی ہمدردی اور غمخواری کے کیا خیالات رکھتے تھے، ذمیوں کی نسبت اگرچہ ہر قسم کے معاملات حضرت عمرؓ کے عہد میں منضبط ہوئے، اور زمانۂ مابعد میں بلحاظ اغلب ان ہی کا طرز عمل سچے مسلمانوں کا طرز عمل رہا، لیکن ابتدا خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان مبارک سے ہو چکی تھی، اور اس وجہ سے ہم کو اس باب میں خود شریعت کا طرز عمل معلوم ہو سکتا ہے، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج

میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقمؓ کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو ان کو بلا کر فرمایا:

الا من ظلم معاهدا او کلفه فوق	یعنی جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی)
طاقته او انتقصه واخذ منه شیئا	پر ظلم کرے گا، یا اس سے اس کی طاقت سے
بغیر طیب نفسه فانا حجیجه یوم	زیادہ کام لے گا، یا اس کو ذلیل کریگا، یا
القیامة،[1]	اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا،
	تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا یہ اثر تھا، کہ صحابہ جہاں کہیں ذمیوں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تھے، فوراً مواخذہ کرتے تھے، سعید بن زیدؓ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں کو مال گذاری وصول کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے، اسی وقت وہاں کے حاکم سے جاکر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے، خدا اس کو عذاب دیگا، ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، اور انھوں نے اسی وقت حاکم وقت یعنی عیاض بن غنم کے پاس جاکر ملامت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا،[2]

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا، اس سے پوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے، اس نے کہا یہودی، فرمایا بھیک کیوں مانگتا ہے، بولا کہ تنگی اور مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ کے ادا کرنے کے لیے، حضرت عمرؓ اس کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لوا گیے، اور کچھ نقد اپنے پاس سے دے کر بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ

انظر هذا وضرباءه فو الله	یعنی اس بوڑھے اور اس کے اور ساتھیوں
ما انصفناه ان اکلنا شبیبته	پر خیال کرو، خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں
ثم نخذله عند الهرم انما	کہ اس کی جوانی کی کمائی ہم نے کھائی، اور اب

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۷۲، [2] ایضاً ص ۷۱،

انما الصدقات للفقراء والمساکین
والفقراء ... المسلمون والمساكين
... من اهل الكتاب،

یہ بوڑھا ہو گیا ہے، تو اسکو ہم نکال دیں
کی نسبت جو خدا نے کہا ہے کہ فقیروں اور
مسکینوں کو دینا چاہیے، تو فقیروں سے مسلمان
اور مسکینوں سے اہل کتاب مراد ہیں،

حضرت عمرؓ کی اس ہمدردی اور رحم کا جو ان کو ذمیوں کے ساتھ تھا، اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک ذمی کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، تاہم ذمیوں کا ان کو یہ خیال تھا کہ وفات کے وقت تین نہایت ضروری وصیتیں جو کیں، ان میں ایک یہ تھی کہ ذمیوں کے ساتھ جو اقرار ہیں وہ پورے کیے جائیں، ان کی طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے، اور ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی طرف سے لڑائی کی جائے[1]،

عراق میں حضرت عمرؓ نے جو خراج مقرر کیا تھا، اگرچہ نہایت خفیف تھا، تاہم ان کو ہمیشہ خیال رہا کہ تشخیص مال گذاری میں ذمیوں پر سختی تو نہیں کی گئی، چنانچہ جن لوگوں نے زمین کی پیمایش کر کے جمع تشخیص کی تھی، ان کو اکثر بلا کر اس کی نسبت پوچھا کرتے تھے، خراج جب آتا تھا تو دس شخص بصرے سے اور دس کوفے سے طلب کیے جاتے تھے، حضرت عمرؓ ان کے اظہار لیتے تھے، اور جب وہ چار دفعہ شرعی قسم کھا کر کہتے تھے کہ مالگذاری کے وصول کرنے میں ذمیوں پر سختی نہیں کی گئی ہے، تب ان کو تسلی ہوتی تھی، مسلمانوں کو ذمیوں کے ساتھ جو ہمدردی تھی، اس کے لیے اس قسم کی سیکڑوں جزوی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان سب کا استقصا نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہم ایک ایسے واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں، جس سے جماعت اسلامی کی عام رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے،

جزیرۂ سائپرس جب سنہ ۲۹ھ میں فتح ہوا تو شرط یہ ٹھہری کہ وہاں کے لوگ مسلمانوں اور رومیوں کے باہمی معرکوں میں کسی کا ساتھ نہ دیں گے، لیکن سنہ ۳۲ھ میں انھوں نے مسلمانوں کے برخلاف رومیوں کو مدد دی، امیر معاویہؓ نے ان پر چڑھائی کی، اور شہر کو فتح کر کے پہلی شرط پر پھر صلح کر لی، لیکن وہ اپنی

---

[1] حضرت عمرؓ کے اس قول کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے،

شرارت سے پھر باز نہ آئے، اس پر ولید بن یزید نے ایک گروہ کو جلاوطنی کی سزا دی۔ اگرچہ وہ اس سزا کے فی الحقیقت مستحق تھے، لیکن ان کی سازش کا ثبوت قطعی نہ تھا، تمام مسلمان اور علماء اور فقہاء ولید کی اس حرکت پر سخت برہم ہوئے، کہ ذمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جائز نہیں، چنانچہ ولید کے بعد جب اس کا بیٹا تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے ان سب کو واپس بلالیا، اور تمام مسلمانوں نے ولید کی اس کارروائی کی تحسین کی، دولت عباسیہ کے زمانہ میں وہاں کی رعایا نے پھر بغاوت کا ارادہ کیا، اس وقت عبد الملک بن صالح گورنر تھا، اور بڑے بڑے نامور ائمہ اور فقہا مثلاً لیث بن سعد، امام مالک، سفیان بن عیینہ، موسیٰ بن اعین، اسمٰعیل بن عیاش، یحییٰ بن حمزہ، ابواسحاق فزاری، مخلد بن حسین وغیرہ موجود تھے۔ عبد الملک نے ان سب کے پاس استفتاء بھیجا، اور پوچھا کہ قاعدۂ شریعت کی رو سے ان سے کیا سلوک کرنا چاہیے، علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں ان ائمہ کے فتوے الگ الگ ان کے الفاظ میں نقل کیے ہیں، اکثروں نے تو یہی رائے دی ہے کہ ان سے درگذر کرنا چاہیے کیونکہ فقط ارادۂ بغاوت سے وہ ذمیت کے حقوق سے محروم نہیں ہوگئے، لیکن جن بزرگوں نے سختی کی، انہوں نے بھی صرف یہ اجازت دی کہ ان کو سال بھر کی مہلت دی جائے، اگر اس مدت میں وہ پورے مطیع ہو جائیں تو بہتر ورنہ ان کو کہدیا جائے کہ رومیوں کے ملک میں چلے جائیں، یحییٰ بن حمزہ اور ابواسحاق فزاری و مخلد بن الحسین نے یہ فتویٰ دیا کہ ان لوگوں کے پاس جس قدر مال و اسباب اور زمین وغیرہ ہے ایک ایک چیز کی دوگنی قیمت بیت المال سے ادا کی جائے، اور ان کو کہدیا جائے کہ وہ اور کہیں جاکر آباد ہو جائیں، اسمٰعیل بن عیاش نے لکھا کہ "وہ بیچارے رومیوں کے مظلوم ہیں، اس لیے ہم کو ان کی مدد کرنی چاہیے" ان بزرگوں کے فتووں اور رایوں سے بہ آسانی قیاس کیا جاسکتا ہے، کہ ذمیوں کے ساتھ اسلام کا کیا برتاؤ تھا،

سب سے اخیر بحث ملکی حقوق کی ہے، یعنی یہ کہ ذمیوں کو انتظام سلطنت میں کہاں تک دخل تھا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شروع سے اس بحث میں ہمارے مخاطب عیسائی ہیں، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام غیر مذہب والوں سے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کا حکم دیتا ہے، اس لیے ہم ملکی حقوق کی بحث میں یورپ کے نظام سلطنت سے موازنہ کریں گے، کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک عدل و انصاف، تہذیب و شائستگی کا معیار یورپ اور یورپ کا اصول حکومت ہے، سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ملکی حقوق کی نسبت یورپ کی مہذب سے مہذب حکومتوں نے فاتح و مفتوح

میں جو حد فاصل قائم کی ہے، وہ اسلامی حکومتوں نے کبھی نہیں کی، اسلام نے یا اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زاد ہو اس کو فلاں قسم کے حقوق نہیں مل سکتے، یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں،

اسلام کے آغاز میں ملکی اور فوجی عہدے مختلف نہ تھے، جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا تھا، وہی سپہ سالار بھی ہوتا تھا، یہاں تک کہ جو لوگ منصب قضا پر مامور ہوتے تھے، وہی ضرورت کے وقت فوج کے جنرل مقرر ہو کر بھیج دیے جاتے تھے، تہذیب اور شائستگی کے تاریخ دان اس بات کو بخوبی جانتے ہیں، کہ سلطنت جب اول اول قائم ہوتی ہے، تو اس کے مختلف صیغے مدت تک باہم مختلط رہتے ہیں، جس قدر تمدن زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے، اسی قدر تقسیم عمل کا اصول زیادہ عمل میں آتا جاتا ہے، اور ہر ہر صیغہ جدا جدا صورت پکڑتا جاتا ہے، اسی کلیہ کے موافق اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی اس قسم کا اختلاط و التباس رہا، اور اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مفتوح قومیں ملکی انتظامات میں کم شامل ہو سکیں، کیونکہ اس وقت تک جس قدر ملکی عہدے تھے، ان میں فوجی مہمات بھی شامل تھیں، اور اس وجہ سے غیر قومیں خود ان پُر خطر خدمات کو گوارہ نہیں کرتی تھیں،

اس موقع پر یہ امر قابل استفسار ہے کہ اگر غیر قوموں نے خود فوجی خدمتوں کو قبول کرنا چاہا، تو اسلام نے ان کی خواہش کا کہاں تک لحاظ رکھا، اور جواب یہ ہے کہ اسلام نے بے تکلف ان کی درخواست منظور کی حضرت عمرؓ کے وقت میں بارہا یہ موقعے پیش آئے کہ عیسائیوں اور آتش پرستوں نے باوجود اپنے مذہب پر قائم رہنے کے فوجی خدمتوں میں شامل ہونے کی درخواست کی، اور حضرت عمرؓ نے نہایت خوشی سے ان کی درخواست کو منظور کر کے ان کو وہ تمام حقوق دیدیے جو مسلمانوں کو حاصل تھے، لیکن ناظرین کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم اس موقع پر ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کریں گے، ورنہ الفاروق کے لیے کیا رہ جائے گا،

بہر حال، اسلام کے ابتدائی زمانے میں وہ خدمتیں اور عہدے جن میں فوجی حیثیت بھی شامل تھی، ذمیوں کو کم ملے، لیکن جس صیغے میں اس حیثیت کا دگاؤ نہ تھا وہ ذمیوں کے لیے کھلا رہا، بلکہ حق یہ ہے کہ خاص ان ہی کے قبضۂ اختیار میں رہا، خراج اور مالگذاری کے محکموں اور دفتر پر عموماً عیسائی اور آتش پرست قابض تھے، یہاں تک کہ اس دفتر کی زبان بھی لاطینی اور فارسی و قبطی رہی، شام میں ۸۷ھ تک دفتر خراج لاطینی

زبان میں تھا، اور اس وقت انتنساس نام ایک عیسائی اس محکمہ کا افسر تھا، عراق کا دفتر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں فارسی سے عربی زبان میں منتقل ہوا، وہ بھی اس وجہ سے کہ دفتر خراج کے میر منشی نے جو آتش پرست تھا اور جس کا نام فرخ زاد تھا، مغرورانہ یہ دعویٰ کیا تھا، کہ عربی زبان اس قابل نہیں کہ حساب کے تمام جزئیات کو ادا کر سکے،

رفتہ رفتہ جب تمدن نے زیادہ ترقی کی، اور ملکی اور فوجی صیغے میں فی الجملہ امتیاز ہوا، تو ذمیوں کو ملکی صیغے میں بار ہونے لگا، سب سے پہلے اس کی ابتدا امیر معاویہؓ کے عہد میں ہوئی، یعنی ابن آثال ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا[۱]، رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب اور عہدہ ایسا نہیں رہا، جو غیر مذہب والوں کے دسترس سے باہر رہا ہو، مذہبی صیغہ کو چھوڑ کر دربار میں سب سے بڑے عہدے دار تھے، وزارت اور کتابت، کتابت آج کل کی اصطلاح میں چیف سکریٹری کے عہدے کے برابر تھی، یعنی ہر قسم کے فرامین سلطنت، اور سلطنت غیر سے مراسلت کا کام اسی سے متعلق ہوتا تھا، اور اسی وجہ سے وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں جہاں اس عہدے کا ذکر کیا لکھا ہے کہ ان صاحب هذه الخطة لابد ان یتخیر من ارفع طبقات الناس،

غرض یہ دونوں منصب جو اعلیٰ ترین مناصب تھے، ذمیوں کو عطا کیے گیے، عبد الملک بن مروان جو سلطنت بنو امیہ کا دوسرا تاجدار تھا، اس کا کاتب ابن سرجون ایک عیسائی تھا،

دولت عباسیہ کے عہد میں ابو اسحاق صابی جو اس منصب پر ممتاز تھا، بڑے رتبہ کا شخص گذرا ہے، اور ابن خلکان وغیرہ نے اس کے فضل و کمال کی بڑی تعریف کی ہے، سلطنت ویلم کا سرتاج عضد الدولہ جو شہنشاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اس کا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام خلفاء و سلاطین دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ مذہبی شان بھی رکھتے تھے، یورپ کو اس قسم کی بے تعصبی اور فیاضی تک پہونچنے کے لیے ابھی کئی سو برس درکار ہیں،

ایک امر البتہ قابل لحاظ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں سول اور ملیٹری ڈپارٹمنٹ کسی زمانے میں صاف صاف الگ نہیں ہوئے، اس واسطے جس حد تک ملکی صیغہ میں فوجی حیثیت کا لگاؤ رہتا تھا، ذمی اس سے کم متمتع ہو سکتے تھے، لیکن اس کے سوا اور ہر قسم کے مناصب اور عہدے تمام ذمیوں کے لیے کھلے تھے، اور

[۱] تاریخ یعقوبی ذکر حکومت معاویہؓ

ہر زمانے میں سیکڑوں اور ہزاروں عیسائی یہودی، ہندو، آتش پرست، سرکاری خدمتوں پر مامور رہے، ہندوستان میں ایک خاص تغیر ہوا یعنی یہ کہ ہندؤوں نے کثرت سے یہی خدمتیں قبول کیں، اور فوج میں بہت بڑا حصہ ان کا تھا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندؤوں نے ہر قسم کے بڑے بڑے ملکی عہدے حاصل کیے، ناواقف ہندو خیال کرتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی، اور یہ اس کی مادری حیثیت کا اثر تھا، لیکن یہ ان کی تاریخی جہالت کا نتیجہ ہے، جہانگیر، شاہجہاں، یہاں تک کہ عالمگیر جس کو نہایت متعصب خیال کیا جاتا ہے سب نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، شاہجہاں کے دربار میں سب سے بڑا منصب نُہ ہزاری تھا یعنی وہ ارکان سلطنت جن کو نو ہزار سواروں کے رکھنے کی اجازت تھی، اس سے اتر کر ہفت ہزاری اور اس عہدے پر مہابتخان خانخاناں ممتاز تھا، اس کے نیچے پنجہزاری و چار ہزاری وغیرہ تھے، چنانچہ اس درجہ کے مناصب پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد قریب قریب برابر تھی، ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہاں اس قسم کے ہندو عہدہ داروں کی فہرست لکھتے ہیں، جس کو ہم نے شاہجہاں کی سرکاری تاریخ شاہجہاں نامہ سے انتخاب کیا ہے

رانا جگت سنگھ	پنجہزاری	راجہ بٹھل داس	چار ہزاری
گج سنگھ	"	بھارت بندیلہ	"
جے سنگھ	"	راؤ سور	"
راؤ رتن ہاڈا	"	جگدیو رائے	"
جھجار سنگھ	"	ہمیر رائے	"
مالوجی دکنی	"		
اوداجی رام	"		
بہادرجی			

ان کے علاوہ گیارہ ہندو افسر دو ہزاری، بارہ ڈیڑھ ہزاری، سولہ ایکہزاری، آٹھ نہ صدی، گیارہ ہشت صدی، آٹھ ہفت صدی تھے، اور ان سے نیچے کے عہدہ دار تو بے شمار تھے،

ان تمام واقعات کے ثابت ہونے کے بعد دنیا خود اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا،

حقوق الذمیین کا تکملہ

حضرت عمر فاروقؓ پر اعتراض

اور

اس کا جواب

ہم کو ان واقعات کی حقیقت بھی بتانا ضرور ہے، جن کی وجہ سے لوگوں کو یہ غلط خیال پیدا ہوا ہے، یا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یا خود اسلام نے ذمیوں کے ساتھ نا انصافانہ سلوک کیے،

اس مسئلہ کو مخالف اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے حق میں یہ حکم دیا کہ وضع اور لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبّہ نہ کرنے پائیں، کمر میں زنّار باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سوّر نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ نکالیں، بنو تغلب کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دینے پائیں، ان سب باتوں پر یہ مستزاد کہ حضرت عمرؓ نے عرب کی وسیع آبادی میں ایک یہودی یا عیسائی کو نہ رہنے دیا، اور بڑے بڑے قدیم خاندان جو سیکڑوں برس سے عرب میں آباد تھے، جلا وطن کر دیے،

بے شبہ یہ اعتراضات نہایت توجّہ کے قابل ہیں، اور ہم اُن کے جواب دینے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے، کیونکہ ایک زمانۂ ممتد کے تعصب اور تقلید نے واقعیت کے چہرے پر بہت سے پردے ڈال دیئے ہیں، یہ سچ ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کو غیر قوموں کی مشابہت اور غیر قوموں کو مسلمانوں کی مشابہت سے روکتے تھے، لیکن اس سے فقط قومی خصوصیتوں کو قائم رکھنا مقصود تھا. لباس کی بحث میں تحقیق طلب امر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو جس لباس کی پابندی کی تاکید کی تھی، آیا وہ ہی ذمیوں کا قدیم لباس تھا. یا حضرت عمرؓ نے کوئی

نیا لباس بطور علامت تحقیر کے تجویز کیا تھا، جس شخص نے عجم کی قدیم تاریخ پڑھی ہے، وہ یقیناً جان سکتا ہے کہ جس لباس کا یہاں ذکر ہے وہ عجم کا قدیم لباس تھا، حضرت عمرؓ کا معاہدہ جس کو کنز العمال وغیرہ میں نقل کیا ہے اگرچہ راویوں نے اس کو بہت کچھ کم و بیش کر دیا ہے، تاہم جہاں ذمیوں کی طرف سے یہ اقرار مذکور ہے کہ ہم فلاں فلاں لباس نہ پہنیں گے، وہاں یہ الفاظ بھی ہیں، وان نلزم زینا حیث ما کنا[1]، یعنی ہم وہی لباس پہنیں گے، جو ہمیشہ سے پہنتے آئے تھے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس لباس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا، وہ عجم کا قدیم لباس تھا۔

زنّار جس کا ذکر حضرت عمرؓ کے فرمان میں ہے، اس کی نسبت ہمارے فقہاء نے اکثر غلطیاں کی ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ اگلے زمانے میں ایک قسم کا جنیو ہوتا تھا، اور اس سے ذمیوں کی تحقیر مقصود تھی، لیکن یہ سخت غلطی ہے، زنّار کے معنی پیٹی کے ہیں، اور عرب میں یہ لفظ آجکل بھی اسی معنی میں مستعمل ہے، پیٹی کو عربی منطقہ بھی کہتے ہیں، اور اس لحاظ سے زنّار اور منطقہ مرادف الفاظ ہیں، ان دونوں الفاظ کا مرادف ہونا کتب حدیث سے ثابت ہے، کنز العمال میں بیہقی وغیرہ سے روایت منقول ہے، کہ حضرت عمرؓ نے سرداران فوج کو یہ تحریری حکم بھیجا[2]، وتلزمہم المناطق یعنی الزنانیر، اسی زنّار کو کستیج بھی کہتے تھے، چنانچہ جامع صغیر وغیرہ میں بجائے زنار کے کستیج ہی لکھا ہے، اور غالب یہ ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے، بہرحال اہل عجم قدیم سے پیٹی لگاتے تھے، علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف میں[3] لکھا ہے کہ عجم کی اس قدیم عادت کی وجہ میں نے کتاب مروج الذہب میں لکھی ہے، ایک قطعی دلیل اس بات کی کہ یہ لباس ذمیوں کا قدیم لباس تھا، یہ ہے کہ خلیفہ منصور نے اپنے دربار کے لیے جو لباس قرار دیا تھا، وہ قریب قریب یہی لباس تھا، لمبی ٹوپیاں جو نرسل کی ہوتی تھیں، وہی عجم کی ٹوپیاں تھیں جس کا نمونہ پارسیوں کے سروں پر آج بھی موجود ہے، اس درباری لباس میں پیٹی بھی داخل تھی، اور یہ وہی زنّار یا منطقہ یا کستیج ہے جو عجم کی قدیم وضع تھی، منصور کے اس مجوزہ لباس کی نسبت تمام مورخین عرب نے تصریح کی ہے کہ عجم کی تقلید کی تھی، اب یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو لباس حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے لیے قرار دیا تھا، وہ اگر کوئی جدید لباس تھا، اور ان کی تحقیر کے لیے ایجاد کیا گیا تھا، تو خلیفہ منصور اس کو اپنا اور اپنے دربار کا لباس کیونکر قرار

---

[1] کنز العمال جلد دوم ص ۳۰۲، [2] ص ۳۰۲، [3] ص ۱۰۰۔

دے سکتا تھا۔

صلیب اور ناقوس کی بحث ذمیوں کی نئی عبادت گاہیں بنانے، شراب بیچنے، صلیب نکالنے، ناقوس پھونکنے، اصطباغ دینے سے روکنا بے شبہہ مذہبی دست اندازی ہے، لیکن میں بے باکانہ اس راز کی پردہ دری کرتا ہوں، کہ یہ احکام جن قیدوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جاری کیے تھے، وہ بالکل مناسب تھے، لیکن زمانہ مابعد کے مورخوں نے ان قیدوں کا ذکر چھوڑ دیا، اور اس وجہ سے تمام دنیا میں ایک عالم گیر غلطی پھیل گئی۔

صلیب کی نسبت معاہدے میں جو الفاظ تھے، اس میں یہ قید تھی:

ولا یرفعوا فی نادی اهل الاسلام صلیباً[1] — یعنی مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ نکالیں۔

ناقوس کی نسبت یہ تصریح تھی:

یضربوا نواقیسهم فی ای ساعة شآؤا من لیل او نهار الافی اوقات الصلوٰة[2] — یعنی ذمی رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں، بہ جز نماز کے اوقات۔

سور کی نسبت یہ الفاظ تھے:

ولا یخرجوا خنزیرا من منازلهم الی افنیة المسلمین — یعنی ذمی سور کو مسلمانوں کے احاطہ میں نہ لے جائیں۔

ان تصریحات کے بعد کس کو شبہہ رہ سکتا ہے کہ صلیب نکالنا یا ناقوس بجانا عموماً ممنوع نہ تھا، بلکہ خاص حالات میں ممانعت تھی، اور ان حالات میں آج بھی ایسی ممانعت خلاف انصاف نہیں کہی جاسکتی، سب سے زیادہ قابل لحاظ امر بنی تغلب عیسائیوں کی اولاد کا اصطباغ نہ دینا ہے، عیسائیوں میں یہ دستور ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بلوغ سے پہلے اصطباغ دے دیتے ہیں، اور یہ گویا اس بات کی حفاظت ہے کہ آئندہ وہ کوئی اور مذہب قبول نہ کرنے پائے، بعینہٖ اس طرح جس طرح ہم مسلمانوں میں بچہ کا ختنہ کیا جاتا ہے، بے شبہہ حضرت عمرؓ کو عام طور پر اس رسم کے روکنے کا کچھ حق نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں ایک نیا سوال پیدا ہوا تھا، یعنی یہ کہ اگر عیسائی خاندان

[1] کتاب الخراج ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۸۶

میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے، اور نابالغ اولاد چھوڑ کر مرے، تو اس کی اولاد کس مذہب کے موافق پرورش پائے گی؟ یعنی وہ مسلمان سمجھی جائے گی، یا ان کے خاندان والوں کو جو عیسائی مذہب رکھتے ہیں، یہ حق حاصل ہوگا، کہ اس کو اصطباغ دے کر عیسائی بنائیں، حضرت عمرؓ نے اس صورت خاص کے لیے یہ قرار دیا کہ خاندان والے اسکو اصطباغ نہ دیں اور عیسائی نہ بنائیں۔ اور یہ حکم بالکل قرین انصاف ہے، کیونکہ اس کا باپ مسلمان ہوگیا تھا تو اس کی نابالغ اولاد بھی بظاہر مسلمان قرار پائے گی، علامہ طبری نے جہاں بنو تغلب کے واقعہ کا ذکر کیا ہے، شرائط صلح میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں

علی ان لا ینصروا ولیدا ممن اسلم اٰباءھم[1]،	یعنی بنو تغلب کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ جن کے باپ مسلمان ہو چکے، انکی اولاد کو عیسائی بنا سکیں،

ایک اور موقع پر یہ الفاظ ہیں، ان لا ینصروا اولادھم اذا اسلم آباؤھم[2]

یہاں شاید یہ اعتراض ہو کہ حضرت عمرؓ نے ایک فرضی صورت قائم کرکے معاہدہ کو کیوں سخت کیا، لیکن جواب یہ ہے کہ یہ فرضی صورت نہ تھی، بلکہ بنو تغلب میں بہت سے لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، اس لیے ان کی خاص حالت کے لحاظ سے اس صورت کا ذکر ضرور تھا، بلکہ علامہ طبریؒ[3] نے صاف تصریح کی ہے کہ تغلب میں سے جو لوگ اسلام لا چکے تھے، خود انہی نے معاہدہ کے یہ شرائط پیش کیے تھے۔

اب ہر شخص انصاف کر سکتا ہے کہ امن عام میں خلل نہ واقع ہونے کے لیے عیسائیوں کو اگر یہ حکم دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی مجلسوں میں صلیب اور سؤر نہ لائیں۔ خاص نماز کے وقت ناقوس نہ بجائیں، نو مسلم عیسائیوں کی اولاد کو اصطباغ نہ دیں، تو کیا کوئی شخص اس کو تعصب مذہبی سے تعبیر کر سکتا ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ ہمارے پچھلے مورخوں نے ان احکام کی قیدیں اور خصوصیتوں کو اڑا دیا، بلکہ قدماء میں جو تعصب آمیز طبیعت رکھتے تھے، روایت میں ان خصوصیتوں کو چھوڑ جاتے تھے، یہ غلطیاں اگرچہ نہایت سخت نتائج پیدا کرتی تھیں، لیکن چونکہ ظاہر میں خفیف تھیں، ابن الاثیر وغیرہ نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا، رفتہ رفتہ یہ غلطیاں اس قدر پھیل گئیں کہ عربی زبان سر تا پا اس سے معمور ہو گئی، فقہاء چونکہ تاریخ سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے

---

[1] طبری ص ۲۴۸۲، [2] طبری ص ۲۵۱۰، [3] ایضاً ص ۲۵۰۹،

بے تکلف ان کی غلط روایتوں کو قبول کر لیا، اور ان پر فقہ کے مسائل تفریع کر لیے،

عیسائیوں اور یہودیوں کے جلاوطن کرنے کا معاملہ

عیسائیوں اور یہودیوں کے جلاوطن کرنے کا معاملہ، اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہودی کسی زمانہ میں مسلمانوں کی طرف سے صاف نہیں ہوئے، خیبر جب فتح ہوا تو ان سے کہدیا[1] گیا کہ جس وقت مناسب ہوگا تم کو یہاں سے نکال دیا جائے گا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کی شرارتیں زیادہ ظاہر ہوئیں، عبد اللہ بن عمرؓ کو ایک دفعہ بالاخانے سے ڈھکیل دیا، جس سے اُن کے ہاتھ میں زخم آیا، مجبوراً حضرت عمرؓ نے عام مجمع میں کھڑے ہوکر ان کی شرارتیں بیان کیں، اور پھر ان کو عرب سے نکال دیا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الشروط میں یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے،

نجران کے عیسائی یمن اور اس کے اطراف میں رہتے تھے، اور ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا تھا، لیکن انھوں نے چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کیں، اور بہت سے گھوڑے اور ہتھیار مہیا کیے، حضرت عمرؓ نے صرف اس ضرورت سے ان کو حکم دیا کہ یمن چھوڑ کر عراق چلے جائیں[2]،

غرض یہ تمام تاریخی شہادتوں سے قطعاً ثابت ہے کہ عیسائی اور یہودی پولٹیکل ضرورتوں کی وجہ سے جلاوطن کیے گئے، اور اس وجہ سے یہ امر کسی طرح اعتراض کے قابل نہیں ہو سکتا، البتہ لحاظ کے قابل یہ ہے کہ اس حالت میں بھی کسی قسم کی رعایت ان کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی، فدک کے یہودی جب نکالے گئے، تو حضرت عمرؓ نے ایک واقف کار شخص کو بھیجا کہ ان کی زمین اور باغوں کی قیمت کا تخمینہ کرے، چنانچہ جو قیمت متعین ہوئی حضرت عمرؓ نے ان کو بیت المال سے دلوادی[3]، اسی طرح حجاز کے یہودیوں کو بھی ان کی زمین کی قیمت دلوائی[4]،

نجران کے عیسائیوں کو جب عرب کی آبادی سے نکال کر شام و عراق میں آباد کیا، تو ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ رعایتیں کیں، ان کو امن کا جو پروانہ دیا اس میں یہ شرطیں لکھیں:

"عراق یا شام جہاں یہ لوگ جائیں وہاں کے افسران کی آبادی اور زراعت کے لیے ان کو زمین دیں، جس مسلمان کے پاس یہ کوئی فریاد لے جائیں، وہ ان کی مدد کرے، چوبیس مہینے تک ان سے مطلقاً جزیہ نہ لیا جائے"

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۹۔ [2] کتاب الخراج ص ۷۲۔ [3] فتوح البلدان ص ۳۴۔ [4] ایضاً،

اس معاہدے پر احتیاط اور تاکید کے لحاظ سے بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دستخط ثبت کرائے، چنانچہ قاضی ابو یوسف صاحب نے کتاب الخراج میں اس معاہدے کو بالفاظہا نقل کیا ہے[1]۔

ایک ایسی فوج جس کی نسبت بغاوت اور سازش کے ثبوت موجود ہوں، اس کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کیا رعایت کی جاسکتی ہے۔

(الفاروق حصہ دوم ص ۱۴۶ تا ۱۵۲ تحریر ۱۸۹۸ء)

---

[1] کتاب مذکور ص ۴۱

تمدن اسلام

مصنفہ

جرجی زیدان

کی

پردہ دری

"جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف نے یہ کتاب چار حصوں میں لکھی ہے جس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کتاب میں مصنف نے درپردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں، لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی، اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔

میں اس حالت کو دیکھ رہا تھا، لیکن قلتِ فرصت کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ فاضل کے امتحان میں اس کے داخلِ نصاب کرنے کی رائے دی گئی، اور حال ہی میں اس نے عال میں ایک مضمون لکھا کہ حضرت عمرؓ کا کتب خانۂ اسکندریہ کو جلانا ثابت ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے اس کو تمدنِ اسلام میں جدید دلائل سے ثابت کر دیا ہے۔

ان واقعات نے مجبور کر دیا کہ میں اس کی فریب کاریاں تفصیل کے ساتھ ناظرین کے پیش نظر کر دوں۔ اصل مضمون عربی میں لکھا ہے، اور اس کو نہایت وسعت دی ہے، اردو میں مختصر کر دیا ہے، اور طرزِ تحریر بھی معمولی ہے۔"

مصنف کا اصل مقصد کیا ہے؟ آج کل یورپ میں تصنیف کا ایک طرز یہ ہے کہ مصنف کسی خاص قسم کے واقعات جب ملک میں پھیلانا چاہتا ہے، تو اس پر مستقل حیثیت سے کوئی کتاب نہیں لکھتا، بلکہ کوئی ناول لکھتا ہے، جس میں ان واقعات کو بجا بجا ضمنی موقعوں میں لایا جاتا ہے، اور اس طرح دلچسپی کے ساتھ ان تمام واقعات کو گوش آشنا کر دیتا ہے، اسی قسم کا طریقہ مصنف نے اختیار کیا ہے، اس کے اہم مقاصد جس کے لیے اس نے یہ کتاب لکھی ہے حسب ذیل ہیں:

(۱) عرب کی تحقیر اور ان کی مذمت،

(۲) خلفائے (بنو امیہ و عباسیہ) مذہب کی توہین کرتے تھے، یہاں تک کہ منصور نے بغداد میں کعبہ کی تحقیر کے لیے قبہ خضرا بنوایا، اور معتصم نے سامرہ میں کعبہ اور صفا و مروہ تعمیر کیا،

(۳) مسلمانوں پر عام اعتراضات،

ان مضامین پر مصنف اگر کوئی مستقل کتاب لکھتا تو لوگ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، اس لیے اس نے تاریخی واقعات کے پردہ میں ان مضامین کو ادا کیا، اور آہستہ آہستہ یہ زہر اس طرح سرایت کر گیا کہ لوگوں کو خبر بھی نہ ہونے پائی،

مصنف نے ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے، ان کی تفصیل ذیل میں ہے:

(۱) صریح کذب و دروغ،

(۲) روایات کی نقل میں خیانت اور تحریف،

(۳) کسی صحیح واقعہ میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کر دینا کہ واقعہ کی صورت بدل جائے،

(۴) غلط استنباط اور استدلال،

ہم پہلے مصنف کے مقاصد کو کسی قدر تفصیل سے دکھاتے ہیں،

کتاب کا ایک بڑا موضوع بنو امیہ کی برائی اور عیب گیری ہے، جس کے ضمن میں دراصل عرب پر حملہ کرنا مقصود ہے، کتاب کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

وکان من جملة نتائج تعصب بنی امیة — بنو امیہ جو عرب کی طرف داری اور تمام دنیا

للعرب واحتقارهم البلاد والامم انهم اعتبروا اهل البلاد التی فتحوها وما یملکون رزقا حلالا لهم (حصہ دوم ص۱۹)

کی تحقیر کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مفتوحہ شہروں کے لوگوں کو اور ان کے دولت ومال کو شیر مادر سمجھتے تھے۔

وکان عمال بنی امیة یجورون علی اصحاب الارضین من اهل الذمة فی التحصیل ونحوه (حصہ دوم ص۱۹)

بنی امیہ کے عمال زمین داروں پر مال گزاری وغیرہ کے وصول کرنے میں ظلم کرتے تھے۔

ولم یکن عمال بنی امیة یاتون هذه الاعمال من عندانفسهم وانمابل کثیرا ماکانوا یفعلونه بامر خلفائهم (حصہ دوم ص۴۳)

اور بنو امیہ کے عمال یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کرتے تھے، بلکہ اکثر خلفا کے حکم سے کرتے تھے۔

وکان بنوامیة قدانغمسوا فی الترف واللهو والخمر (حصہ دوم ص۲٦)

اور بنو امیہ عیش پرستی اور لہو ولعب اور شراب میں ڈوب گیے تھے۔

وکان العمال لایرون حرجا فی ابتذار الاموال من اهل البلاد والتی فتحوها عنوة (حصہ چہارم ص۷۵)

اور عمال بنو امیہ مفتوحہ قوموں کے مال چھین لینے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔

الاستهانة بالقرآن والحرمین (حصہ چہارم ص۷۸)

قرآن مجید اور حرمین کی توہین۔

فان اهل الذمة وغیر هم من سکان البلاد الاصلین قاسوا من خلفاء بنی امیة ومن عمالهم الامور الصعاب حتی الذین اسلموا منهم فان العرب کانوا یعاملونهم معاملة العبید

ذمی اور دیگر اصلی باشندوں نے بنو امیہ اور ان کے ملازموں کے ہاتھ سے سخت مصیبتیں جھیلیں، حتی کہ ان لوگوں نے بھی جو مسلمان ہو گیے تھے کیوں کہ عرب ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔

وعظم امر الخلافة حتی فضلها علی النبوة فکان یقول ماقامت السموات
ای الحجاج

اور حجاج نے خلافت کے رتبہ کو اس قدر بڑھایا کہ نبوت پر اس کو فضیلت دی، چنانچہ

والارض الا بالخلافة وان الخليفة	کہتا تھا کہ آسمان اور زمین خلافت سے قائم
عند الله افضل من الملائكة المقربين	ہوئے ہیں، اور خلیفہ خدا کے نزدیک مقرب
والانبياء والمرسلين (حصہ چہارم ص ۹۹)	فرشتوں اور انبیا، اور رسول سے بڑھکر ہے،

ان باتوں کے ثابت کرنے کے لیے مصنف نے بنو امیہ کے عجیب عجیب ظلم کے واقعات لکھے ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی،

بنو امیہ کی برائی اگر بنو امیہ کی خصوصیت کی بنا پر کی جائے تو ہم کو اس سے بحث نہیں، بنو امیہ یا عباسیہ اسلام کے نمونے نہیں ہیں، وہ خلفاء نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے، اس لیے اور سلاطین کی طرح ہر قسم کے عیوب ان میں ہوسکتے تھے، لیکن مصنف کی عنایت بنو امیہ پر اس لحاظ سے ہے کہ وہ اصلی عرب اور عربی قومیت کے نمونے تھے، ان کے اوصاف واخلاق وعادات، وہ اصلی عربی اخلاق وعادات ہیں، چنانچہ مصنف عصر بنی امیہ کا ایک خاص عنوان قائم کرکے لکھتا ہے:

وتمتاز عن الدولة العباسية بانها	اور سلطنت بنو امیہ، دولت عباسیہ سے
عربية بحتة، (حصہ دوم ص ۱۸)	اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ خالص عربی حکومت ہے،
وجملة القول ان الدولة الاموية	اور مختصر یہ ہے کہ سلطنت اموی عربی
دولة عربية (حصہ چہارم ص ۱۰۳)	سلطنت تھی،

مصنف نے جس قدر بنو امیہ کی مذمت اور برائی کی ہے، اسی قدر عباسیہ کی مدح اور تعریف کی ہے لیکن نہ اس لحاظ سے کہ وہ کوئی عربی سلطنت تھی، بلکہ اس بنا پر کہ وہ ایرانی سلطنت تھی، چنانچہ وہ عباسی حکومت کو ایرانی حکومت قرار دیتا ہے، حصہ چہارم میں اس نے عباسیوں کی سلطنت کا جہاں ذکر شروع کیا ہے، اس کی سرخی یہ لکھی ہے، "العصر الفارسی الاول" اس کے نیچے لکھتا ہے:

دعونا هذا العصر فارسيا مع انه	ہم نے اس زمانہ کو فارسی کہا، حالانکہ وہ عباسی
داخل فی عصر الدولة العباسية لان	حکومت کا زمانہ ہے، یہ اس بنا پر کہ عباسی
تلك الدولة على كونها عربية من حيث	حکومت اگرچہ اپنے خلفاء اور مذہب اور

خلافتها ولغتها ودیانتها فهی فارسیة من حیث سیاستها وادارتها لان الفرس نصروها وایدوها ثم هم نظموا حکومتها وادارها وهم وزراؤها وامراؤها وکتابها وحجابها،

زبان کے لحاظ سے عربی تھی، لیکن پالیٹکس کے لحاظ سے ایرانی تھی، کیونکہ ایرانیوں نے ہی کی اعانت کی اور انہی نے اس کی حکومت کا انتظام کیا، اور اس کے کاروبار چلائے اور ایرانی ہی اس سلطنت کے وزیر اور افسر اور کاتب اور دربان تھے،

عام عرب کی نسبت مصنف لکھتا ہے کہ وہ نومسلموں کو سخت حقیر سمجھتے تھے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ نماز تین چیزوں کے سامنے گذر جانے سے ٹوٹ جاتی ہے، گدھا، کتا، اور نومسلم، امیر معاویہ (رضؓ) نے قصد کیا تھا کہ تمام نومسلموں کو یا ان میں سے ایک حصہ کو محض اس وجہ سے قتل کر دیں، کہ وہ غیر قوم ہیں، گویا یہ لوگ بھیڑ، بکریاں تھیں، عرب کو یہ غرور اس وجہ سے ہو گیا تھا، کہ وہ اونٹ چراتے چراتے تختِ حکومت تک پہونچے تھے،

خلفاء کا کعبہ اور شعار اسلام کی توہین کرنا

مصنف نے جابجا اور ایک موقع پر خاص عنوان قائم کر کے ثابت کیا ہے، کہ خلفاء مذہبی شعائر کی تحقیر کرتے تھے، ایک موقع پر لکھتا ہے:

فخبب بعضهم الی المنصوران یستبدل الکعبة بما یقوم مقامها فی العراق وتکون حجا للناس تبنی بناء اسماه القبة الخضراء تصغیرا للکعبة و قطع المیرة عن المدینة،

(حصۂ دوم ص ۱۰۳)

بعضوں نے منصور کو اس طرف مائل کیا کہ کعبہ کے بدلے عراق میں کوئی عمارت بنائے جس کا لوگ حج کیا کریں، چنانچہ اس نے ایک مکان بنایا جس کا نام قبۂ خضرا رکھا، تاکہ کعبہ کی حقارت ہو، اور مدینہ میں غلہ بھیجنا بند کر دیا،

ایک موقع پر خلیفہ معتصم کے حال میں لکھتا ہے:

فانشاء فیها کعبة وجعل حولها طوافاو

معتصم نے سامرہ میں ایک کعبہ اور منیٰ اور

ھ ‌اتخذ منٰی و عرفات (حصہ دوم ص ۳۲) عرفات قیام کرایا،

خلفائے بنو امیہ کی نسبت اس قسم کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں، لیکن ان کی تفصیل کی اس لیے ضرورت نہیں کہ بنو امیہ تو بہر حال مصنف کے نزدیک گردن زدنی تھے، ان کے کسی فعل کی کیا شکایت ہو سکتی ہے، لطف تو یہ ہے کہ اپنے ممدوحین یعنی خلفائے عباسیہ کی نسبت یہ ثابت کیا ہے، کہ ان کے زمانہ میں عرب اس قدر حقیر کر دیے گئے تھے، کہ عرب کا لفظ سب سے بدتر لفظ خیال کیا جاتا تھا، لوگ کہتے تھے کہ "عرب کتے ہیں، ان کے آگے روٹی کا ٹکڑا ڈال دو پھر ان کے سر پر مارو،" مصنف کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

فاصبح لفظ عربی مرادفا لاحقر الادمیین عند ھم ومن اقوالھم العربی بمنزلۃ الکلب اطرح لہ کسرۃ واضرب راسہ۔	عربی کا لفظ بدتر سے بدتر لقب کا مرادف بن گیا تھا، اور ان کا مقولہ تھا، کہ عرب کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈال دو، پھر اس کے سر پہ مارو،

اس موقع پر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس میں مصنف کا کیا قصور ہے، یہ تاریخی واقعات ہیں مصنف نے ان کو نقل کر دیا، اور سند بھی نقل کر دی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے ان عبارتوں کی نقل میں سخت تحریف اور خیانت سے کام لیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے،

مصنف[1] نے اس تصنیف میں مختلف طریقوں سے کام لیا ہے، کہیں علانیہ جھوٹے حوالے دیتا ہے کہیں عبارت

---

[1] ایک امر کا اظہار اس موقع پر ضروری ہے، مصنف نے جب اس کتاب کا پہلا حصہ مجھکو بھیجا تو میں نے اجمالاً کتاب کی تعریف کی لیکن چونکہ میں مصنف کی عادت سے واقف تھا، اس لیے میں نے اسکو خط لکھا کہ آپکو واقعات میں کتابوں کا حوالہ دینا چاہیے، چنانچہ مصنف نے میرے اس خط کو تمدن اسلام کے دوسرے حصہ میں نقل کیا ہے، اور میری تحریک کے مطابق پچھلے حصوں میں حوالے دیئے ہیں، لیکن اسمیں یہ چالاکی کی کہ چھاپے کی تعیین نہیں کرتا، اکثر کتابیں مصر میں بار بار چھپی ہیں، مصنف ان کے حوالے دیتا ہے، اور یہ نہیں بتاتا کہ کون سے چھاپے کے صفحے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن الاثیر، مسعودی وغیرہ کے جو کثرت سے مصنف نے حوالے دیئے ہیں، میں نے مقابلہ کیا، تو میرے پاس جو نسخے تھے ان میں وہ عبارتیں نہیں ملیں، لیکن مصنف یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے کسی اور نسخہ کا حوالہ دیا ہے، اس کارروائی کی وجہ سے مصنف کی بہت سی خیانتوں کا پردہ رہ گیا، در جن کتابوں میں اسکے حوالے میرے نسخہ سے مطابق نکلے، ان میں ایک موقع بھی مجھکو ایسا نہ ملا، کہ مصنف نے سخت خیانت نہ کی ہو،

ادل بدل کر دیتا ہے، کہیں ایک خاص واقعہ کو عام کر دیتا ہے، اور اس سے عام نتیجہ نکالتا ہے، کہیں اپنی موافق ایک واقعہ کو نقل کرتا ہے، اور اس کے مخالف بہت سے صحیح واقعات ہیں، ان کو چھوڑ جاتا ہے، کہیں استدلال اور استنباط میں غلطی کرتا ہے۔ (اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے):

صریح جھوٹ | ا- تمدنِ اسلام کے حصہ دوم میں ''عصر بنی امیہ'' کا ایک عنوان قایم کیا ہے، جس کے ذیل میں بنوامیہ اور عمالِ بنوامیہ کے تمام مظالم گنائے ہیں، اس میں من جملہ ان مظالم کے ایک یہ لکھا ہے:

واذا اتی احد هم بالدر اهم ليوديها في خراجه يقتطع الجابي منها طائفة ويقول هذا رواجها في صرفها	اور جب ان کے پاس کوئی شخص مال گزاری ادا کرنے کے لیے روپیہ لاتا تھا، تو تحصیل دار اس میں سے کچھ روپیہ نکال لیتا تھا اور کہتا تھا کہ روپیہ کا نرخ اور چلن اسی قدر ہے۔

اس عبارت کی نسبت حاشیہ میں کتاب الخراج قاضی ابو یوسف (ص۶۲) کا حوالہ دیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ قاضی صاحب نے ہارون الرشید کی فرمایش سے مال گزاری اور جزیہ وغیرہ کے متعلق ایک دستور العمل لکھ کر پیش کیا تھا، اس میں ایک موقع پر ایک عنوان قایم کیا ہے، اس کے ذیل میں ہارون الرشید کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ فلاں فلاں محصول نہ لیے جائیں، اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

فانه بلغني ان الرجل منهم ياتي (الٰی اٰخره)	مجھ کو خبر لگی ہے کہ کوئی شخص جب ان کے پاس آتا ہے،

اس عبارت میں بلکہ اس موقع پر بنوامیہ کا مطلق ذکر نہیں، قاضی صاحب ہارون الرشید کو مخاطب کر کے اس کے عاملوں کا حال لکھتے ہیں، مصنف نے اس کو بنی امیہ کے زمانے سے منسوب کر دیا۔

۲- مصنف اسی عنوان کے ذیل میں (ص۱۳) بنوامیہ کے عمال کے بہت سے ظلم گنا کر لکھتا ہے:

وفي كلام القاضي ابي يوسف في عرض وصية للرشيد بشأن عمال الخراج مايبين الطرق التي اولٰئك الصغار يجمعون الاموال	قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید کو عمالِ خراج کے بارہ میں جو وصیت لکھی تھی، اس سے وہ طریقے معلوم ہو سکتے ہیں جن سے چھوٹے

تھا ، (کتاب الخراج ص ۱۹۲ و ۱۹۳)   چھوٹے عمال وصیت جمع کرتے تھے ،

قاضی صاحب نے لکھا ہے (مصنف نے وہ تمام عبارت نقل کی ہے) کہ یہ عمال رعایا کو دھوپ میں بٹھاتے تھے ، احاطات میں [illegible] کرتے تھے ، اور اس طرح زنجیروں میں جکڑتے تھے کہ وہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے ، لیکن اس میں ایک [illegible] نہیں ، قاضی صاحب نے خلیفہ ہارون الرشید کو مخاطب کرکے اس کے عاملوں کا حال لکھا ہے ، اسی بنا پر اسی عنوان کے ذیل میں ہارون الرشید کو مخاطب کیا ہے ، کہ کاش تو مہینہ دو مہینہ میں ایک دفعہ بھی دربار کرتا اور لوگوں کی فریاد سنتا ، اس کے بعد لکھتے ہیں :

ولعلك لا تجلس الا مجلسا او مجلسين	اور غالباً تو ایک ہی دو اجلاس کرتا تو تمام
حتی يسير ذلك فی الامصار والمدن	ملک میں یہ خبر پھیل جاتی ، اور ظالموں کو یہ ڈر
فيخاف الظالم وقوفك على ظلمه فلا	ہوتا کہ تجھ تک خبر نہ پہنچ جائے ، اس بنا پر ظالم
يجترئ على الظلم ،	کو ظلم پر جرأت نہ ہوتی ،

مصنف نے جا بجا عباسیوں کے عدل و انصاف کی بے انتہا تعریف کی ہے ، لیکن عباسیوں کا سرتاج ہارون الرشید تھا ، اور اس کے زمانہ کے عمال کا یہ حال ہے ،

ہمارے مصنف نے ان سب کو بنو امیہ کے نامۂ اعمال میں داخل کر دیا ، کیا دنیا میں اس سے زیادہ کذب و افترا کی مثال مل سکتی ہے ،

(۳) مصنف نے لکھا ہے کہ عباسیوں کے زمانہ میں ایرانیوں نے یہ خیال کیا کہ جب تک عرب اور حرم کعبہ کا اثر کم نہ کیا جائے گا ، ہم کو کامیابی نہ ہوگی ، اس لیے انھوں نے خلیفہ منصور کو اس پر آمادہ کیا کہ عراق میں کعبہ کا جواب بنائے ، چنانچہ منصور نے کعبہ کی تحقیر کے لیے ایک عمارت بنائی ، جس کا نام قبہ خضرا تھا ، مصنف کے اخیر الفاظ یہ ہیں :

فرغب بعضهم الی المنصور ان	اس بنا پر بعضوں نے منصور کو اس طرف رغبت
يستبدل الكعبة بما يقوم مقامها فی العراق	دلائی کہ وہ عراق میں کعبہ کا جواب بنائے اور
وتكون حج الناس فبنی بناء سماه القبة	لوگوں سے اس کا حج کرائے ، چنانچہ اس نے

الخضراء تصغیراً للکعبۃ (تمدن اسلام حصہ دوم ص ۳۰)	کعبہ کی حقارت کے لیے قبۂ خضرا بنایا۔

اس عبارت کے خاتمہ پر حاشیہ میں طبری (ص ۱۹۷) کا حوالہ دیا ہے، اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ جب خلیفہ منصور کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے علم بغاوت بلند کیا، تو ایک خطبہ دیا جس میں یہ الفاظ تھے۔

اما بعد ایها الناس فانه کان من امر هذا	حمد خدا کے بعد اے صاحبو! اس سرکش (منصور)
الطاغیة عدو الله ابی جعفر ما لم یخف علیکم من بنائه	دشمن خدا کا فعل آپ سے مخفی نہیں کہ اس نے
القبة الخضراء التی بناها معاندة لله فی ملکه و	قبۂ خضرا بنایا ہے، جس سے خدا کی دشمنی اور
تصغیرا للکعبة الحرام (طبری ص ۱۹۷)	کعبہ کی حقارت مقصود ہے،

یہی خطبہ ہے جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے، لیکن یہ منصور کے ایک دشمن کے الفاظ ہیں، کیا اس سے کسی تاریخی واقعہ کا اثبات ہو سکتا ہے، منصور کا زمانہ ائمہ مجتہدین، محدثین اور فقہاء سے معمور تھا، کیا اس زمانہ میں کسی کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ کعبہ کا جواب بنا سکے، کیا ایسا خلاف امکان واقعہ صرف ایک مخالف کی شہادت سے ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن فرض کرو کہ مخالف کے الفاظ صحیح بھی ہیں، تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ منصور نے یہ عمارت کعبہ کی تحقیر کے لیے بنائی ہے، اس میں یہ الفاظ کہاں ہیں کہ "لوگوں نے منصور کو یہ ترغیب دی کہ عراق میں کعبہ کا جواب بنائے، اور لوگوں سے حج کرائے۔ طبری میں اس عبارت کا ایک حرف بھی نہیں،

(۴) حصۂ دوم ص ۳۰ میں لکھا ہے کہ "خلیفہ منصور نے مدینہ منورہ میں دریا کی طرف سے غلہ وغیرہ جانا بند کر دیا تھا، جس سے یہ غرض تھی کہ حرمین کی وقعت کم ہو جائے، اس بنا پر لوگوں نے منصور سے بغاوت کی، اور محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی، منصور کو اس کارروائی سے جو مشکلیں اٹھانی پڑیں وہ اس کے جانشینوں کے لیے عبرت کا سبق تھیں، اس لیے اس کے جانشین مہدی نے اس کی تلافی کی،

اس واقعہ میں کس قدر فریب اور خدع سے کام لیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ ایک مدت سے خلافت کا خیال پکا رہے تھے، جب انھوں نے علانیہ علم بغاوت بلند کیا، تو چونکہ وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس لیے منصور نے وہاں رسد کا بھیجنا بند کرا دیا، طبری میں ہے:

خبرہ بخروج محمد فقال المنصور نکتب	جب منصور کو محمد کی بغاوت کی خبر دی گئی تو اس

الساعة الى مصر ان يقطع عن	نے کہا کہ ابھی میں مصر کو لکھ دیتا ہوں کہ وہاں
الحرمين المادة ثم قال انماهم فى	سے حرمین کو جو مدد آتی ہے، بند کر دی جائے،
مثل حرجة اذاانقطعت عنهم المادة	جب یہ بند ہو جائے گی تو وہ بے دست و پا ہو
(طبری واقعات ۱۴۵ھ ص ۲۸۰)	جائیں گے۔

یہی مورخ ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:

لما قتل محمد امر ابوالجعفر	جب محمد قتل کر دیے گیے تو ابو جعفر منصور نے
بالبحر فاقل على اهل المدينة فلم	حکم دیا کہ جار کی بندرگاہ سے مدینے کو کوئی
يحمل اليهم من ناحية الجار شئ	چیز نہ جانے پائے۔

ان تمام عبارتوں سے صاف ثابت ہے کہ منصور نے محمد کی بغاوت کے فرو کرنے کے لیے یہ حکم دیا تھا، مصنف کی یہ دروغ بیانی دیکھو کہ اس واقعہ کو مقدم قرار دے کر اسی کو محمد کی بغاوت کا سبب قرار دیا ہے، اور کہتا ہے کہ اہل عرب نے اسی بنا پر محمد سے بیعت کی، اس کے علاوہ یہ بغاوت فرو کرنے کی ایک تدبیر تھی، اس کو حرمین کی تحقیر سے کیا تعلق ہے۔

مصنف کے کذب وافترا، فریب وتدلیس، غلط استدلالی، اگرچہ الگ الگ عنوان قایم کر کے تفصیل سے لکھے جا سکتے ہیں، لیکن ناظرین کو اس سے چنداں دل چسپی نہ ہوگی، اس لیے اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مصنف نے مسلمانوں پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان کا اظہار کیا جایے، اور اسی کے جواب کے ضمن میں مصنف کے یہ تمام کارنامے دکھایے جائیں، مصنف کا اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے امور ذیل کا ثابت کرنا ہے۔

کتاب کے چوتھے حصہ (ص ۵۸) میں مصنف نے ایک عنوان قایم کیا ہے "**عصبية العرب على العجم**" اس میں ثابت کیا ہے کہ اہل عرب تمام قوموں کو نہایت حقیر سمجھتے تھے، ان کا مقولہ تھا کہ نماز صرف تین چیزوں سے ٹوٹتی ہے "گدھا، کتا اور غیر عرب" غیر قوموں کے ساتھ ایک صف میں چلنا گوارہ نہیں کرتے تھے، ان کا نام کنیت کے ساتھ نہیں لیتے تھے، ان کو مذہبی عہدے نہیں دیتے تھے، خلفا کی جو اولاد عجمی عورت سے ہوتی تھی، ان کو منصب خلافت سے محروم کرتے تھے، امیر معاویہؓ نے یہ قصد کیا تھا کہ تمام عجمیوں کو یا ایک حصہ کو قتل کر دیں، وغیرہ وغیرہ۔

مصنف نے ان واقعات میں حسب معمول ان سب ہتھیاروں سے کام لیا ہے، جو فطرت نے اس کو عنایت کیے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ خلفائے بنوامیہ کے زمانے میں شعوبیہ ایک گروہ تھا، جو اہل عرب کی سخت تحقیر کرتا تھا، ان کے مقابلے میں عرب میں بھی ایک جماعت تھی، جو عجم کو حقیر سمجھتی تھی، تاریخ سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں میں سے ابتدا کس نے کی، عرب وعجم دونوں مغرور تھے، عجم کو اپنی قدیم عظمت اور شان وشوکت پر ناز تھا، عرب اپنی شجاعت وآزادی کا دم بھرتے تھے، اسلام کے بعد دونوں کا اختلاط ہوا، تو دونوں فرقے خود بہ خود پیدا ہوگیے، مصنف کا دعوا ہے کہ عرب اور بنوامیہ کے ظلم وتحقیر نے اس گروہ کو پیدا کیا تھا، لیکن عباسیہ تو مصنف کے نزدیک عدل وانصاف کے معیار تھے، اوران کے زمانے میں بہ قول مصنف (نقل کفر کفر نہ باشد) عرب کی عزت کتے کے برابر رہ گئی تھی، باوجود اس کے شعوبیہ کے مشاہیر اسی زمانے میں پیداہوے اوراسی زمانہ میں انہوں نے عرب کی برائیوں پر مفصل کتابیں لکھیں، ابوعبیدہ مثنیٰ جس نے عرب کے ایک ایک قبیلہ کے مطاعن پر الگ[1] الگ کتابیں لکھیں، عباسیہ ہی کے زمانہ میں تھا، علان شعوبی، مامون الرشید کے دربار کا ملازم تھا، بنوامیہ کے جرم کا کفارہ عباسیہ کے عہد میں کیوں لیا گیا۔

ایک بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ جہاں تک پتہ لگتا ہے، اہل عرب میں سے کسی نے کوئی تصنیف خود ابتداءً نہیں لکھی، بلکہ شعوبیہ کی تصنیفات کا جواب لکھا، بہ خلاف اس کے شعوبیہ کی بیسیوں کتابوں کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، ابوعبیدہ اور علان شعوبی کے علاوہ سہل بن ہارون جو مامون الرشید کے کتب خانہ پر مامور تھا، اس کے تذکرہ میں لکھا ہے:

شعوبی المذهب شديد العصبية على العرب وله فی ذالك كتب كثيرة (فہرست ص ۱۳۰)	وہ مذہباً شعوبی تھا اور عرب سے سخت تعصب رکھتا تھا، اوراس مضمون میں اس کی بہت سی کتابیں ہیں۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ عرب میں جو لوگ قومی تعصب رکھتے تھے، وہ چند افراد تھے، عام عرب نہ تھے، عقدالفرید میں ایک خاص باب قایم کیا ہے، جس کی سرخی "متعصبین عرب" ہے، اس کے تحت میں ان لوگوں کے اقوال

[1] کتاب الفہرست میں ان سب تصنیفات کے نام لکھے ہیں۔

لکھے ہیں، مصنف نے عربوں کے متعصبانہ اقوال وافعال جو نقل کیے ہیں، قریبًا کل یہیں سے لیے ہیں، لیکن عقد الفرید میں شروع ہی میں تصریح کردی ہے کہ،

قال اصحاب العصبیۃ من العرب،	عرب میں جو لوگ متعصب ہیں، انھوں نے یہ کہا ہے،

اس سے ظاہر ہوگا کہ یہ ایک گروہ خاص کے خیالات ہیں،

مصنف نے خیانت اور فریب کاری سے ان باتوں کو عام عرب کی طرف منسوب کر دیا ہے چنانچہ کہتا ہے:

وکان العرب فی ایام ھذہ الدولۃ یترفعون عن سائر الامم من الموالی واھل الذمۃ ویعدون انفسھم فوقھم جبلۃ وخلقۃ وفضلا فکان العربی یعد نفسہ سیدًا علی غیر العربی ویری انہ خلق للسیادۃ وذاک لخدمتہ، (حصہ چہارم ص ۵۹)	عرب اس سلطنت (بنو امیہ) کے زمانہ میں تمام قوموں سے اپنے آپ کو دور کھینچتے تھے، اور اپنے آپ کو فطرت میں، خلقت میں، فضیلت میں سب سے فائق سمجھتے تھے، عربی اپنے آپ کو غیر عربی کا آقا سمجھتا تھا، اور جانتا تھا کہ میں سرداری کے لیے پیدا ہوا ہوں، اور عجم خدمت گاری کے لیے،
وکانت العرب سکری بخمرۃ السیادۃ والنصر بارتقائھم من رعایۃ الابل الی سیاسۃ الملک، (حصہ ۴ ص ۶۰)	عرب افسری اور فتح کے نشہ میں اس وجہ سے چور تھے کہ وہ اونٹ چراتے چراتے حکومت کے رتبہ کو پہنچے تھے،

مصنف نے جس قدر سندیں نقل کی ہیں، سب ایک خاص گروہ یا خاص اشخاص کے اقوال ہیں، مصنف انکو تعریف پسندی کی بنا پر عام کر لیتا ہے، اور ان سے استدلال کرتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اس پر ناز ہے کہ اس نے عرب وعجم اور نسل وملک کی تمیز اٹھادی، اور تمام انسانوں میں عام مساوات قائم کردی، اسلامی تاریخیں ان واقعات سے معمور ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی غلط نمائی ان کا ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی،

عربی زبان میں مولیٰ ایک لفظ ہے، جس کے معنی دسیوں ہیں، یعنی غلام کو بھی کہتے ہیں، آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں اور عرب کے سوا اور قومیں جو ایمان لائیں، ان کو بھی کہتے ہیں، مصنف نے اس کی وسعت سے کام لیا ہے، یعنی جہاں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اہل عرب تمام غیر قوموں کو حقیر سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں وہ اقوال بھی پیش کیے ہیں، جو غلاموں کے حق میں تھے، تاہم ہم اس دائرہ کی وسعت کو کم نہ کریں گے، اور دکھائیں گے کہ عرب میں غیر قوموں اور غلاموں کی کیا وقعت تھی،

عرب میں اور تمام مسلمانوں میں عزت کا اصلی معیار مذہبی عزت تھا، یعنی جن کو مذہبی عزت حاصل ہے، انکو ہر قسم کی عزت حاصل ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مجتہدین، فقہا، اور علمائے مذہبی کو جو اعزاز حاصل تھا کسی کو کبھی نہیں ہوا،

مصنف نے نہایت زور شور سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عرب کا غرور، اور غیر قوموں کی تحقیر بنوامیہ کے زمانہ میں انتہا درجہ تک پہنچ گئی تھی، چنانچہ لکھتا ہے:

فلما بالغ بنو امیۃ فی الاستخفاف بغیر العرب (حصہ چہارم ص ۶۰)	پھر جب بنوامیہ نے غیر عرب والوں کی تحقیر کی انتہا کر دی،

اس بنا پر ہم اسی زمانہ کو اس بحث کا معیار قرار دیتے ہیں،

یہ وہ زمانہ تھا کہ حدیث و فقہ کا شباب تھا، اور بڑے بڑے محدثین وائمہ تمام صدر مقامات میں فقہ وحدیث کے درس و تدریس میں مشغول تھے، یہ لوگ ان مقامات میں پیشوا تسلیم کیے جاتے تھے، تمام قوم ان کا ادب کرتی تھی اور سلطنت کی طرف سے ان کا احترام کیا جاتا تھا، اس زمانے میں جو مقامات مذہبی علوم کے تخت گاہ تھے، مکہ، یمن، شام، مصر، بصرہ، کوفہ، خراسان، جزیرہ تھے، ان مقامات میں جو لوگ مذہبی علوم کے تاجدار تھے، ان کے یہ نام ہیں:

مکہ معظمہ	عطاء بن ابی رباح، یہ امام ابوحنیفہ کے استاذ تھے،
یمن	طاؤس، ہشام بن عبد الملک نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی تھی، (معارف)
شام	مکحول، امام زہری کا قول ہے کہ عالم صرف چار ہیں، انہیں سے ایک مکحول ہیں،
مصر	یزید بن ابی حبیب، مصر میں فقہ کے معلم اول یہی ہیں، عمر بن عبد العزیز رضؓ نے

	ان کو مصر میں فتویٰ دینے پر مقرر کیا تھا (حسن المحاضرہ)
جزیرہ	میمون بن مہران، عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کو جزیرہ کا افسر خراج مقرر کیا تھا (معارف)
خراسان	ضحاک بن مزاحم، مشہور مفسر ہیں
بصرہ	امام حسن بصری، مشہور امام ہیں،
کوفہ	ابراہیم نخعی

ہمارے مصنف (جرجی زیدان) کو توجہ سے سننا چاہیے کہ ابراہیم نخعی کے سوا یہ سب عجمی غلام تھے، اور یہ سب عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں تھے، جو مصنف کے نزدیک بدترین خلفاء تھا، حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ میں منادی پکارتا تھا کہ عطاء بن ابی رباح کے سوا کوئی فتویٰ نہ دینے پائے، ابن خلکان میں ہے (تذکرہ عطاء بن ابی رباح)

قال ابراهيم بن عمرو بن كيسان اذكرهم	ابراہیم کا بیان ہے کہ مجھ کو یاد ہے کہ حج کے
فی زمان بنی امیة یامرون فی الحج صائحا	زمانے میں ایک شخص کو مقرر کرتے تھے، جو
یصیح لا یفتی الناس الا عطاء بن ابی رباح،	یہ پکار کر کہتا تھا کہ عطاء کے سوا کوئی شخص
	فتویٰ نہ دینے پائے،

یزید بن عبد الملک جب خلیفہ ہوا، اور عمر بن ہبیرہ کو عراق کی گورنری ملی، تو ۱۰۳ھ ہجری میں اس نے امام حسن بصری، شعبی اور ابن سیرین کو بلا بھیجا، اور ان سے کہا کہ یزید کے جو احکام آتے ہیں، مجھ کو ان کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، آپ صاحبوں کی کیا رائے ہے، امام حسن بصری نے کہا ابن[1] ہبیرہ تجھ کو خدا سے ڈرنا چاہیے، نہ یزید سے، ابن ہبیرہ نے اس پر حسن بصری کو صلہ دیا، (ابن خلکان تذکرہ حسن بصری)

ہمارے مصنف کو دوبارہ سننا چاہیے کہ یہ تینوں شخص جو اس حیثیت سے بلائے گئے تھے کہ اُن کی آواز قوم کی مذہبی آواز ہے، ان میں سے دو شخص یعنی حسن اور ابن سیرین غلام تھے،

۱۰۶ھ ہجری میں طاؤس کا جب مکہ معظمہ میں انتقال ہوا تو جنازہ میں لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ جنازہ چل نہیں سکتا تھا، مجبوراً ابراہیم بن ہشام گورنر کو پولیس سے کام لینا پڑا، عبد اللہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے صاحبزادے

---

[1] فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۰۸،

جنازہ کاندھے پر لے کر چلے، اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے جنازہ کی نماز پڑھائی[1]، کیا اس سے زیادہ کسی کی عزت کی جاسکتی ہے،

تابعین[2] کا گروہ اسلام میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے، اس گروہ میں بڑے بڑے امام اور پیشوا گذرے ان سب میں سب عالی رتبہ حضرت سعید بن جبیر تھے، وہ حبشی غلام تھے[3]، مصنف نے دعوی کیا ہے کہ اہل عرب غیر عرب کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، اور یہ تعصب سب سے زیادہ بنی امیہ کے زمانہ میں تھا، لیکن خود حجاج بن یوسف نے سعید بن جبیر کو کوفہ میں نماز کا امام مقرر کیا تھا، حالانکہ کوفہ عرب کی خاص آبادی تھی،

علم ادب کا امام مطلق حماد راویہ تھا، سبعہ معلقہ کے قصیدے اسی نے مدوّن کیے، علامہ ابن خلکان اس کی نسبت لکھتے ہیں:

وكانت ملوك بني امية تقدمه وتؤثره وتستزيره،	سلاطین بنو امیہ اس کی عزت کرتے تھے، اور اس کو اوروں پر ترجیح دیتے تھے، اور اسکی ملاقات کی خواہش کرتے تھے،

ہشام بن عبدالملک جب خلیفہ ہوا تو پانچسو اشرفیاں زاد راہ بھیجکر اس کو دربار میں طلب کیا، چنانچہ ابن خلکان نے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، یہ معزز اور محترم فاضل دیلمی غلام تھا،

سلیمان اعمش جو امام حدیث اور سفیان ثوری کے استاذ تھے، وہ بھی عجمی غلام تھے، اور ان کا یہ رتبہ تھا کہ جب خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے ان کو خط لکھا کہ حضرت عثمانؓ کے مناقب اور علیؓ کے معائب لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے، تو انھوں نے ہشام کے خط کو قاصد کے سامنے بکری کے منہ میں دے دیا، کہ وہ چبا گئی، اور قاصد سے کہا کہ ہشام سے کہدینا کہ اس کے خط کا یہی جواب ہے، (ابن خلکان تذکرہ سلیمان اعمش)

حدیث و روایت کے جس قدر سلسلے ہیں، ان میں ایک سلسلہ ہے، جس کو محدثین کی زبان میں سلسلۂ زریں کہتے ہیں، اس سلسلہ کے راوی اول نافع ہیں جو دیلمی غلام تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جس قدر حدیثیں مروی ہیں

---

[1] ابن خلکان تذکرۂ طاؤس، [2] تابعی اس کو کہتے ہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو یا کسی صحابی کو دیکھا ہو،

[3] معارف،

ان کا مدار اعظم یہی نافع ہیں، امام مالک انہی کے شاگرد تھے، انھوں نے ۱۱۷ھ ہجری یعنی ہشام بن عبدالملک کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائی،

غرض کہاں تک احصا کیا جائے، بنو امیہ کے زمانہ کے سیکڑوں اہل عجم اور غلام اور غلام زادوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں، جو عرب کے صوبجات یعنی مکہ، مدینہ، یمن، بصرہ، کوفہ میں مرجع عام تھے، تمام عرب انکی عزت کرتے تھے، اور خود سلطنت بھی انکا احترام کرتی تھی،

اس میں شبہ نہیں کہ عرب کو اس حالت پر غیرت آتی تھی، لیکن یہ رشک وحسد نہ تھا، بلکہ غبطہ تھا، اور وہ خود اعتراف کرتے تھے، کہ

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ایک دفعہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہری سے پوچھا کہ آج مکہ کا رئیس کون ہے، زہری نے کہا عطاء، ہشام نے کہا، اور یمن میں، زہری نے کہا طاؤس، اسی طرح ہشام نے مصر، جزیرہ، خراسان، بصرہ، کوفہ کے متعلق پوچھا اور زہری نے مکحول، یزید، میمون بن مہران، ضحاک کا نام لیا، ہشام ہر شخص کے نام پر یہ بھی پوچھتا جاتا تھا کہ یہ عرب ہیں یا عجم، زہری کہتے جاتے تھے کہ عجم، جب ابراہیم نخعی کا نام لیا اور کہا کہ وہ عرب ہیں، تو ہشام نے کہا کہ اب دل کو تسکین ہوئی، پھر کہا خدا کی قسم موالی (عجمی) وغیرہ عرب کے سردار بن گیے، ان کا خطبہ پڑھا جائے گا، زہری نے کہا، امیرالمؤمنین، یہ دین ہے جو اسکی حفاظت کریگا، سردار ہوگا، اور جو اس کو ضایع کرے گا، گر جائے گا[۱]، اسی واقعہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب عطاء کا نام آیا، تو ہشام نے پوچھا کہ عطاء کو یہ ریاست کیونکر حاصل ہوئی، زہری نے کہا "دیانت وروایت سے" ہشام نے کہا ہاں جو شخص صاحب دیانت اور روایت ہوگا اس کو رئیس ہونا ہی چاہیے،

واقعات مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود بنو امیہ کے زمانہ میں عجمیوں اور عجمی غلاموں کی کیا عزت تھی، عرب ان کا وقار کرتے تھے، حرم محترم میں ان کے سوا کسی کو فتوی کی اجازت نہ تھی، کوفہ عرب کی خالص آبادی تھی، وہاں کا امام عجمی غلام تھا، خلفائے بنو امیہ ان کو دربار میں بلاتے تھے، اور ان کی نہایت عزت کرتے تھے، حدیث وفقہ میں عرب انکو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے،

---

[۱] فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث سخاوی، مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۹۸، ۴۹۹،

اس کے مقابلہ میں ہمارے مصنف (جرجی زیدان) کے ان اقوال پر نظر ڈالو، کہ عرب تمام موالی کو ذلیل کرتے تھے۔ ان کو گدھے اور کتے کے برابر سمجھتے تھے، اُن کے پیچھے نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے، ان کا نام کنیت کے ساتھ نہیں لیتے تھے، راستہ میں ان کا برابر چلنا گوارا نہیں کرتے تھے،

مصنف کی خیانت اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مصنف نے اس مضمون میں کن خیانتوں سے کام لیا ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مصنف نے لکھا ہے کہ:

منعوا غیر العرب من المناصب الدینیۃ المھمۃ کالقضاء فقالوا لا یصلح للقضاء الا عربی،

عرب کے سوا اور لوگوں کو مذہبی عہدوں سے مثلاً قاضی ہونے سے روکتے تھے، اور کہتے تھے کہ عہدۂ قضا کے قابل صرف عرب ہیں،

(تمدن اسلام حصہ چہارم ص۱۰۷)

اس کی کیفیت یہ ہے کہ ابن خلکان نے سعید ابن جبیر کے حال میں لکھا ہے کہ جب حجاج نے ان کو گرفتار کیا تو بلا کر کہا کہ کیا یہ صحیح نہیں کہ میں نے تم کو کوفہ میں بلا کر امامت پر مقرر کیا، اور وہاں ایک شخص بھی عرب کے سوا نہ تھا، سعید نے کہا بے شک، پھر حجاج نے کہا کہ جب میں نے تم کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو سب لوگ چیخ اٹھے کہ قضا پر صرف عرب مقرر کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر میں نے ابو بردہ کو قاضی مقرر کیا لیکن کہدیا کہ تمہارے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرے،

یہ ظاہر ہے کہ جس شہر میں عربوں کے سوا اور کوئی آباد نہ ہو، وہاں مقدمات کے فیصل کرنے کے لیے صرف وہ شخص موزوں ہو سکتا ہے، جو وہاں کا اہل زبان ہو، اور ان کے راہ و رسم سے واقف ہو، اسی بنا پر اہل کوفہ نے سعید بن جبیر کے قاضی ہونے سے انکار کیا، ورنہ اگر قومی تحقیر کی بنا پر اعتراض ہوتا تو نماز کی امامت پر اس سے زیادہ اعتراض کا موقع تھا،

امام ابو حنیفہ خالص عجمی تھے، ان کو بنو امیہ کے زمانے میں گورنر عراق نے اصرار کے ساتھ قاضی مقرر کرنا چاہا[1]

---

[1] ابن خلکان تذکرۂ امام ابو حنیفہ،

لیکن امام صاحب نے قبول نہیں کیا، اگر عرب کے سوا کوئی قاضی نہیں ہو سکتا تھا، تو امام صاحب کے تقرر پر اصرار کیوں کیا جاتا،

مصنف کی خیانت دیکھو کہ وہ کے خاص واقعہ کو جو خاص اسباب پر مبنی تھا، عام واقعہ قرار دیتا ہے، اور عام عرب کی طرف منسوب کرتا ہے،

مصنف نے لکھا ہے:

وحرموا منصب الخلافة علی ابن الامة	اور لونڈی زادے کو گو اس کا باپ قریشی
ولو کان ابوہ قریشیا (حصہ ۴ ص ۶۰)	ہے جو منصب خلافت سے محروم کرتے تھے،

مصنف نے اس کے ثبوت میں ہشام بن عبد الملک کا قول پیش کیا ہے، کہ ہشام نے زید بن علی سے کہا کہ تم خلافت کا خیال رکھتے ہو، لیکن تم اس کے اہل نہیں ہو، کیونکہ تم لونڈی کے پیٹ سے ہو، بے شبہ ہشام کا یہ قول ہے، لیکن اس کے جواب میں زید نے جو کہا اس کو مصنف نے قلم انداز کر دیا، زید نے کہا ہاں، لیکن حضرت اسمٰعیل ع لونڈی کے پیٹ سے تھے، اور ان کے بھائی (اسحاق) نجیب الطرفین تھے، تاہم خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خیر البشر تھے، اسمٰعیل ع ہی کی نسل سے پیدا کیا،

غرض یہ دو حریفوں کے اقوال ہیں، ان میں کسی ایک سے کوئی عام خیال نہیں ثابت کیا جا سکتا، خاص خاص اشخاص سے بحث نہیں ہے، بلکہ بحث یہ ہے کہ عام عرب کا خیال تھا، ہشام اور زید دونوں میں سے کسی شخص کا بیان عرب کی عام زبان نہیں ہے، ہشام کا قول اگر سند کے قابل ہے، تو اس سے زیادہ حضرت زید رض کا قول سند کے قابل ہے، جو خاندان نبوت سے تھے، اور امام تھے، اور آج بھی یمن میں ہزاروں لاکھوں آدمی انہی کو امام مانتے ہیں،

بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ خلفائے بنو امیہ لونڈیوں کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن محققین نے قدیم زمانہ میں اسکی تغلیط کر دی تھی، اور اس غلط خیال کا منشا بتا دیا تھا، چنانچہ عقد الفرید میں مذکور ہے،

قال الاصمعی کانت بنو امیة لاتبایع	اصمعی نے کہا کہ بنی امیہ کنیز زادوں کو خلیفہ
لبنی امھات الاولاد فکان الناس یرون	نہیں بناتے تھے، اس سے لوگوں نے سمجھا
ان ذالک لاستھانة بھم ولم یکن لذالک	کہ وہ ان کو حقیر سمجھتے تھے لیکن یہ وجہ نہ تھی، بلکہ یہ

ولکن لما کان فوا یروت ان زوال ملکھم علی ید	وجہ بھی کہ ان کا خیال تھا کہ ان کی سلطنت کا زوال
ابن ام ولد (عقد الفرید ج سوم ۳۳ مطبوعہ مصر)	ایک کنیز زادہ کے زمانہ میں ہوگا،

حقیقت یہ ہے کہ مقابل کے حریف خود غرضی کی بنا پر ہر قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں، مدعیان سلطنت نے یہ استدلال بھی پیش کیا، لیکن فریق مخالف نے جو جواب دیا، وہ لاجواب رہا، خلیفہ منصور کے زمانہ میں جب نفس زکیہ نے بغاوت کی تو اپنے استحقاق کی ایک یہ دلیل بھی پیش کی کہ میں لونڈی زادہ نہیں ہوں، منصور نے جواب میں لکھا کہ ہاں لیکن تمھارے خاندان میں جو لوگ فضل و شرف میں ممتاز تھے، وہ وہی تھے جو کنیز زادہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خاندان نبوت میں کوئی شخص علی بن الحسین (امام زین العابدین) سے بڑھ کر نہیں پیدا ہوا، ان کی والدہ کنیز تھیں، ان کے بعد محمد (امام باقر) اور جعفر (امام جعفر صادق) سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا، اور یہ سب علی (زین العابدین) ہی کی اولاد ہیں،

سالم بن عبداللہ بن عمرؓ لونڈی کے پیٹ سے تھے، خلیفہ ہشام بن عبدالملک جب مدینہ گیا، تو ان کو بلا بھیجا وہ اس وقت معمولی لباس میں تھے، کہلا بھیجا کہ میں نہیں آسکتا، ہشام خود گیا، اور دس ہزار روپیہ نذر کیے، حج کرکے پھر مدینہ گیا، تو سالم بیمار تھے، خود عیادت کو گیا، وہ مرگیے تو خود جنازہ کی نماز پڑھائی، اور کہا کہ میں نہیں جانتا کس بات پر زیادہ اظہار مسرت کروں، حج کرنے پر یا سالم کے نماز جنازہ پڑھنے پر[1]،

ہمارا مصنف کہتا ہے کہ اہل عرب اور بنو امیہ، کنیزوں کی اولاد کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن ہشام جیسا نامور خلیفہ ایک کنیز زادہ کے جنازہ کی نماز کو حج کے برابر سمجھتا ہے،

بنو امیہ | مصنف کا سب سے بڑا مرکز نظر بنو امیہ کی ہجو و تحقیر ہے، اس بحث میں اس نے جی کھول کر زور طبع صرف کیا ہے، اور جس قدر کذب، تحریف، تمویہ، فریب، تدلیس، خدع، غلط بیانی کی قوت فطرت نے اس کو عطا کی تھی سب صرف کردی ہے، کتاب کے چوتھے حصہ میں بنو امیہ کی سفاکی، مذہب کی توہین، غیر قوموں پر ظلم اور سختی کے مستقل عنوان قائم کیے ہیں، اور ان پر دفتر کا دفتر لکھا ہے،

بنو امیہ کی حمایت اور ہمدردی ہمارا کوئی فرض نہیں، اموی یا عباسی خلفا نہ تھے، بلکہ سلاطین تھے، شخصی سلطنتوں

---

[1] ابن الاثیر حالات بغاوت نفس زکیہ،

یں جس قسم کے سلاطین ہمیشہ ہوتے آئے ہیں، یہ بھی تھے، با ایں ہمہ ہم کو جن اسباب نے مصنف کی پردہ دری پر آمادہ کیا وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) مصنف یہ کتاب عیسائی بن کر نہیں بلکہ مورخ بن کر لکھتا ہے، اور اسی حیثیت سے اس تصنیف کو تمام دنیائے اسلام کے سامنے پیش کرتا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ اس فرض کو کہاں تک ادا کر سکا ہے، دنیا کی سب سے بڑی خدمت سچائی کا پھیلانا ہے، اس لیے اگر مصنف نے غلط بیانی سے کام لیا ہے، تو اس نے بنوامیہ کے ساتھ نہیں، بلکہ لٹریچر کے ساتھ، تاریخ کے ساتھ بلکہ کل دنیا کے ساتھ برائی کی ہے،

(۲) مصنف کا اصلی مقصد، بنوامیہ کی برائیاں ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا روئے سخن عرب کی طرف ہے، وہ بتصریح کہتا ہے کہ بنوامیہ کی سلطنت خالص عربی سلطنت تھی جس کی بنیاد تعصب اور سخت گیری تھی، وہ عباسی حکومت کی تعریف کرتا ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ عباسی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ درحقیقت ایرانی حکومت ہے، چنانچہ چوتھے حصہ میں جہاں سلطنتِ عباسیہ کا ذکر شروع کیا ہے، اس کا عنوان یہ قائم کیا ہے،

العصر الفارسی الاوّل، ایرانی حکومت کا پہلا دور،

اس کے بعد لکھتا ہے کہ گو یہ عباسی سلطنت کا دور ہے لیکن ہم نے اس کو ایرانی اس لیے کہا کہ نظامِ حکومت اور وزراء و امراء وغیرہ سب ایرانی تھے،

شاید یہ کہا جائے کہ خلفائے راشدین کی حکومت بھی خالص عربی حکومت تھی، با ایں ہمہ مصنف اس کی تعریف کرتا ہے، اس لیے عام عرب پر اس کا اعتراض نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خلفائے راشدین کے دور کو اصولِ فطرت کے موافق نہیں سمجھتا، بلکہ اسکو مستثنیاتِ عامہ میں داخل کرتا ہے، چنانچہ اس کے خاص الفاظ یہ ہیں،

علی ان سیاسۃ الراشدین علی الجملۃ لیست مما یلائم طبیعۃ العمران او تقتضیہ سیاسۃ	با ایں ہمہ خلفائے راشدین کی ریاست، عام طور پر اصولِ تمدن اور سیاستِ ملکی کے مناسب
الملک ... فاھل العلم بطبائع العمران لا یرون	نہ تھی، اس لیے اربابِ علم اس سیاست کو اس
ھذہ السیاسۃ تصلح لتدبیر الملک فی غیر ذلک	قابل نہیں سمجھتے کہ وہ بجز اس زمانہ کے
العصر والعجیب ان انقلاب تلک الخلافۃ الی	کسی اور زمانہ کے قابل ہو، اس لیے

الی الملک السیاسی لم یکن منہ بد" | اسینی مذہبی خلافت کا ملکی سیاست سے بدل جانا
(حصہ چہارم ص ۲۸ و ۲۹) | ایک ناگزیر امر تھا۔

(۳) بنو امیہ کے پردہ میں مصنف نے قرنِ اول کے عام مسلمانوں کی ہر قسم کی برائیاں ثابت کی ہیں، اس لیے ایسے اتہامات کا رفع کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

(۴) جن باتوں نے اس کتاب کو تاریخی پایہ سے بالکل گرا دیا ہے، یعنی تحریف، تعصب، کذب وخدع ان کا سب سے زیادہ استعمال بنو امیہ ہی کے واقعات میں کیا گیا ہے، اس لیے اسی کے ساتھ زیادہ توجہ اور اعتناء کی ضرورت ہے۔

مذہب کی توہین | مصنف نے بنو امیہ کے حالات میں اس کا ایک عنوان قائم کیا ہے، کہ بنو امیہ مذہب کی توہین کرتے تھے، چنانچہ عنوان کے الفاظ یہ ہیں:

الاستھانۃ بالقرآن والحرمین (حصہ ۴ ص ۷۹) | قرآن اور حرمین کی توہین

اس واقعہ میں مصنف نے نہایت مغالطہ کاری اور ملمع سازی سے کام لیا ہے، اس نے پہلے یہ واقعہ لکھا ہے کہ عبدالملک کو جب خلافت کی خبر پہنچی، تو اس کی گود میں قرآن تھا، اس نے قرآن کو بند کر کے کہا "یہ آخری ملاقات ہے" اس کے بعد لکھتا ہے:

"اس کے بعد اس نے اپنے عامل حجاج کو اجازت دی کہ کعبہ پر منجنیق نصب کرے، اور ابن زبیرؓ کو قتل کرے، اور اس کا سر عین کعبہ کے اندر اپنے ہاتھ سے کاٹے، حالانکہ کعبہ حرم ہے جس کے اندر اور اس کے حوالی میں لڑائی جائز نہیں، لیکن ان لوگوں نے اس کو جائز رکھا، اور تین دن تک لوگوں کو قتل کرتے رہے، اور کعبہ کو ڈھا دیا، حالانکہ ان کے نزدیک وہ خدا کا گھر تھا، اور کعبہ کے پتھروں اور پردوں میں آگ لگا دی، جو کبھی اسلام میں نہیں ہوا تھا، اور مدینہ میں پہنچے، اور وہ ایک حرم ہے، اور وہاں کے لوگوں سے لڑے، اور ان کا خون بہایا۔" الخ (حصہ چہارم صفحہ ۷۰ و ۷۹)

جس فریب دہ ترتیب سے مصنف نے ان واقعات کو لکھا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالملک نے خلافت پانے کے ساتھ توہینِ اسلام کو اپنا مقصد قرار دیا، اور اس نے بنا پر کعبہ پر چڑھائی کی، اور کعبہ کو آگ لگا دی،

اور ابن زبیرؓ کو کعبہ کے اندر قتل کر دیا، وغیرہ وغیرہ،

واقعات یہ ہیں کہ عبد اللہ بن زبیرؓ اور عبد الملک دونوں خلافت کے دعویدار تھے، اور اپنے اپنے فتوحات بڑھاتے جاتے تھے، عبد الملک نے تخت نشینی کے آٹھ برس کے بعد حجاج کے ذریعہ سے عبد اللہ ابن زبیرؓ پر چڑھائی کی، انھوں نے مکہ میں بیٹھ کر لڑائی کی تیاری کی، حجاج نے محاصرہ کیا، اور منجنیق سے سنگ باری شروع کی، اسی اثنا میں حج کا زمانہ آیا، حجاج نے حج کرنا چاہا، لیکن عبد اللہ ابن زبیرؓ نے روکا، سنگ باری کی وجہ سے حاجیوں کو تکلیف تھی، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے حجاج کو کہلا بھیجا کہ لوگ طواف نہیں کر سکتے، حجاج نے سنگ باری بند کرادی، حج کے بعد حجاج نے منادی کرادی کہ لوگ وطن کو واپس نہ جائیں، میں ابن زبیرؓ پر سنگ باری کروں گا،

فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ اگر کوئی باغی کعبہ میں پناہ لے، تو اس کو گرفتار کرنا یا اس پر حملہ کرنا جائز ہے یا نہیں بہت سے فقہا اس کو جائز سمجھتے ہیں، بنو امیہ کے طرفدار عبد اللہ بن زبیرؓ کو باغی سمجھتے تھے،

بایں ہمہ حجاج نے کعبہ پر سنگ باری نہیں کی، بلکہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کو گرا کر جو اس میں اضافہ کر لیا تھا، اس کو شکستہ کیا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے زمانہ سے پہلے سیلاب کی وجہ سے جب کعبہ گر گیا تو قریش نے دوبارہ تعمیر کی، لیکن چونکہ مالی حالت نے زیادہ اجازت نہ دی، تھوڑا سا حصہ تعمیر نہ ہو سکا، قریش نے زمین کا اس قدر حصہ خالی چھوڑ دیا، اور اس کے گرد دیوار کھنچوا دی، جس کو آج حطیم کہتے ہیں، عبد اللہ بن زبیرؓ نے جب دوبارہ مرمت کرائی تو یہ چھوٹی ہوئی زمین عمارت کے اندر داخل کر لی،

اہل شام نے اس فعل کو ناجائز خیال کیا، کہ کعبہ پر اضافہ کیا گیا، حجاج نے اسی اضافہ شدہ عمارت پر پتھر برسائے تھے،

علامہ بشاری احسن التقاسیم (مطبوعۂ یورپ ص ۷۴) میں لکھتے ہیں:

فامر بوضع المنجنيق على ابي قبيس و	حجاج نے حکم دیا کہ ابوقبیس پر منجنیق نصب کی
قال ارموا الزيادة التي ابتدعها هذا	جائے اور کہا کہ اس حصہ پر حملہ کرو جس کو اس
المتكلف، فرموا موضع الحطيم و	متکلف (ابن زبیرؓ) نے ایجاد کیا ہے، چنانچہ
اخرج ابن الزبير وصلبه ورمة الحائط	حطیم پر پتھر چلائے، اور ابن زبیرؓ کو نکال کر

كما كان في القديم . پھانسی دی، اور دیوار ویسی ہی بنا دی جیسی پہلے تھی،

حجاج نے اس کے بعد کعبہ کی عمارت نئے سرے سے بنائی اور آج وہی کعبہ قبلۂ اسلام ہے،
باقی یہ واقعات کہ عبد اللہ بن زبیرؓ کو خود کعبہ کے اندر قتل کیا، اور پردۂ کعبہ میں آگ لگا دی، تمام ترغلط ہیں
عبد الملک کا قرآن کو الوداع کہنا، اس کی یہ کیفیت ہے کہ عبد الملک خلافت سے پہلے سخت عابد وزاہد تھا
نافع کا بیان ہے کہ میں نے مدینہ منورہ میں کسی نوجوان کو عبد الملک سے بڑھ کر مستعد، فقیہ، عابد اور قاری قرآن نہیں
دیکھا، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم لوگ کس سے مسئلے پوچھیں گے، فرمایا کہ مروان
کے بیٹے سے، ابوالزناد کا قول تھا کہ مدینہ کے فقہا سات ہیں، ان میں سے ایک عبد الملک ہیں،
ان حالات کے ساتھ جب خلافت کا بار اٹھانا پڑا، تو ظاہر ہے کہ اب وہ زاہدانہ زندگی بسر نہیں ہو سکتی
تھی، اور قرآن مجید کی تلاوت کا یہ التزام انجام دینا مشکل تھا، اس لیے عبد الملک نے وہ فقرہ بحسرت کہا، جس کے
معنی مخالفین نے یہ لیے، کہ قرآن سے بیزاری مقصود تھی،

غور کرو ایک شخص جس نے تیس برس زہد وتقویٰ میں بسر کی جس سے بڑھ کر مدینہ منورہ میں کوئی عابد وزاہد
نہ تھا، جس کی نسبت شعبی جیسا امام کہتا ہے،

ما جالست احدا الا وجدت عليه الفضل، الا عبد الملك بن مروان، میں کسی کے ساتھ نہیں بیٹھا، مگر یہ کہ میں اس سے بڑھ کر رہا، بجز عبد الملک کے،

جس سے بڑے بڑے محدثین یعنی عروہ، رجاء بن حیوۃ، امام زہری، وغیرہ نے حدیث روایت کی جو خلافت
پانے سے ایک منٹ پہلے قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا، خلافت ملنے کے ساتھ دفعۃً مرتد ہو جائے، اور قرآن
سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو کر کعبہ پر چڑھائی کر دے، مصنف کے سوا کس کے خیال میں آ سکتا ہے مصنف
بظاہر عبد الملک کو بے دین ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ دراصل تمام مسلمانوں کو بے دین ثابت کر رہا ہے، کہ ان
کے سامنے کعبہ پر چڑھائی ہوئی، کعبہ ڈھا دیا گیا، پردۂ کعبہ میں آگ لگا دی گئی، اور تمام ملک چپ بیٹھا دیکھا کیا،
اس کے علاوہ قرآن سے بند کرنے والے فقرہ کے کہنے کی روایت قدیم مستند کتابوں، یعنی طبری، ابن الاثیر وغیرہ

میں سرے سے ہے ہی نہیں، بعض کتابوں میں جہاں ہر قسم کا رطب یابس ہے، یہ بھی ہے،

مصنف نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے عمال، خلفائے بنوامیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دیتے تھے، چنانچہ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کے اقوال نقل کیے ہیں، اگرچہ یہ روایتیں عقد الفرید اور اغانی وغیرہ سے لی ہیں، جن کا شمار تاریخی کتابوں میں نہیں، لیکن گفتگو یہ ہے کہ بنوامیہ کے سیکڑوں ہزاروں عمال میں سے ایک دو شخص ایسے تھے، تو اس سے عام استدلال کیا ہو سکتا ہے،

حجاج اور خالد قسری کے اقوال اور افعال اس وقت بنوامیہ کے نامۂ اعمال میں داخل سمجھے جا سکتے ہیں، جب خلفائے بنوامیہ نے ان کو جائز رکھا ہو، حجاج کو (عبد الملک اور ولید کے سوا) تمام خلفائے بنوامیہ نہایت برا سمجھتے تھے، خالد قسری کو ان ہی افعال کی بدولت ہشام نے گورنری سے معزول کر دیا اور سخت سزا دی،

ولید بن یزید کی نسبت کفر اور زندقہ کا جو الزام مصنف نے لگایا ہے، اس کی یہ کیفیت ہے کہ اس کے فیصلہ کرنے کا سب سے زیادہ حق محدثین کو ہے، اور وہ اس باب میں مطلق کوئی رعایت بھی نہیں کر سکتے، علامہ ذہبی جن سے بڑھ کر چھ سو برس کی مدت میں آج تک کوئی محدث اور مورخ نہیں پیدا ہوا، لکھتے ہیں:

لم یصح عن الولید کفر ولا زندقۃ بل اشتھر بالخمر والتلوط فخرجوا علیہ کذا لک،

(تاریخ الخلفاء تذکرہ ولید بن یزید)

ولید سے کفر اور زندقہ ثابت نہیں ہے، بلکہ وہ شراب خوری اور امردوں کے ساتھ زیادہ بدنام ہوا، اس لیے لوگوں نے اس سے بغاوت کی،

یہ ظاہر ہے کہ محدثین قرآن کی ذرا سی اہانت کو کفر سمجھتے ہیں، ولید خدا نخواستہ اگر قرآن مجید کو تیر کا نشانہ بناتا جیسا کہ مصنف نے نقل کیا ہے تو کیا محدثین اس کے کفر سے انکار کر سکتے تھے،

بنوامیہ کا ظلم مصنف نے سارا زور اس مضمون پر صرف کر دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ بنوامیہ کے ظلم سے تمام رعایا چیخ اٹھی تھی، ملک اجاڑ ہو گیا تھا، غیر مذہب والوں کو کسی صورت سے یعنی مسلمان ہو کر بھی ظلم سے نجات نہیں ملتی تھی، وغیرہ وغیرہ،

اصل عبارتوں کا نقل کرنا چونکہ طول عمل ہے اس لیے ہم ان کے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں، مصنف نے بنوامیہ کے ظلم و جور کے گوناگوں طریقے بتائے ہیں، جو اجمالاً حسب ذیل ہیں:

(۱) رعایا کا مال زبردستی چھین لیتے تھے،

(۲) صوبوں کی گورنریاں رشوت لے کر فروخت کرتے تھے،

(۳) بہت بڑے بڑے محصول اور ٹیکس لگاتے تھے،

(۴) مذہب کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے،

(۵) چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کرتے تھے،

(۶) لوگوں کے سر کاٹ کر خزانے میں رکھو دیتے تھے، چنانچہ ایک خاص خزانہ تھا جس کا نام خزانۃ الرؤس تھا،

(۷) طرح طرح کی سخت اور نفرت انگیز سزائیں دیتے تھے،

(۸) غیر قوموں کو عرب سے شادی بیاہ کرنے پر سزائیں دیتے تھے،

ان واقعات کو اس طرح لکھا ہے کہ چنگیز خاں اور ہلاکو کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، بلکہ ان کے مقابلہ میں چنگیز خاں وغیرہ ہیچ نظر آتے ہیں،

ان واقعات کے بیان کرنے میں مصنف حسب عادت کہیں ایک جزئی واقعہ کو عام کر دیتا ہے، کہیں تاریخی حوالوں میں تحریف کرتا ہے، کہیں غلط استدلال سے کام لیتا ہے، لیکن اگر اس کی ایک ایک جزئی خیانتوں کی تفصیل لکھی جائے، تو ایک بہت بڑی کتاب طیار کرنی ہوگی، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ اس کی فریب کاریوں کو دکھاتے ہیں،

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مصنف بنو امیہ کو عموماً جو ظالم اور غارت گر بتاتا ہے، یہ تعمیم خود اس کے تفحص اور استقصا کا نتیجہ ہے، یا مورخین قدیم نے تصریح کی ہے،

ایک اور نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ بنو امیہ کی جس قدر تاریخیں لکھی گئیں، سب دولت عباسیہ کے زمانہ کی ہیں، عباسیوں کو بنو امیہ کے ساتھ جو دشمنی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تمام خلفاء بنو امیہ کی قبریں اکھڑوا دیں، اور ان کی ہڈیاں آگ میں جلا دیں، ان کے زمانے میں بنو امیہ کی مدح کرنا قریباً ناممکن تھا، بنو امیہ کی برائیوں کے بیان کرنے پر انعام ملتا تھا، باوجود ان حالات کے ایک دو خلفاء کے علاوہ مورخین نے کسی خلیفہ اموی کے ظلم اور جباری کی شکایت نہیں کی، بلکہ بخلاف اس کے متعدد خلفاء کی تعریف کی ہے،

امیر معاویہؓ کی نسبت علامہ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے :۔

كان من اخلاق معاوية انه كان ياذن في اليوم والليلة خمس مرات كان اذا صلى الفجر جلس للقاص حتى يفرغ من قصصه . . . فيخرج الى المسجد فيوضع فيسند ظهره الى المقصورة ويجلس على الكرسي ويقوم الاحداث فيتقدم اليه الضعيف والاعرابي والصبي والمرأة ومن لا احد له فيقول ظلمت فيقول اعزوه ويقول عدي علي فيقول ابعثوا معه فيقول صنع بي فيقول انظروا في امره حتى اذا لم يبق احد دخل فجلس على السرير ثم يقول ائذنوا الناس على قدر منازلهم فاذا استووا جلوسا قال يا هؤلاء انما سميتم اشرافا لانكم شرفتم من دونكم بهذا المجلس ارفعوا الينا حوائج من لا يصل الينا فيقوم الرجل فيقول استشهد فلان فيقول افرضوا لولده ويقول آخر غاب فلان عن اهله فيقول تعاهدوهم اقضوا حوائجهم اخدموهم ثم يؤتى بالغداء والكاتب يقرء

معاویہؓ کی عادت یہ تھی کہ دن رات میں پانچ دفعہ دربار عام کرتے تھے۔ فجر پڑھ کر اٹھتے تھے اور شکایتیں سنتے تھے۔ پھر مسجد میں آتے تھے اور مقصورہ کی طرف پشت کر کے کرسی پر بیٹھتے تھے۔ پھر لوگ پیش ہوتے تھے، اور کمزور، گنوار، بچے، عورتیں، اور جس کا کوئی نہیں ہوتا تھا، یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ ایک شخص کہتا تھا مجھ پر ظلم ہوا، امیر معاویہ کہتے تھے اس کو عزت دو۔ دوسرا کہتا تھا مجھ پر تعدی کی گئی، معاویہ کہتے تھے کہ کسی کو اس کے ساتھ کر دو۔ تیسرا کہتا تھا مجھ سے برا برتاؤ کیا گیا، معاویہ کہتے تھے اس کے معاملہ کی تحقیق کرو۔ یہاں تک کہ جب سب لوگ ہو چکتے تھے، تو اندر جا کر تخت پر بیٹھتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ لوگوں کو ترتیب کے موافق بٹھاؤ۔ پھر جب لوگ بیٹھ جاتے تھے تو کہتے تھے کہ صاحبو! آپ اس لیے شریف کہلاتے ہیں کہ آپ کو اوروں پر شرف حاصل ہے، اس لیے ان لوگوں کی حاجتوں کو پیش کیجیے جو مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس پر ایک شخص کھڑا ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ فلاں شخص لڑائی میں مارا گیا، امیر معاویہؓ حکم دیتے تھے کہ اس کے لڑکوں

كتابه فيامر فيه حتى يأتي على اصناف الحوائج اربعون وربما تقدم عليه من اصحاب الحوائج اربعون اونحوهم على قدر الشغل،

کی تنخواہ مقرر کردو، دوسرا شخص کہتا تھا کہ فلاں شخص باہر چلا گیا۔ وہ حکم دیتے تھے کہ اس کے بال بچوں کی خبر گیری کی جائے، پھر کھانا آتا تھا یہاں تک کہ سب اہل حاجت ختم ہو جاتے تھے اکثر چالیس چالیس آدمی تک نوبت پہنچتی تھی،

اس کے بعد مسعودی نے نہایت تفصیل سے ان کا نظام اوقات لکھا ہے، اور لکھا ہے کہ کوئی شخص انکے برابر عادلانہ حکومت نہ کر سکا،

علامہ سیوطی سلیمان بن عبدالملک کی نسبت لکھتے ہیں:

كان فصيحا مفوها مؤثرا للعدل و من محاسنه ان عمر بن عبد العزيز كان له كالوزير فكان يمتثل اوامره في الخير فعزل عمال الحجاج واخرج من كان في سجن العراق، قال ابن سيرين رحمه الله سليمان افتتح خلافته باحيائه الصلوٰة مواقيتها واختتمها باستخلافه عمر بن عبد العزيز

فصیح زبان آور تھا اور عدل پر عمل کرتا تھا، اس کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؓ اس کے گویا وزیر تھے، اور وہ اچھے کاموں میں ان کی ہدایتوں پر چلتا تھا، اس نے حجاج کے نوکروں کو موقوف کر دیا، اور عراق کے قیدیوں کو رہائی دی، ابن سیرین کا قول ہے کہ خدا سلیمان پر رحمت کرے، اس نے خلافت کا آغاز نماز کے اول وقت پر پڑھنے سے کیا، اور خاتمہ عمر بن عبدالعزیزؓ کے جانشین کرنے پر کیا،

محدث ابن عساکر ولید بن عبدالملک کے متعلق لکھتے ہیں:

كان الوليد عند اهل الشام من افضل خلفائهم بنى المسجد بدمشق

ولید اہل شام کے نزدیک تمام خلفائے بنوامیہ سے افضل تھا، اس نے دمشق میں مسجد بنائی

وأعطى الناس وفرض للمجذومين وقال لا تسئلوا الناس واعطى كل مقعد خادما وكل اعمى قائدا وكان يبر حملة القرآن ويقضي عنهم ديونهم

بنوائیں، لوگوں کی تنخواہیں مقرر کیں، مجذوموں کے روزینے مقرر کیے، اور کہا کہ سوال نہ کرو، اور ہر اپاہج کے لیے ایک خادم اور اندھے کے لیے ایک رہبر مقرر کیا، اور حفاظ قرآن کے ساتھ نیکی کرتا تھا، اور ان کے قرض ادا کرتا تھا"

علامہ ابن الاثیر ۸۸ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

كتب الى البلدان جميعها باصلاح الطرق وعمل الآبار ومنع المجذومين من الخروج على الناس واجرى لهم الارزاق

تمام شہروں میں خطوط بھیجے کہ سڑکیں درست کی جائیں، اور کنویں کھودے جائیں، اور مجذوم باہر نہ نکلیں، اور ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں۔

علامہ سیوطیؒ نے ولید کی نسبت اگرچہ ظالم اور جبار کا لفظ لکھ دیا ہے، تاہم لکھتے ہیں:-

وكان مع ذلك يختن الايتام ويرتب لهم المؤدبين ويرتب للزمنى من يخدمهم وللاضراء من يقودهم وعمر المسجد النبوي ووسعه ورزق الفقهاء والضعفاء والفقراء وحرم عليهم سؤال الناس وفرض لهم ما يكفيهم وضبط الامور اتم ضبط

باوجود اس کے وہ یتیموں کا ختنہ کراتا تھا، اور ان کے لیے معلم مقرر کرتا تھا، اور معذوروں کے لیے خادم اور اندھوں کے لیے رہبر مقرر کرتا تھا، اور مسجد نبویؐ کی تعمیر کی اور اس کو وسعت دی، اور فقہا اور ضعفا اور فقرا کے لیے روزینے مقرر کیے، اور ان کو سوال کرنے سے منع کر دیا، اور ان کے لیے سامان معاش مقرر کیا، اور تمام کاموں کا کامل طرح انتظام کیا۔

ہشام بن عبدالملک کی نسبت علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:-

وكان هشام حازما عاقلا لا يدخل بيت ماله مالا حتى يشهد اربعون قسامة لقد اخذ من حقه ولقد اعطي لكل ذي حق حقه، وقال مجيل بن محمد ما رأيت احدا من الخلفاء اكره اليه الدماء ولا اشد عليه من هشام،

ہشام عقلمند اور باتدبیر تھا، خزانہ میں کوئی رقم اس وقت تک داخل نہیں کرتا تھا، جب تک چالیس شخص بہ قسم یہ گواہی نہیں دیتے تھے، کہ جائز طور پر یہ رقم لی گئی ہے، اور تمام مستحقین کو ان کے حق دے دیے گئے، مجیل بن محمد کہتے ہیں کہ خلفا میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس کو قتل و خون اس قدر ناگوار ہو جس قدر ہشام کو تھا،

احکام شرعی کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اس کے بیٹے نے جمعہ کی نماز نہیں پڑھی تو اس سے وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ میرے پاس سواری نہ تھی، ہشام نے کہا، کیا پیادہ نہیں جا سکتا تھا، پھر حکم دیا کہ سال بھر تک اس کو سواری نہ دی جائے،

یزید بن عبدالملک کی نسبت علامہ دمیری لکھتے ہیں:

وكان مظهر النسك وقراءة القرآن واخلاق عمر بن عبد العزيز وكان ذا دين وورع،

عبادت اور قرأت قرآن کرتا تھا، اور عمر بن عبدالعزیز رضؓ کے اخلاق کا اظہار کرتا تھا، اور دیندار اور پرہیزگار تھا،

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں،

مروان حمار کی نسبت کسی مورخ نے جور و ظلم کی کوئی شکایت نہیں کی،

ولید بن یزید البتہ فاسق و فاجر تھا، لیکن اسی بنا پر خود بنوامیہ نے اس کو قتل کر دیا،

واقعات مذکورہ سے معلوم ہوا ہوگا، کہ خلفائے بنوامیہ میں سے زیادہ تر عادل اور انصاف پرور تھے، اور ان کے عہد میں ملک کے امن وامان، اور غربا کی آسائش و آرام کا کیا بندوبست تھا، اس حالت میں مصنف نے عموماً بنوامیہ کے ظلم اور سفاکی کی جو داستان بیان کی ہے، کہاں تک صحیح ہے،

مصنف نے ظلم اور سفاکی کے جرم سے صرف عمر بن عبدالعزیز کو مستثنیٰ کیا ہے، ہشام، سلیمان وغیرہ

اس کے نزدیک اسی عام فہرست میں شامل ہیں ،

بایں ہمہ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ مصنف نے جو واقعات لکھے ہیں ، ان سے بڑھ کر ظلم کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے؛ اور ان کی صحت سے ... انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر واقعہ کے ساتھ سند موجود ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے ان تمام واقعات ... میں اور غلط بیانیاں کی ہیں ، افسوس ہے کہ ان سب کی اگر تشریح کی جائے تو تمدن اسلام کے برابر ایک کتاب بن جائیگی ، اس لیے ہم نمونہ کے طور پر چند اہم باتیں لکھتے ہیں :

رعایا پر ظلم | مصنف نے حصہ دوم ص ۱۹ میں لکھا ہے :

"بنو امیہ جس طرح عرب کی طرفداری میں تعصب برتتے تھے ، اور تمام قوموں کو حقیر سمجھتے تھے ، اس کے نتائج میں ایک یہ ہے کہ وہ مفتوحہ مقامات کے آدمیوں کو اپنا رزق حلال جانتے تھے ، چنانچہ اسکی تصدیق ، سعید بن العاص گورنر عراق کے اس قول سے ہوتی ہے کہ سواد (بغداد کا علاقہ) قریش کا باغ ہے ، ہم جس قدر چاہیں لیں ، اور جس قدر چاہیں چھوڑ دیں ۔"

مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ بنو امیہ نہ صرف جائداد اور زمین بلکہ وہاں کے لوگوں کو بھی اپنی ملک سمجھتے تھے لیکن عبارت منقولہ میں اس کا پتہ نہیں ، اس میں صرف یہ مذکور ہے کہ سواد ہمارا باغ ہے ، ہم جس قدر چاہیں لیں ، یہ ظاہر ہے کہ باغ اور آدمی مختلف چیزیں ہیں ، یہ تو خیر ایک معمولی غلطی ہے ، لیکن مصنف نے پورے واقعہ کو غلط طور سے دکھایا ہے ،

اصل یہ ہے کہ اس امر کے متعلق لوگوں میں اختلاف تھا کہ مفتوحہ زمینیں فوج کا حق ہیں ، یا سلطنت کا ، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض صحابہ نے اصرار کیا تھا ، کہ یہ زمینیں اہل فوج کو تقسیم کردی جائیں ، لیکن حضرت عمرؓ نے نہ مانا ، یہ واقعہ بھی اسی بنا پر تھا ، یعنی بعض اشخاص کہتے تھے کہ چونکہ ہم نے ان کو ہتھیاروں سے فتح کیا ہے ، اس لیے ہم اس کے مالک ہیں ، سعید کا مقصد یہ تھا کہ وہ حکومت کا حق ہے ، اور چونکہ حکومت قریش میں محدود ہے ، اس لیے انہوں نے قریش کے لفظ سے اس کی تعبیر کی ، بہرحال یہ بحث دو فریقوں کے مقابلہ میں تھی ، اس کو اس مسئلہ سے کیا تعلق کہ بنی امیہ مفتوحہ قوموں کو اپنی ملک سمجھتے تھے ،

مصنف نے عمرو بن العاصؓ کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے قبطیوں سے کہا کہ تم ہمارے خزانہ ہو ، زیادہ آمدنی

ہوگی تو زیادہ لیں گے، کم ہوگی تو کم لیں گے،

اس مسئلہ میں مصنف نے سخت خیانت کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے مفتوحہ مقامات کی دو قسمیں قرار دی تھیں، ایک وہ جو صلح اور معاہدہ کے ذریعہ سے قبضہ میں آئے، ان ممالک میں جزیہ یا خراج کی جو شرح معاہدہ میں مذکور ہو چکی تھی، اس پر اضافہ کرنا کسی حالت میں جائز نہیں تھا، دوسرے جو لڑ کر بغیر کسی معاہدہ کے فتح ہوئے ان میں جزیہ کی کمی بیشی کا اختیار تھا، یہ تفریق حضرت عمرؓ نے خود کی تھی، اور وہ زمانہ مابعد میں بھی قائم رہی، مصر اسی طرح فتح ہوا تھا، اسی بنا پر جب رعایا میں سے کوئی شخص عمرو بن العاصؓ سے پوچھتا تھا کہ یہاں کا جزیہ اور محصول کیا ہے، تو وہ کہتے تھے کہ میں یہ نہیں بتاؤں گا، تم ہمارا خزانہ ہو، مقریزی نے جہاں یہ بحث لکھی ہے، اور جس موقع سے مصنف نے وہ فقرہ نقل کیا ہے، وہاں یہ تصریح موجود ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

وکان عمر بن الخطاب یاخذ ممن	عمر بن الخطاب کا دستور تھا کہ جن لوگوں سے
صالحہ من المعاھدین ما سمی نفسہ	معاہدہ پر صلح ہوتی تھی، ان سے شرح مقررہ پر
لا یضع من ذالک شیئا ولا یزید علیہ	کچھ اضافہ کرتے تھے نہ اس سے کم کرتے تھے، اور جو لوگ جزیہ پر
ومن نزل منھم علی الجزیۃ ولم یسم	راضی ہوتے تھے، اور جزیہ کی کوئی تعداد مقرر
شیئا یؤدیہ نظر فی امرہ فاذا	نہیں ہوتی تھی، تو حضرت عمرؓ اس کی بابت غور
احتاجوا خفف عنھم وان استغنوا	کرتے تھے کہ اگر وہ لوگ نادار ہو گئے تو جزیہ
زاد علیھم بقدر استغنائھم،	گھٹا دیتے تھے، اور دولت مند ہوتے تھے تو
(مقریزی ج ۱ ص ۷۷)	بقدر ان کی دولت کے بڑھا دیتے تھے،

یہی بات ہے جو عمرو بن العاصؓ نے کہی تھی، اور جس کو مصنف اس سند میں پیش کرتا ہے، کہ بنوامیہ مفتوحہ قوموں کو اپنا مملوکہ سمجھتے تھے،

مصنف نے کتاب کے چوتھے حصہ میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: الفتك والبطش فی عصر الاموبین "یعنی بنوامیہ کے زمانہ کی سفاکی" اس میں دعویٰ کیا ہے، کہ بنوامیہ بے دریغ لوگوں کو قتل کرتے تھے، یہاں تک کہ امیر معاویہؓ نے واقعۂ تحکیم کے بعد بسر کو بھیجا کہ ملک میں دورہ کرے، اور جہاں

جہاں شیعیان علی ہوں ان کو قتل کردے، اور عورتوں اور بچوں میں سے کسی کو نہ چھوڑے، مصنف کے الفاظ یہ ہیں

ویقال انه امرهم ان یسیروا فی	اور کہتے ہیں کہ معاویہؓ نے ان لوگوں کو
الارض ویقتلوا کل من وجدوه	یہ حکم دیا کہ ملک میں جائیں، اور جس
من شیعة علی ولا یکفوا ایدیهم	شیعہ کو پائیں قتل کردیں، اور عورتوں
من النساء والصبیان (حصہ ۴ ص ۸۲)	اور بچوں کو بھی نہ چھوڑیں،

اس کے بعد مصنف نے ثابت کیا ہو کہ یہ صرف حکم نہ تھا بلکہ مکہ مدینہ یمن وغیرہ میں اس کی بخوبی تعمیل ہوئی، اس میں شبہہ نہیں کہ اگر یہ واقعات صحیح ہوں تو امیر معاویہ اور چنگیز خاں میں کچھ فرق نہ ہوگا،

امیر معاویہؓ حلم اور عفو میں ضرب المثل تھے، تمام مستند تاریخیں ان کے حلم کی داستان سے معمور ہیں، ان کی سفاکی کے ثبوت کے لیے مصنف کو طبری، ابن الاثیر، ابن خلدون وغیرہ سے کوئی شہادت نہیں مل سکتی تھی، اس لیے اس نے شیعی مصنف سے مدد چاہی، اور وہ خوشی سے اس خدمت کو انجام دینے کے لیے موجود تھا، مصنف نے واقعۂ مذکورۂ بالا کتاب الاغانی سے نقل کیا ہے، اس کتاب کا مصنف مشہور شیعی ہے، اور ایک شیعہ مصنف سے امیر معاویہؓ کی نسبت یہی توقع ہو سکتی تھی، اس پر مزید یہ کہ اغانی میں یہ روایت جن لوگوں سے منقول ہے وہ نامعتبر ضعیف الروایت اور مجہول الحال ہیں، علی بن محمد (مدائنی) جو اس روایت کا راوی اول ہے، اس کی میزان الاعتدال میں ابن عدی سے نقل کیا ہے کہ لیس بالقوی فی الحدیث، ایک اور راوی ابو مخنف ہیں، جو مشہور نامعتبر ہیں، باقی اور راوی اس درجہ کے ہیں کہ اسمائے رجال میں ان کا نام تک مذکور نہیں،

ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ اغانی ادب اور محاضرات کی مشہور کتاب ہو، اور شعراء وغیرہ کے اکثر حالات اسی سے ماخوذ ہیں، لیکن یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ وہ محاضرات کی کتاب ہو، تاریخ نہیں، اس بنا پر معمولی عام واقعات میں اس کی روایتیں لی جا سکتی ہیں، لیکن کسی بحث طلب اور قابل تحقیق واقعہ کا ثبوت اس سے نہیں ہو سکتا یہ مسلّم ہے کہ امیر معاویہؓ حلم اور عفو میں مشہور تھے، یہ مسلّم ہے کہ ان کی نسبت تمام معتبر تاریخوں میں ایک واقعہ بھی اس قسم کی سفاکی کا منقول نہیں، یہ مسلّم ہے کہ واقعۂ بحث طلب کسی تاریخ میں مذکور نہیں، یہ مسلّم ہے کہ اغانی کا مصنف

شیعی ہے، یہ مسلّم ہے کہ اس روایت کا ایک راوی مدائنی ہے، جو ضعیف الحدیث ہے، ان حالات کے ساتھ اس روایت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے حجاج کی سفاکیوں کا ذکر کیا ہے، وہ ہم کو تسلیم ہے لیکن ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مصنف نے عدل و انصاف کا معیار کیا قائم کیا ہے؟ وہ جس قدر بنوامیہ کو برا کہتا ہے، اسی قدر عباسیوں کی تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں یہ ثابت کیا ہے کہ بنو امیہ کے ظلم کی وجہ سے ملک برباد ہو گیا تھا، اور زمینیں ویران ہو گئی تھیں، اس کے مقابلہ میں عباسیوں کے عہد کی خوشحالی اور آبادی کا ذکر کر کے ایک موقع پر لکھتا ہے،

ولا غرابة فی ما تقدم من عمران	اگر دولت عباسیہ کے سایہ میں آبادی نے
البلاد فی ظل الدولة العباسية فان	ترقی کی، جیسا کہ اوپر گذرا تو کچھ تعجب نہیں،
العدالة توطدت دعائمها لان داذ	کیونکہ انصاف اس کا ستون قائم کر دیتا ہے،
امن الناس على ارواحهم وحقوقهم	اور جب لوگوں کو اپنی اور اپنی جانوں کی
تفرغوا للعمل،	نسبت اطمینان ہو جاتا ہے، تو اطمینان سے
(حصہ ۲ صـ۸)	کام میں مصروف ہوتے ہیں،

مصنف نے کشتگانِ حجاج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بیان کی ہے، لیکن خلیفہ منصور عباسی جس کا مصنف نہایت مدح خواں ہے، اس کے وزیر اعظم ابومسلم اصفہانی کو جو دولتِ عباسیہ کا بانی ہے، اس کے کشتگانِ ناز کی تعداد چھ لاکھ تک ہے، اور خود مصنف نے اسکا اعتراف کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:

فبلغ عدد الذين قتلهم في سبيل	تو ان لوگوں کی تعداد جن کو ابومسلم نے
هذه الدعوة......نفس قتلوا صبرا	عباسیوں کی خلافت کے تسلیم کرانے میں
بدون حرب في بضع سنين.	قتل کیا چھ لاکھ پہنچی، جو لڑائی میں نہیں بلکہ
(حصہ ۴ ص ۱۱۲)	یوں ہی قید میں مارے گئے،

اگر دولتِ عباسیہ کے دامن پر چھ لاکھ کے قتل سے ظلم کا داغ نہیں لگتا، تو حکومت بنوامیہ تو سوا ہی لاکھ کی گنہگار ہے،

حجاج کے ظلم گنا کر مصنف لکھتا ہے:

وکان عبد الملک اشد وطاٴة منه	اور عبد الملک اس سے بڑھ کر سخت تھا، اور
واجرء علی القتل والفتك	قتل اور دغابازی پر اس سے زیادہ دلیر تھا،

اس جھوٹ کی کیا انتہا ہو سکتی ہے کہ عبد الملک کو حجاج سے بڑھ کر سفاک اور خون ریز کہا جائے، مصنف اس غلط دعوے کے ثبوت میں صرف یہ واقعہ پیش کر سکا کہ عبد الملک نے ایک شخص کو جس نے دعویٰ سلطنت کرنا چاہا تھا، امان دے کر قتل کرا دیا، لیکن خلیفہ منصور نے تو اس شخص کو قتل کرا دیا، جس کی بدولت عباسیوں کی سلطنت قائم ہوئی تھی، اور جو دولت عباسیہ کا اصلی بانی تھا،

مصنف کا دعویٰ ہے کہ حجاج وغیرہ جو مظالم کرتے تھے، خود خلیفۂ وقت کے اشارہ سے کرتے تھے، لیکن علامہ مسعودی عبد الملک کے حال میں لکھتے ہیں

ولما اسرف الحجاج فی قتل اساری	جب حجاج نے دیر جماجم کے قیدیوں کے
دیر الجماجم عبد الملک فکتب الیه	قتل کرنے میں حد سے زیادہ زیادتی کی اور
اما بعد فقد بلغ امیر المومنین سرفك	مال کے صرف میں نہایت اسراف کیا، اور یہ
فی الدماء وتبذیرك فی الاموال	خبر عبد الملک کو پہنچی تو حجاج کو خط لکھا، کہ
ولا یحتمل امیر المومنین هاتین	امیر المومنین کو تمہاری خون ریزی اور فضول
الخصلتین لاحد من الناس و	خرچی کا حال معلوم ہوا، امیر المومنین ان
قد حکم علیك امیر المومنین فی	دونوں باتوں کو کسی کے لیے برداشت نہیں
الخطاء الدیة وفی العمد القود و	کر سکتے، امیر المومنین نے تم کو خون میں صرف
فی الاموال ردها الی مواضعها،	یہ اختیار دیا ہے، کہ لوگوں سے قتل خطا میں
	دیت لو، اور قتل عمد میں قصاص لو، مال
	کی نسبت یہ حکم ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر
(یہ خط بہت بڑا ہے اور سب پڑھنے کے قابل ہے)	صرف ہو،

جزیہ کے متعلق ظلم | مصنف نے کتاب کے چوتھے حصہ میں ایک مستقل عنوان قائم کرکے اور حصۂ دوم میں "عصر بنی امیہ" کے عنوان کے نیچے یہ ثابت کیا ہے، کہ بنو امیہ جزیہ کے وصول کرنے میں اس قدر ظلم کرتے تھے کہ غیر قوموں نے مسلمان ہونا شروع کیا، لیکن اس پر بھی ان کو نجات نہیں ملتی تھی اور مسلمان ہونے پر بھی ان سے جزیہ لیا جاتا تھا آخر مجبور ہوکر انھوں نے راہب یعنی تارک الدنیا بننا چاہا، لیکن یہ تدبیر بھی کام نہ آئی، اور راہبوں پر بھی جزیہ قائم کیا گیا[1] جزیہ کے سوا اور طرح طرح کے محصول قائم کرتے تھے، اور ان کے وصول کرنے میں اس قدر ظلم سے کام لیتے تھے، کہ ملک کے ملک ویران ہوگئے۔ فوجیں جب جاتی تھیں تو جدھر سے گذرتی تھیں، لوگوں کو لوٹ لیتی تھیں،

اس بحث کو اس طرح لکھتا ہے کہ ظلم اور غارت گری کی تصویر کھینچ دی ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے:

ثم اعادوا الجزية والخراج وشددوا	پھر جزیہ و خراج کو نافذ کردیا، اور اس
في تحصيلهما وضيقوا على الناس حتى	کے وصول کرنے میں شدت کی، اور لوگوں
اخذوا الجزية ممن اسلم واما من	کو سخت تنگ کیا، یہاں تک کہ جو لوگ
بقي على دينه من اهل الكتاب	مسلمان ہو جاتے تھے، ان سے بھی جزیہ
فصاروا يسومونهم سوء العذاب	لیا، باقی جو اپنے مذہب پر قائم رہتے تھے،
(حصہ ۴ ص ۱۰۲)	ان کو بری طرح سے عذاب دیتے تھے،

اس کی کیفیت یہ ہے کہ بنی امیہ کی سلطنت قریباً سو برس رہی، اس وسیع مدت میں تین چار واقعے پیش آتے ہیں، کہ مسلمان ہونے پر بھی جزیہ لیا گیا، ان چند واقعات کو مصنف اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ بنو امیہ کا یہ عام طرز عمل تھا، اس موقع پر لکھتا ہے:

وخصوصا اهل الخراسان وما وراء النهر	خصوصاً اہل خراسان و ماوراء النہر کہ یہ
فانهم ظلوا الى اواخر ايام بني امية لا يمنعهم	لوگ آخر زمانہ بنی امیہ تک صرف اس
عن الاسلام الا ظلم العمال بطلب الجزية	لیے اسلام پر ایمان نہ لائے کہ عمال اسلام

[1] تمدن اسلام حصۂ دوم ص ۲۰،

کے بعد بھی ظلماً جزیہ لیتے تھے،   منیعہ بدل اسلام (حصہ ۴ ص ۷۷)

ان واقعات کو ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوگا کہ اس کے بیان میں مصنف نے کس قدر جھوٹ اور فریب اور رنگ آمیزیاں کی ہیں،

سنہ ۸۱ھ میں حجاج کو سندھ کے عاملوں نے لکھا کہ غیر قومیں مسلمان ہو کر شہروں میں چلی آئیں، اس لیے خراج کی آمدنی گھٹ گئی، حجاج نے بصرہ وغیرہ میں حکم بھیجدیا کہ یہ نومسلم مواضعات کو واپس بھیجدیے جائیں، اور ان سے جزیہ لیا جائے، بصرہ میں جب حکم پہنچا اور ان لوگوں سے جزیہ وصول کیا جانے لگا، تو یہ لوگ روتے تھے، اور وا محمداہ پکارتے تھے، یہ دیکھکر وہاں کے علماء روتے تھے، اسی حالت میں عبدالرحمن بن اشعث جنہوں نے حجاج سے بغاوت کی تھی بصرہ میں پہنچے، علماء دو قرائے حجاج کے فعل سے ناراضی کی بنا پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی،

علامہ ابن الاثیر نے سنہ ۸۱ھ کے اخیر واقعات میں نہایت تفصیل کے ساتھ ان واقعات کو لکھا ہے، ان واقعات میں حسب ذیل واقعات بہ تصریح مذکور ہیں،

(۱) حجاج کے ظلم پر بصرہ کے علماء روئے،

(۲) یہ علماء حجاج سے ناراض ہو کر عبدالرحمن بن اشعث سے مل گیے،

مصنف نے علمائے بصرہ کی ہمدردی اور رنج کا ذکر بالکل قلم انداز کر دیا، کیونکہ اس سے عام عربوں کی نیک دلی اور حجاج کے فعل سے آزردگی ثابت ہوتی تھی،

عبارات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے، کہ حجاج کا یہ فعل اس قدر غیر معمولی اور خلاف شرع تھا کہ علمانے صرف اس وجہ سے حجاج سے بغاوت کی، اور شریک جنگ ہوئے، لیکن مصنف دکھاتا ہے کہ سلطنت بنوامیہ میں نومسلموں سے جزیہ لینا عام معمول تھا،

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کے زمانہ میں جراح نے حجاج کی تقلید کی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کو معلوم ہوا تو جراح کو لکھ بھیجا کہ نومسلموں کو جزیہ معاف کر دیا جائے، جزیہ معاف کر دیا گیا تو اور ہزاروں آدمی مسلمان ہوگیے، اور خراج کی تعداد گھٹ گئی، جراح نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ یہ لوگ صدق دل سے اسلام نہیں لائے، اس لیے حکم ہو تو میں تحقیق کروں کہ ان لوگوں نے ختنہ بھی کرایا ہے یا نہیں، حضرت عمر رضؓ نے لکھ بھیجا کہ خدا

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت اسلام کے لیے بھیجا تھا، نہ ختنہ کرنے کے لیے یہ تمام واقعات ابن الاثیر نے ۲۰۰ھ کے واقعات میں بہ تفصیل لکھتے ہیں،

مصنف نے اس واقعہ میں سے صرف جراح کا جزیہ لینا لکھا ہے، باقی تمام واقعات اور حضرت عمرؓ کے حکم کو اڑا دیا ہی، ۱۰۲ھ یزید بن ابی مسلم نے افریقہ میں حجاج کی تقلید کرنی چاہی، اس پر لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، اور یزید بن عبد الملک کو جو خلیفۂ وقت تھا لکھ بھیجا کہ ہم نے اس وجہ سے اس کو قتل کر دیا، یزید بن عبد الملک نے لکھ بھیجا کہ میں اسکے اس فعل کو خود ناپسند کرتا تھا، چنانچہ ان لوگوں سے کچھ باز پرس نہ کی۔[۱]

مصنف کی اس خیانت کو دیکھو کہ یزید بن ابی مسلم کی کارروائی لکھ کر باقی تمام واقعات کو قلم انداز کر دیا ہی،[۲]

۱۱۰ ہجری میں اشرس نے نومسلموں پر جزیہ لگایا، اس پر لوگوں نے بغاوت کی، اور رؤسائے عرب نے ان کی حمایت کی، اس واقعہ میں بھی مصنف نے اہل عرب کی حمایت کا مطلق ذکر نہیں کیا،

واقعات مذکورۂ بالا کی نسبت امور ذیل پر لحاظ کرو۔

بنو امیہ کی صد سالہ حکومت میں چند دفعہ یہ واقعہ پیش آیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے اپنے زمانے میں اس کارروائی کو روکا، یزید بن عبد الملک کے زمانہ میں جب یزید بن ابی مسلم نے ایسا کرنا چاہا تو بغاوت ہوئی، اور اہل عرب نے باغیوں کا ساتھ دیا،

غرض خلفائے بنو امیہ میں سے کسی نے اس فعل کو جائز نہیں رکھا، عمال نے ایسا کیا تو یا خود خلیفۂ وقت نے روک دیا، یا اہل عرب نے عاملوں کی مخالفت کی اور ان سے لڑے،

مصنف نے خلفاء کے روکنے یا عام مسلمانوں کی ناراضی اور مظلوموں کی حمایت کا مطلق ذکر نہیں کیا،

اور ان چند واقعات کو اس طرح ادا کیا کہ بنو امیہ کے زمانۂ سلطنت میں یہ عام رواج تھا

مصنف نے لکھا ہے کہ غیر قوموں پر چونکہ بنو امیہ ظلم کرتے تھے، اس لیے جب کوئی بغاوت ہوتی تھی تو یہ لوگ اس میں شریک ہو جاتے تھے، اس کے بعد لکھتا ہے:

وقام فی نفوس العرب ان الخلافة — اور عرب کے ذہن میں یہ بات قائم ہو گئی

---

[۱] ابن الاثیر واقعات اخیر ۱۰۲ھ، [۲] تمدن اسلام حصۂ دوم ص ۲۰،

لا تشترط فیها القرشیۃ (ج۲ص۲۹) کہ خلافت کے لیے قریشی ہونا ضروری نہیں۔

اس موقع پر مصنف نے سخت خیانت اور اعلانیہ دروغ گوئی کی ہے، اس عبارت کے ثبوت میں کتاب الاستقصا کی جلد اول صفحہ ۹ کا حوالہ دیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ مصنف استقصا نے اہل بربر اور مغرب (تیونس) وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ لوگ پہلے مذہب حق پر تھے پھر اہل بدعت نے ان کو گمراہ کیا، اس کے بعد لکھا ہے کہ:

فلقنھم اھل البدعۃ ان الخلافۃ لا تشترط فیھا القرشیۃ | یعنی ان کو اہل بدعت نے سکھایا کہ خلافت میں قریشی ہونا مشروط نہیں۔

مصنف کتاب مذکور کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اہل عرب کے دل میں یہ اعتقاد قوی ہو گیا، لیکن اس کتاب میں عرب نہیں بلکہ اہل مغرب کے متعلق یہ واقعہ مذکور ہے، وہ بھی اس حیثیت سے کہ بدعتیوں نے ان کو گمراہ کر کے یہ خیال ان کے دل میں ڈالا تھا۔

مصنف نے لکھا ہے کہ بنو امیہ چوں کہ غیر مذہب والوں کو سخت عذاب دیتے تھے اور ان لوگوں نے دیکھا کہ مسلمان ہونے پر بھی جزیہ سے نجات نہیں ملتی، اس لیے بعضوں نے راہب (جوگی) بننا اختیار کیا، عمال نے جب یہ دیکھا تو راہبوں پر بھی جزیہ لگایا۔ (حصہ دوم ص ۴۰)

اس واقعہ کے لیے مصنف نے مقریزی (ص۴۹۲) کا حوالہ دیا ہے، لیکن سخت خیانت کی ہے، مقریزی میں ایک حرف بھی اس کے متعلق مذکور نہیں کہ لوگوں نے جزیہ کے ڈر سے راہب ہونا اختیار کیا، صرف یہ لکھا ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے راہبوں کا خون کرایا اور ان پر جزیہ لگایا۔

دولتِ عباسیہ | مصنف نے خلافتِ عباسیہ کا ذکر نہایت مدح کے ساتھ شروع کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک یہ سلطنت دراصل عربی نہ تھی، بلکہ ایرانی تھی، لیکن لطف یہ ہے کہ مدح ذم سے بڑھ گئی ہے، عباسیوں کے خصائص حکومت میں ایک یہ شمار کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں عرب یہاں تک ذلیل ہو گیے تھے کہ کسی کو عرب کہنا بدتر سے بدتر لقب تھا، چنانچہ لکھتا ہے:

فاصبح لفظ العربی مرادفاً لا حقر الاوصاف | تو ان کے نزدیک عربی کا لفظ بدترین

تمدن عرب (حصہ ۲ ص ۳۲) لقب کا مرادف تھا،

پھر لکھتا ہے کہ ان لوگوں کا قول تھا کہ:

العربی بمنزلۃ الکلب اطرح لہ کسرۃ واضرب راسہ، عربی کتے کے برابر ہے، روٹی دے کر اس کو مارو،

اس عبارت کے نقل کرنے میں سخت خیانت کی، واقعہ یہ ہے کہ یہ افشین کا قول ہے، جو ایک مجوسی تھا، اور بظاہر مسلمان ہوگیا تھا، مصنف نے اس کو عام کرکے تمام ارباب حکومت کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن بہرحال اگر صحیح بھی ہو تو کیا یہ عباسیوں کے مفاخر میں شمار ہونے کے قابل ہے،

مصنف کے نزدیک عباسی اس وجہ سے قابل مدح ہیں کہ انھوں نے عرب کو فوج سے اور عہدہ ہائے ملکی سے نکال دیا، ان کے زمانہ میں عرب کتے کے برابر حقیر ہوگئے تھے، انھوں نے سلطنت کے تمام اختیارات مجوسیوں کو دیدیے تھے، لیکن معلوم نہیں عباسی بھی ان باتوں کو اپنے مفاخر میں قبول کریں گے یا نہیں،

(الندوہ جلد ۸ نمبر ۱۰ شوال ۱۳۲۹ھ)

معرکۂ مذہب و سائنس (مصنفہ ڈریپر)

مترجمہ

مسٹر ظفر علی خاں بی۔ اے

پر

ریویو

اردو زبان کم رتبہ تصنیفات اور تراجم سے جس طرح روز بروز معمور ہوتی جاتی ہے، اس کے لحاظ سے اگرچہ اہل نظر پر مایوسی چھاگئی ہے، لیکن مدتوں میں ایک آدھ تصنیف یا ترجمہ ایسا بھی نکل آتا ہے، جو ... میں امید کی جھلک پیدا کر دیتا ہے، زیر ریویو ترجمہ بھی اسی قسم کا ایک ترجمہ ہے،

ڈاکٹر ڈریپر امریکہ کا مشہور عالم ہے، وہ نیویارک یونیورسٹی کا پروفیسر تھا، اس کی ابتدائی بہت سی تصنیفات علم الضوء اور کیمیا پر ہیں، وہ ان فنون میں بہت سے اختراعات کا موجد ہے، چنانچہ مترجم صاحب نے اپنے دیباچہ میں بتفصیل لکھا ہے، اس سلسلہ سے الگ اس نے یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ لکھی، جو ایک گراں قدر تصنیف خیال کیجاتی ہے، اور تصنیف زیر ریویو اس کے دور آخر کی تصنیف ہے،

مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں، ان کی کتاب خیابان فارس متداول ہو چکی ہے، لیکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے، ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا، کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا، اس لیے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا، البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں، کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ

صاف اور قریب الفہم نہیں ہوسکتا، مترجم نے مصطلحات علمی کے ترجمہ میں بہت سے الفاظ گویا خود پیدا کیے ہیں چنانچہ خاتمہ میں ایسے الفاظ کی جو فہرست دی ہے، اس میں بہت سے الفاظ ہم کو جدید النشاۃ نظر آتے ہیں، مثلاً اشد کھنی بنا نات خوار، دورشالثۃ الوسطی، دولاب تعدیل، توشیم، جماعت اکثرین، تقدیس الاموات وغیرہ وغیرہ،

مترجم صاحب اگرچہ بہت متین لکھنے والے ہیں، لیکن کہیں کہیں سخیف محاورے آگئے ہیں، جو ایک علمی کتاب کے شایان شان نہیں، مثلاً "دم دبا کر" "اڑنگے پر چڑھا کر" وغیرہ وغیرہ،

مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے، انہوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے، اور اس وقت وہ مترجم نہیں، بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں،

کتاب کا موضوع نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے، یعنی یہ کہ دنیا میں مذہب اور تحقیقات علمی کا باہمی تعلق کیا رہا ہے، کیونکہ یہ دونوں معرکہ آرا رہے ہیں، مذہب نے کس طرح پر بے انتہا جور وظلم کیے ہیں، اور بالآخر کس طرح ہر معرکہ میں شکست فاش کھائی ہے، لیکن اس کتاب کے متعلق سب باتوں سے پہلے یہ کہنا پڑتا ہے، کہ مصنف نے یہ سخت غلطی کی ہے کہ کتاب کا موضوع عام رکھا ہے، اور بحث صرف عیسوی مذہب سے کی ہے، اس لیے اگر عیسوی مذہب نے علم پر زیادتیاں کیں، اور بالآخر شکست کھائی تو اس سے عام مذہب کے نسبت کوئی نتیجہ کیونکر پیدا ہوسکتا ہے، اس امر پر ہم آیندہ مفصل گفتگو کریں گے،

اس کتاب پر ہم مختلف حیثیتوں سے بحث کرتے ہیں،

موضوع کتاب | یورپ کے مشہور مصنف سے نہایت تعجب ہے کہ وہ ایک ایسا وسیع مضمون اختیار کرتا ہے، جس کے دائرہ میں تمام دنیا کے مذاہب اور قومیں داخل ہیں، لیکن صرف عیسائی قوموں اور عیسائی مذہب کی تاریخ سے بحث کرتا ہے، اور انہی قوموں کے واقعات پیش کرتا ہے، مسلمانوں کی علمی اور ملکی تاریخ لکھی ہے، لیکن اس غلط بنا پر کہ مذہب اسلام نصرانیت کی ایک شاخ ہے، اس موضوع کے پیش نظر ہونے کے ساتھ ہر شخص بے ساختہ اس بات کے دریافت کرنے کا شایق ہوگا، کہ بدھ، برہمنی، جینی، پارسی مذاہب کا علم کے ساتھ کیا طریق عمل رہا اور دونوں حریفوں میں سے کس نے بازی جیتی؟ لیکن غالباً مصنف کے نزدیک دنیا صرف عیسائی دنیا کا نام ہے، اس لیے اس کو دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں سے بحث کی ضرورت نہیں،

مصنف نے اس معرکہ کی تاریخ جس ترتیب سے بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"چوتھی صدی قبل مسیح یونان نے ایران پر حملہ کیا، اور جدید معلومات سے بہرہ ور ہو کر اسکندریہ میں دار العلم کی بنیاد ڈالی، رومی سلطنت نے عیسائی مذہب قبول کیا، اور کچھ مدت کے بعد جمہوریت شخصیت سے بدل گئی، چونکہ اس رومی سلطنت کے تحت میں تمام بت پرست قومیں آگئیں، اور ان کے معتقدات اور رسوم کا لحاظ رکھنا پڑا، اس لیے عیسائیت میں بت پرستی آگئی، ساتھ ہی علم اور عیسائیت میں معرکہ آرائی شروع ہوئی، اور کتب خانہ اسکندریہ برباد ہو گیا، ۲

جنوب میں اصلاح شروع ہوئی، یعنی پادری نسطور کی تلقین و ہدایت سے اسلام پیدا ہوا۔

(استغفر اللہ)

اس کے بعد مصنف نے ان اہم مسائل کو لیا ہے، جن میں مذہب اور علم مختلف ہیں، اور الگ الگ عنوان کے تحت میں دکھلایا ہے، کہ ان مسائل میں کیونکہ علم و مذہب باہم جنگ آزما رہے، اور کیونکہ علم نے فتح حاصل کی، مسلمانوں کے تمام علمی کارناموں اور اکتشافات کا ذکر کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں علم پھیلا، اور عیسائی مذہب کے بیہودہ عقائد کا تمام طلسم ٹوٹ گیا، پہلے ہی دلہ میں ہم کو مصنف کی اس رائے سے بحث کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، کہ اسلام کو نسطور سے کہاں تک تعلق ہے، کیونکہ مصنف کے نزدیک علم کی فتح درحقیقت نسطور کا فیض تھا، جس نے گویا اسلام کی بنیاد رکھی، مصنف اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتا ہے:

"بحیرا راہب نے بصرے کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک کہہ سنائی آپ کی ×× ناتربیت یافتہ (استغفر اللہ) لیکن مستعد اور اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ×× بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے، کہ نسطوریوں کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا × آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقائد کی توسیع و اشاعت کے لیے وقف کر دیا، اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی و مشائی اصول

اختیار کر لیے، اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

اگر چہ ڈریپر صاحب کے مقابلہ میں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ بحیرا کی ملاقات معتبر طریقے سے ثابت نہیں، لیکن چوں کہ یہ روایت عام عربی تاریخوں میں مذکور ہے، اس لیے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کی نسبت بحث کرنا چاہتے ہیں۔

یہ روایت جس حیثیت سے عربی کتابوں میں مذکور ہے، اس سے ڈریپر صاحب کے دعوا کو کچھ مدد نہیں مل سکتی، یہ روایت ترمذی، حاکم، بیہقی، ابونعیم اور ابن عساکر نے روایت کی ہے، ترمذی کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے:

"ابوطالب شام کے سفر کو چلے، آنحضرت ﷺ اور چند سرداران قریش ساتھ تھے، جب راہب (یعنی بحیرا) کے پاس آ ئے اور اسباب کھولنا شروع کیا تو راہب آیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، یہ تمام عالم کا سردار اور خدا کا پیغمبر ہے، خدا نے اس کو دنیا کی رحمت کے لیے بھیجا ہے، سرداران قریش نے پوچھا کہ تم کو کیوں کر معلوم ہوا، اس نے کہا کہ جب تم پہاڑ کی چوٹی سے اترے تو تمام پتھروں اور درختوں نے سجدہ کیا، اور پتھر اور درخت پیغمبر کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے، میں ان کو مہر نبوت کے ذریعہ سے پہچانتا ہوں، پھر اس نے خانقاہ میں جا کر کھانا تیار کیا، اور لوگوں کو بلایا تو آنحضرت ﷺ کے سر پر بادل سایہ کرتا آتا تھا، آنحضرت ﷺ درخت سے ہٹ کر بیٹھے، کیوں کہ اور لوگوں نے پہلے سے پہنچ کر قبضہ کر لیا تھا، جب آپ ﷺ بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ ﷺ پر جھکا، راہب نے لوگوں سے کہا دیکھو سایہ کیوں کر ان پر جھکا آتا ہے، الخ (اخیر میں یہ ہے کہ اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ بھی تھے۔)

یہی روایت طرح طرح کے پیرایے بدل کر طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، ابن ہشام وغیرہ میں منقول ہے، اس حدیث کی یہ کیفیت ہے کہ ترمذی نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حسن اور غریب ہے، اور صرف اسی طریقہ سے منقول ہے، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عبدالرحمٰن بن غزوان کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

مما یدل علی انه باطل قوله و بعث — اس حدیث کے باطل ہونے کی یہ دلیل ہے کہ

معه ابوبکر بلالاً و بلال لم یخلق و ابوبکر کان صبیا،

اس میں یہ بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا حالانکہ اس وقت بلالؓ تو پیدا نہیں ہوئے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے،

مستدرک نے حاکم کی تلخیص میں لکھا ہے:

اظنہ[1] موضوعا فبعضہ باطل،

میں اس کو جعلی روایت سمجھتا ہوں، کیونکہ اسکا کچھ ٹکڑا باطل ہے،

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اخیر کا ٹکڑا ممکن ہے کسی نے ملا دیا ہو، باقی حدیث اس لیے صحیح ہے کہ راوی ثقہ ہیں، لیکن اصل بحث یہ ہے کہ سب سے اخیر راوی یعنی ابوموسیٰ اشعریؓ خود واقعہ میں شریک نہیں تھے، اور یہ بیان نہیں کرتے کہ انھوں نے کس سے سنا، اس لیے یہ حدیث منقطع ہے، ممکن ہے کسی غیر معتبر شخص نے ان سے بیان کی ہو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے واقعات جس قدر منقول ہیں، اکثر محدثین کے نزدیک غیر معتبر اور غیر مستند ہیں،

اب درایت کی حیثیت سے ڈریپر صاحب کے بیان پر نظر ڈالو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اس وقت کل بارہ[۱۲] برس کی ہے، اسی سن میں بحیرا آپ کو عقائد کے حقایق اور فلسفہ سکھاتا ہے، اور آپ کے دل میں نقش ہو جاتا ہے، لیکن اس کے بعد پورے اٹھائیس[۲۸] برس تک ان عقائد اور فلسفہ کے متعلق ایک حرف آپ کی زبان سے منقول نہیں، روایتوں سے اس قدر ثابت ہے کہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیتے تھے، کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں، اوروں سے سیکھ کر کہتے ہیں، لیکن یہ سکھانے والے (باعتقاد کفار) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے کے لوگ تھے، یعنی سلمان فارسیؓ وغیرہ، بحیرا کا نام کافروں نے بھی نہیں لیا، تا بہ مسلمانان چہ رسد،

ڈریپر صاحب ان ممتاز مورخوں میں ہیں جو اسلام سے تعصب نہیں رکھتے، انھوں نے مسلمانوں کی علمی ایجادات اور اکتشافات کا ذکر اس تفصیل سے کیا ہے کہ خود عربی تاریخوں میں کسی جگہ یکجا نہیں مل سکتا، لیکن افسوس

---

[1] زرقانی شرح مواہب لدنیہ ص ۲۰۳ مطبوعہ مصر جلد اول،

ہے کہ صاحب موصوف کی نسبت ہماری احسان مندی اس وجہ سے کم ہو جاتی ہے، کہ ان کی مہربانیاں اسلام پر اس لیے نہیں ہیں کہ وہ اسلام ہے، بلکہ اس لیے ہیں کہ وہ نسطوری مذہب کی ایک شاخ ہے، مسلمانوں کے علوم و فنون ان ہی مشائی اصول کے نتائج ہیں، جو بحیرا نے تعلیم دیئے تھے، مسلمانوں کو اپنی خالص توحید پر بڑا ناز ہے، لیکن ڈریپر صاحب کے بتانے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی بحیرا کا فیض تعلیم ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"راہب بحیرا نامی نے کوشش کی کہ جس طرح ہو اس لڑکے (محمد) کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے، زائل کیا جائے، بحیرا نے دیکھا کہ لڑکا نہایت ہونہار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے، اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے"

(نعوذ باللہ من ہذہ الهفوات)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

"بحیرا راہب کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا، حضرت مسیحؑ کو کبھی خدا بیٹا کہہ کر نہ پکارا،"

اگر بت پرستی اور حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا انکار دونوں چیزیں اسلام نے بحیرا سے سیکھیں، تو خود اسلام کے پاس کیا رہجاتا ہے،

مصنف نے اسلامی فتوحات کے ذکر میں کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا ذکر بھی کیا ہے، اور وہاں اس طرح ان پر تعصب نے استیلا کیا ہے، کہ بظاہر ان کا کلام خود متناقض ہو گیا ہے، چنانچہ مترجم صاحب نے نوٹ میں اس پر تعصب ظاہر کیا ہے، لیکن حقیقت میں ان کے بیان میں تناقض نہیں،

مصنف نے حسب ذیل دلیلوں سے ثابت کیا ہے، کہ کتبخانۂ مذکور کا جلایا جانا صحیح نہیں ہو سکتا،

(۱) اس کتب خانہ کو تھیافلس نے پہلے ہی برباد کر دیا تھا، چنانچہ اس واقعہ کے بیس برس بعد اروسیوس نے جب کتبخانہ کو دیکھا تو ایک کتاب بھی باقی نہ تھی،

(۲) اگر اس بربادی کے بعد کتب خانہ بچا بھی ہو گا تو بہت کم کتابیں بچی ہوں گی، حالانکہ الزام لگانے والے کہتے ہیں کہ پانچ لاکھ کتابیں تھیں، جو حضرت عمرؓ کے حکم سے جلائی گئیں،

(۳) کتابیں اکثر جھلی پر لکھی ہوئی تھیں، اس لیے وہ حمام کے جلانے میں کام نہیں آسکتی تھیں، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ کہتا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے جلائے جانے کا حکم ضرور دیا، مترجم نے اسی بنا پر تناقض بیانی کا الزام قائم کیا ہے، لیکن اصل میں تناقض نہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم ضرور دیا، لیکن اس کی تعمیل اس لیے نہیں ہوسکتی تھی، کہ کتب خانہ پہلے ہی برباد ہوچکا تھا، مسلمانوں کا مذہب ہے کہ کسی برے کام کے محض نیت کرنے سے گناہ نہیں ہوتا، جب تک وہ عمل میں نہ آئے، اس لیے ہم مصنف کے ممنون ہیں، کہ اس نے درحقیقت حضرت عمرؓ کو الزام سے بچالیا ہے، لیکن ہم اس سننے کے مشتاق ہیں کہ ان کے پاس اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا بھی تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے، لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا۔ وہ نوشت وخواند سے عاری تھے، ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر انھوں نے یہ حکم دیا تو یہ کون تعجب کی بات ہے۔"

جو شخص حضرت عمرؓ کو نوشت وخواند سے عاری کہتا ہے، اس کی تاریخ دانی کے مقابلہ میں ہماری کیا پیش جاسکتی ہے، ان باتوں کے ظاہر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یورپ میں جو لوگ ہم پر مہربان ہیں، ان کی مہربانی کی بھی یہ حالت ہے،

مصنف مسلمانوں کے عقائد ومسائل، علوم وفنون، صنائع وہنر سے اچھی طرح واقف ہے، اور اس کے متعلق جو تفصیلی بحث اس نے کی ہے، احسان مندی کے قابل ہے، تاہم جابجا اسکی اصلی فطرت کی جھلک بھی نظر آتی ہے، فقرات ذیل ملاحظہ ہوں:

"تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں بدر، احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں، آپ کو معلوم ہوگیا کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے..... اسلام کے خدا کی صورت شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ مہیب اور بارعب ہو، بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ان لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوسکتا، جو حکمت آشنا نہیں ہیں، ان کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو ہیکل انسان ہے، جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے، اور ٹانگیں زمین

پر ہیں، قرآن کے رو سے زمین ایک سطح مربع ہے، جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں×× آسمان کے اوپر بہشت کی بنیاد ہے، جس کی سات منزلیں ہیں، سب سے اونچی منزل خدا کا مسکن ہے، جہاں وہ دیو پیکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے، اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کے ذوالجناح بیل ہیں، جیسے قدیم سریانی بادشاہوں کے محل میں ہوتے تھے''

اب ہم اس صفحہ کو الٹ دیتے ہیں، کیونکہ ہم کو اپنے ریویو کو زعفران زارِ کشمیر نہیں بنانا چاہیئے، مصنف کی کتاب کا بہترین حصہ وہ ہے، جس میں ان تمام علمی مسائل کو الگ الگ بیان کیا ہے، جو مذہب کے مخالف خیال کیے جاتے تھے، ہم اس پر کسی قدر تفصیلی بحث کریں گے، لیکن پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان مسائل کے ساتھ یورپ نے اپنے زمانے میں کیا کیا، مصنف نے تفصیل سے لکھا ہے، کہ علمی مسائل کیونکر ابن رشد کے ذریعہ سے یورپ میں پھیلے، ان کے پھیلنے پر ایک محکمۂ انکویزیشن کے نام سے قائم کیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ عقائد باطلہ کی سراغ رسانی اور تفتیش کی جائے، ۱۴۸۱ء میں پوپ کے حکم سے باقاعدہ اس کا محکمہ قائم ہوا، اور اس نے پہلے ہی سال یہ اہل فخر کارگذاری دکھائی، کہ دو ہزار شخص اسپین میں زندہ جلا دیئے، اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس شخص زندہ جلائے گیے، اور ستانوے ہزار تین سو اکیس شخص کو اور مختلف طریقوں سے سزائیں دی گئیں، جو لوگ فلسفہ کی حمایت کی وجہ سے ملعون اور بے دین قرار دیئے گیے تھے، ان میں سب سے مقدم ابن رشد تھا، اور اس لیے ۱۵۱۲ء میں لیٹرن کونسل نے فیصلہ صادر فرمایا، کہ ان عقائد کا پیرو ملحد قرار دیا جائے گا، محکمۂ انکویزیشن کی داستان حقیقت میں عجیب وغریب ہے، اور اس سے عجیب تر یہ ہے کہ جن مسائل پر لوگ زندہ جلائے جاتے یا اور طریقوں سے مار ڈالے جاتے تھے، وہ سب علم ہیئت وغیرہ کے مسائل تھے، جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا،

اس واقعہ پر ہم کو مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنی چاہیئے،

(۱) یورپ جو مسلمانوں کو تعصب اور مذہبی جنون کا الزام دیتا ہے، اس کے منہ سے یہ الزام کس قدر خوشنما معلوم ہوتا ہے،

(۲) وہ یورپ جو کسی زمانہ میں اس قدر فلسفہ کا دشمن رہ چکا ہے، اور فلسفہ کے جرم میں لاکھوں آدمیوں

کو قتل کر چکا ہے، آج اس قدر فلسفہ کا حامی اور علم دوست ہے، تو ہم کو اپنے مذہبی علماء سے اس بات کی کوئی امید ہی نہیں ہے، کہ ان کو اجنبیت کی وجہ سے جو اجتناب ہے، جاتا رہے گا، وہ یورپ کے فلسفہ اور علوم جدیدہ کو اس طرح اپنے نصاب تعلیم میں داخل کریں گے جس طرح انھوں نے یونان کے علوم و فنون کو داخل کیا۔

یورپ نے جن علمی مسائل کو مذہب کے مخالف سمجھا تھا، جن پر سزائیں دی جاتی تھیں، اور لوگ قتل کیے جاتے تھے، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) زمین گول ہے، عیسائی کہتے تھے کہ مذہب کے رو سے زمین کروی نہیں ہو سکتی ؛

(۲) زمین کے سوا اور ستاروں میں بھی آبادی ہو سکتی ہے، برونو اسی جرم میں قتل کیا گیا، کہ وہ تعدد عالم کا قائل تھا،

(۳) زمین متحرک ہے، اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے، کوپرنیکس اسی مسئلہ کی بنا پر ملحد قرار دیا گیا، اور گلیلو نے چونکہ اس کی تائید کی تھی، اس لیے قید کیا گیا، اور قید خانہ ہی میں مر گیا،

(۴) روح جسم سے الگ ہونے کے بعد عقل کل میں جا کر مل جاتی ہے، اس عقیدہ کی بنا پر ہزاروں آدمی جلا وطن کیے گیے،

اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہیں، مصنف نے ان کے بیان میں اس تفصیل سے کام لیا ہے کہ گویا ان مسائل پر مستقل رسالے لکھ دیے ہیں، جس سے ان کی حقیقت اور ان کی تحقیقات کی تدریجی تاریخ معلوم ہوتی ہے،

ہم نہایت فخر اور نہایت خوشی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام نے کبھی حکماء اور فلاسفہ کو نقصان نہیں پہنچایا، فارابی، کندی، بو علی سینا، نوبخت، بہمنیار، ابن مسکویہ، بیرونی، ابوبکر رازی، خیام ہیئت حکیم اور فلسفی تھے، لیکن ان میں کسی شخص کو انکویزیشن کی عدالت میں نہیں جانا پڑا، نہ وہ زندہ جلائے گیے، نہ شکنجے میں کسے گیے، نہ ان کو کسی طرح کی تکلیف دی گئی، خلفاء اور سلاطین اسلام نے ان کا نہایت عزت و احترام کیا، وہ جہاں جاتے تھے، لوگ ان

کے لیے آنکھیں بچھاتے تھے، جہاں ان کا ذکر آتا ہے، ان کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، محدثین اور فقہاء ان کا ذکر مدحیہ الفاظ میں کرتے ہیں، اس سے زیادہ فلسفہ کی کیا عزت کی جا سکتی ہے،

لا یعرف الفضل الا ذوو لا — کمال کی قدر صاحب کمال ہی کر سکتا ہے،

(الندوہ جلد ۷ نمبر ۸، شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ)

کیا فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے؟

امام ابو حنیفہ نے فقہ کے اس دوسرے حصہ کی جس طرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اس کی جزئیات کا استقصا کیا، وہ اس زمانہ کا نہایت وسیع قانون تھا، اگرچہ اس کی تعبیر ایک عام لفظ (فقہ) سے کی جاتی ہے، لیکن درحقیقت اس میں بہت سے قوانین شامل تھے، چنانچہ آج تعلیم یافتہ دنیا میں ان ہی ابواب کے مسائل جو ترتیب دیئے گئے ہیں، وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں، مثلاً قانون معاہدہ، قانون بیع، قانون لگان و مالگذاری، تعزیرات، ضابطہ فوجداری وغیرہ وغیرہ

اسی بنا پر بعض یورپین مصنفوں کا خیال ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فقہ کی تدوین میں رومن لا یعنی رومیوں کے قانون سے بہت کچھ مدد لی، اور اس کے بہت سے مسائل اپنی فقہ میں داخل کر لیے، اس خیال کی تائید میں یہ قرائن پیش کیے جاتے ہیں،

(۱) فقہ حنفی کے بہت سے مسائل رومن لا کے مطابق ہیں،

(۲) رومن لا تمام ممالک شام میں جاری تھا، اور چونکہ مسلمانوں پر شام کی معاشرت و تمدن کا بہت کچھ اثر پڑا تھا، اس لیے قیاس غالب یہ ہے کہ علمائے اسلام نے قانونی مسائل میں بھی ان سے استفادہ کیا،

(۳) اس قدر متعدد اور وسیع قوانین جو فقہ میں شامل ہیں، ان کی توضیح بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے اور قوانین سے مدد لی گئی ہو،

اس بحث کا اصلی تصفیہ تو جب ہو سکتا ہے کہ رومن لا اور حنفی فقہ کا نہایت دقت نظر اور استقصا کے ساتھ مقابلہ کیا جائے، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جس قدر دونوں قانونوں میں تطابق ہے، وہ توارد کی حد سے متجاوز ہے یا اسی قدر ہے جتنا کہ عموماً تمام قوموں کے قوانین بہت سی باتوں میں موافق ہوا کرتے ہیں، میں اول تو رومن لا سے

واقف نہیں، اور ہوتا بھی تو اتنی فرصت کہاں نصیب کہ تمام مسائل کا مقابلہ کر سکتا، اس لیے مجھ کو اعتراف کرنا چاہیے، کہ اس موقع پر جو کچھ میں لکھوں گا، اس کا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے، وہ بھی قیاس وظن ہی سے کام لیتے ہیں، کیونکہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی منصف ایسا نہیں ملا جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کر چکا ہے،

اس امر سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ فقہ حنفی میں ایسے مسائل موجود ہیں، جو عرب اور عراق میں اسلام سے پہلے معمول بہ تھے، لیکن اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں، یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے، جو مسائل آج خاص اسلام کے مسائل خیال کیے جاتے ہیں، اور خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے، ان میں متعدد ایسے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں معمول و متداول تھے، علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں ان کی تفصیل بھی کی ہے، حضرت عمرؓ نے خراج و ٹیکس کے متعلق جو قاعدے مقرر کیے وہ عموماً وہی ہیں جو نوشیروان عادل نے اپنے زمانۂ حکومت میں وضع کیے تھے اور یہ کچھ توارد نہ تھا، بلکہ حضرت عمرؓ نے دانستہ نوشیروان کی اقتدا کی تھی، چنانچہ علامہ طبری و ابن الاثیر نے صاف الفاظ میں تشریح کی ہے،

ایک مقنن جب کسی ملک کے لیے قانون بناتا ہے، تو ان تمام احکام اور رسم ورواج کو سامنے رکھ لیتا ہے، جو اس ملک میں اس سے پہلے جاری تھے، ان میں بعض کو وہ بعینہٖ اختیار کرتا ہے، بعض میں ترمیم و اصلاح کرتا ہے، بعض کی بالکل مخالفت کرتا ہے، بے شبہہ امام ابوحنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا، لیکن اس حیثیت سے وہ رومن لا کی بہ نسبت ایران کے قانون سے زیادہ مستفید ہوئے ہوں گے، کیونکہ اوّلاً تو وہ خود فارسی النسل تھے، اور ان کی زبان مادری فارسی تھی، دوسرے ان کا وطن کوفہ تھا، اور وہ فارس کے اعمال میں داخل تھا،

غرض یہ امر بہرحال قابل تسلیم ہے کہ امام صاحب کو فقہ کی توضیح میں اُن قواعد اور رسم ورواج سے ضرور مدد ملی ہوگی جو ان ممالک میں جاری تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی استعانت سے امام صاحب کے واضع قانون ہونے کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یعنی وہ ایک مستقل واضع قانون کہے جاسکتے ہیں، یا صرف ناقل اور جامع، جہاں تک ہماری تحقیق ہے، مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے بہت کم واقفیت حاصل کی، ترجمے

کی فہرست میں ہم سیکڑوں ہزاروں کتابوں کے نام پاتے ہیں، لیکن وہ فلسفہ طب وغیرہ کی تصنیفات ہیں، قانون کی ایک کتاب کا بھی پتہ نہیں چلتا، جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو، اور اس قدر تو قطعاً ثابت ہے کہ امام صاحب نے جس زمانہ میں فقہ کی تدوین کی کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ احتمال کہ امام ابو حنیفہؒ نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا، بالکل بے اصل ہے، ملک میں رسم و رواج کی بنیاد پر جو احکام نافذ تھے اس قابل نہ تھے کہ تحریر میں آکر قانون کا لقب حاصل کر سکتے،

مختصر یہ کہ جس قدر تاریخی قرائن موجود ہیں، ان سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ امام صاحب کو روم یا فارس کی کوئی قانونی تصنیف ہاتھ آئی، جس کے نمونے پر انہوں نے فقہ کی بنیاد رکھی، اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ امام ابو حنیفہؒ سے پہلے فقہ کے مسائل جس قدر اور جس صورت میں مدون ہو چکے تھے، وہ فن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اگر فقہ کو ایک قانون مانا جائے، تو ضرور ماننا پڑے گا، کہ امام صاحب ہی اس کے مقنن اور واضع تھے، البتہ ان کو ملک کے رسم و رواج، مسائل معمول بہا، علماء کے فتاوے سے مدد ملی، لیکن یہ اسی قسم کی مدد ہے، جس سے دنیا کے اور واضعان قانون بھی بے نیاز نہ تھے، اس لیے یہ امر امام صاحب کی مقننیت کے رتبہ کو گھٹا نہیں سکتا۔

[سیرۃ النعمان حصہ دوم ص ۲۱۸ تا ۲۲۵،
تاریخ تصنیف ۵ دسمبر ۱۸۹۲ء، مطبوعہ مجتبائی دہلی]

کیا اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ہے؟

ہم نے اس خیال کو شہرتِ عام کی بنا پر لکھا تھا، لیکن تالیفِ کتاب کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ مسٹر شیلڈن ایموز (Sheldon Amos) نے جو آجکل لندن یونیورسٹی کے لا پروفیسر ہیں، اپنی کتاب رومن سول لا (Roman Civil Law) میں اس دعوے کو بڑے شدّ و مد سے ثابت کرنا چاہا ہے، اور اس پر ایک مفصل بحث کی ہے، (دیکھو کتاب مذکور ص ۴۰۶ تا ص ۴۱۵)

یورپ کی جو برتری آج تمام قوموں اور بالخصوص مسلمانوں پر حاصل ہے، اس نے یوروپین مصنفوں کے دل میں بالطبع یہ بات پیدا کر دی ہے، کہ وہ مسلمانوں کے تمام گذشتہ کارناموں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھیں، اور اگر کوئی کمال ایسا بدیہی اور نمایاں ہو، جس سے کسی طرح انکار نہ ہو سکے تو یہ دعویٰ کریں کہ وہ مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ روم و یونان و مصر وغیرہ سے ماخوذ ہے، یہی اثر ہے جس نے مسٹر شیلڈن ایموز کو اس بحث پر مجبور کیا، انھوں نے اپنے دعوے کو فقہ حنفی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عام قانون اسلام کی نسبت ان کا یہ دعویٰ ہے، ہم ان کے مضمون کو قریباً ان کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں، اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں،

وہ اپنے مضمون کو اس تمہید سے شروع کرتے ہیں، "مشرق میں دفعتًہ ایک بالکل جدید و طبعزاد

وقائم بالذات سلسلۂ قانون کا پیدا ہونا جس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے، ایک ایسی عجیب بات ہے کہ خواہ مخواہ وہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی نسبت جو دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ اس کی تاریخ [illegible] کیا ہے؟ علاوہ وہ [illegible] کے مورخانہ قیاس اس دعویٰ کے سخت مخالف ہیں"

اس کے بعد پروفیسر موصوف اس کلیہ پر بحث کر کے ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے، کہ ہر سلسلۂ قانونی کو کسی واقعی یا فرضی واضع قانون کے نام سے موسوم کر دیا کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ " اس لحاظ سے ابتداہی میں ایک قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ جو باترتیب اور مضبوط سلسلۂ قانون مسلمان فاتحوں نے تمام ممالک مفتوحہ میں جاری کیا، وہ بہ تبدیل ہیئت کوئی اعلیٰ درجہ کا مکمل رواج یافتہ سلسلۂ قانون تھا"

پروفیسر موصوف نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے شام، مصر کو فتح کیا، وہاں رومی قوانین کے متعدد مدرسے موجود تھے، بیروت میں الکزنڈر سیورس کے زمانہ سے ایک مدرسۂ قانون چلا آتا تھا، جس میں چار پروفیسر تھے۔ قیصریہ میں وکلا کی ایک جماعت رہتی تھی، اسکندریہ میں قانون کی تعلیم جاری تھی، ان واقعات کی تفصیل کے بعد پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ" اس قیاس کی نسبت کہ اسلامی قوانین پر رومی قوانین کا اثر پڑا ہے اس قدر کہنا کافی ہوگا، لیکن جس طریقہ سے کہ اسلامی فتوحات ہوئیں اور جس طرح پر مسلمان ممالک مفتوحہ میں آباد ہوئے اگر ان امور پر غور کیا جائے تو یہ قیاس یقین سے بدل جاتا ہے"

اسلامی فتوحات کے طریقہ سے پروفیسر موصوف نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے بجز جزیہ وصول کرنے کے اور کسی قسم کا تعرض نہیں کیا، لیکن جب علمی ترقی کا زمانہ آیا، تو انھوں نے غیر قوموں کے لیے قانون وضع کیے، جو خود انہی قوموں سے ماخوذ تھے،

پروفیسر موصوف کے الفاظ یہ ہیں،" نہ تو قرآن اور نہ ابتدائی خلافت کے زمانہ میں اس بات کی کچھ کوشش ہوئی کہ جو اعلیٰ قومیں عرب کے ماتحت ہوگئی تھیں، ان کی دنیوی زندگی کے پیچیدہ معاملات میں دست اندازی کی جائے نہ اس کے لیے فرصت تھی نہ دماغ، اور نہ ایسے آدمی موجود تھے جو اس خدمت کو انجام دے سکتے، جب بغداد اور اندلس کے شہروں اور قاہرہ میں امن وامان کا زمانہ آیا اور مطالعہ اور غور کا موقع ملا تو طب و ریاضیات و منطق اور علوم نفیسہ میں ترقی ہوئی جس طرح کہ ارسطو سے عربوں نے منطق سیکھی، اسی طرح جسٹ (ملاحظہ ہو)

لیو (Leo) اور ان کے یونانی شارحوں سے علم قانون اخذ کیا۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف اس خیال کی قطعیت پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں، کہ قرآن میں اس قدر کم احکام ہیں کہ ان پر ایک قانون کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی، پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن میں صرف یہ احکام ہیں، خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، تم اپنی بیبیوں کو دو دفعہ طلاق دے سکتے ہو، پھر ان کو رحمدلی یا مہربانی سے علٰحدہ کر دو، سود خوار قیامت میں آسیب زدوں کی طرح اٹھیں گے میعادی قرض کو قلمبند کر لیا کرو، اگر بیبیوں کے ساتھ انصاف کر سکو تو کئی نکاح کر سکتے ہو، لیکن چار سے زیادہ نہیں، مرد کو دو حصے ملے گا، اور عورت کو ایک لیکن صرف عورتیں ہوں تو دو، شوہر کو نصف حصہ ملے گا، مرض الموت میں وصیت کے وقت گواہوں کا ہونا ضرور ہے، سال بارہ مہینہ کا ہوتا ہے، مکاتب کو آزادی کا معاہدہ لکھ دو اگر تمہاری مرضی ہو، سزائے زنا و غیبت،

پروفیسر صاحب کے نزدیک قرآن میں صرف اسی قدر قانونی احکام مذکور ہیں، اور اس لیے ان کے نزدیک قرآن مجید ایک وسیع قانون کی بنیاد نہیں قرار پا سکتا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "جو سیدھے قواعد اوپر درج ہوئے ان میں مشکل سے رومی بنیاد کا پتہ لگ سکتا ہے، اس لحاظ سے یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے کہ جو عمارت مسلمان فقیہوں نے ایسے پرانے مصالحہ سے تیار کی، وہ قریب قریب ہر ایک موڑ پر رومی قانون کی کلیوں اور جزئیوں کو یاد دلاتی ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ مسائل مندرجہ ذیل میں (بخوف طوالت درج نہیں کیا) فقہ اسلامی اور رومی قانون بالکل یکساں ہے، اور بالآخر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سلسلۂ قانون یعنی علم فقہ در اصل رومی قانون ہے، لیکن بہ تبدیل ہیئت،

پروفیسر موصوف نے نو صفحوں میں یہ بحث لکھی ہے، ہم نے اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے لیکن کوئی ضروری بات ترک نہیں کی، بلکہ اکثر ان کے خاص فقرے لکھ دیئے ہیں، پروفیسر موصوف نے جن مقدمات کی ترتیب سے استدلال کیا ہے، وہ مختصر یوں بیان کیے جا سکتے ہیں، "قرآن مجید میں بہت کم احکام ہیں اور ان سے قانون نہیں بن سکتا"، "ممالک مفتوحہ اسلام میں رومی قانون پہلے جاری تھا"۔ مسلمانوں نے یونان و روم وغیرہ کی تصنیفات کے ترجمے کیے"، فلاں فلاں مسائل میں اسلامی فقہ اور رومی قانون متحد ہیں۔"

یہ بحث حقیقت میں نہایت مفید اور امپارٹنٹ بحث ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اصل کتاب میں بیان کیا ہے، اس معرکہ میں اس شخص کو قدم رکھنا چاہیے جو فقہ اسلام اور رومن لا دونوں سے پوری واقفیت رکھتا ہو، پروفیسر موصوف بے شبہہ رومن لا کی نسبت ہر قسم کی واقفیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں، لیکن مسائل اسلام سے متعلق ان کی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا مشکل ہے، انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں قانونی احکام صرف معدودے چند ہیں، جنکی انھوں نے تفصیل کر دی ہے، حالانکہ قرآن مجید کی آیات احکام کم و بیش پانسو ۵۰۰ ہیں، اور اگرچہ ان میں بہت سے احکام عبادات وغیرہ کے متعلق ہیں، تاہم خاص آیتیں جن میں قانونی احکام ہیں، سَو سے کم نہیں، یہ آیتیں جداگانہ جمع کر دی گئی ہیں، اور علماء نے اُن پر متعدد تفسیریں لکھی ہیں، ان تمام احکام سے واقف ہونا تو ایک طرف، پروفیسر صاحب کی وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں سے ان کو صرف ۲ دو مسئلے معلوم ہیں، تعداد طلاق و تعداد نکاح، حالانکہ قرآن مجید میں محرمات نکاح، موطوءہ اب، جمع بین الاختین، نکاح با مشرکات طلاق قبل خلوت صحیحہ و بعد خلوت اور دونوں کے احکام، خلع اور ایلا کے مسائل تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں،

وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب کو صرف شوہر کا حصہ اور یہ کہ مرد کو عورت کے دو حصہ کے برابر ملتا ہے معلوم ہے، افسوس ان کو یہ معلوم نہیں کہ وراثت کا پورا باب اجمالاً قرآن مجید میں مذکور ہے، اور خصوصاً والدین کا حصہ اور کلالہ کے احکام تو صاف صاف تصریحاً مذکور ہیں، قصاص اور دیت کے مسائل جو نہایت تفصیل سے قرآن مجید میں مذکور ہیں، اور جن میں قتل عمد اور قتل خطا اور ان کے احکام کی پوری تفصیل ہے، پروفیسر صاحب کو سرے سے معلوم نہیں، حیرت ہے کہ اس محدود واقفیت کے ساتھ پروفیسر صاحب نے اس بحث کے طے کرنے کی کیونکر جرأت کی؟

یہ تو ضمنی بحث تھی، اب ہم ان مقدمات پر توجہ کرتے ہیں جن پر پروفیسر صاحب کے استدلال کی بنا ہے، اس قدر انھوں نے تسلیم کر لیا ہے، اور واقع میں بھی صحیح ہے کہ شروع اسلام یعنی خلافت راشدہ کے اخیر زمانہ تک مسلمان غیر قوموں سے بالکل الگ رہے، اور ان کے قانون اور احکام سے کسی قسم کی واقفیت نہیں حاصل کی، اس لیے دمشق و بیروت و اسکندریہ میں اس وقت رومن لا کے جو مدرسے جاری تھے، خود بقول پروفیسر صاحب کے اسلامی فقہ پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔

اب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اسلام کے جو مسائل اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ وہ رومن لا کے موافق ہیں، وہ کس زمانہ کے ایجاد شدہ مسائل ہیں، مثلاً وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ مسائل ذیل یعنی اولاد، سلسلۂ اصولی، رشتہ داران طرفی خواہ آدھا خون ملا ہو یا کل اور ان کی اولاد، بی بی یا خاوند، مولائے غلام آزاد، یہ سب رومن لا کے موافق ہیں، اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ترکہ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا جو رومن لا کا طریقہ تھا، یعنی کل حصے یہ تھے، نصف، ربع، ثمن، ایک ثلث، دو ثلث، سدس، یہی حصے رومن لا میں بھی تھے، لیکن پروفیسر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ حصص خود قرآن مجید میں مذکور ہیں، اور قرآن مجید کی نسبت خود پروفیسر صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اس میں رومی بنیاد کا پتہ نہیں لگتا، البتہ ورثاء کے بعض افراد قرآن مجید میں مذکور نہیں، لیکن وہ زمانۂ رسالت و خلافت تک پوری طرح سے معین و مقرر ہو چکے تھے حدیث و آثار کی نہایت قدیم کتابیں آج موجود ہیں، ان کو پڑھ کر متعصب سے متعصب شخص بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا،

وصیت کے متعلق پروفیسر صاحب نے فقہ کے جن مسائل کو رومن لا سے ماخوذ سمجھا ہے، ان کی یہ تفصیل کی ہے، وصیت تقریری یا تحریری دو گواہوں کے سامنے، وصی ایک ثلث جائداد سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا، جب تک کہ ورثاء مدد راضی ہوں، لیکن یہ مسائل بھی زمانۂ نبوت یا خلافت کے مسائل ہیں، اور اسی امر سے ایک عام عربی دان بھی انکار نہیں کرسکتا، پروفیسر صاحب نے اور بھی مسائل گنائے ہیں، جو ان کی رائے میں رومن لا سے ماخوذ ہیں، ہم ان سب کی تفصیل نہیں کرسکتے، مختصراً اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان میں اکثر مسائل اسی زمانے کے ہیں، جن کی نسبت پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے، کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے قوانین واحکام سے کچھ واقفیت نہیں حاصل کی تھی،

پروفیسر صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ قرآن مجید یا حدیث میں قانونی مسائل بہت کم تھے، ان کی بنیاد پر فقہ کا اتنا بڑا دفتر کہاں سے تیار ہوگیا؟ اسی حیرت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ فقہ اسلام کو رومن لا کا خوشہ چین بتائیں، لیکن پروفیسر صاحب کس کس بات پر حیرت کریں گے، قانونی مسائل تو خیر رومن لا سے ماخوذ ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے متعلق قرآن مجید واحادیث میں کون سی بڑی تفصیل ہے، پھر فقہ میں انہی

مسائل کا ایک عظیم الشان سلسلہ کیونکر قائم ہو گیا؟ کیا یہ مسائل بھی رومن لا سے ماخوذ ہیں، اس کو جانے دو، تمام اور اسلامی علوم کیونکر پیدا ہوئے، اور اس وسعت کو کیونکر پہنچے؟ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تفسیر، حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، اسماء الرجال کے کتنے مسائل پیدا ہوئے تھے، اور آج ان کی کیا حالت ہے؟ کیا آج یہ سب علوم جداگانہ فن نہیں ہیں؟ کیا اُن سے مسلمانوں کی دقت نظر، تیزی طبع، وسعت خیال کا اندازہ نہیں ہوتا، کیا یہ علوم و فنون بھی مسلمانوں نے روم و یونان سے سیکھے؟ فقہ کے جن مسائل کو کو پروفیسر صاحب نے رومن لا سے ماخوذ بتایا ہے، وہ اس زمانہ کے مسائل ہیں جب خود بقول پروفیسر صاحب کے مسلمانوں نے غیر قوموں سے کچھ نہیں سیکھا تھا، لیکن زمانہ مابعد میں بھی فقہ نے رومن لا کا کبھی احسان نہیں اٹھایا۔

پروفیسر صاحب کا دعویٰ صحیح ہے کہ دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں مسلمانوں نے یونان و مصر سے علوم و فنون لیے، لیکن ان کو جاننا چاہیے کہ یونان و مصر کے شاگردوں کا ایک خاص گروہ تھا، بے شبہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے، اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا، (اور وہی بہت بڑا گروہ تھا) جو اپنے کمال و فضل کے زعم میں غیر قوموں کی طرف رخ بھی نہیں کرتا تھا، مجتہدین اور فقہاء اسی گروہ میں داخل ہیں، یونان و روم وغیرہ کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، ان کی نہایت مفصل فہرست ہم کو معلوم ہے، ان میں فلسفہ، طب، ہندسہ، نجوم، کیمیا، صنعت، تاریخ، لٹریچر، ناول، ہر قسم کی کتابیں ہیں، لیکن قانون کی ایک تصنیف بھی نہیں جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہاء و مجتہدین جو اسلام میں واضع قانون تھے، غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام کہتے تھے۔ کیا امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد حنبلؒ سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ مسائل فقہ کو جو ان کے نزدیک مذہب کا ایک حصہ تھا، روم و یونان سے سیکھتے؟ اگر پروفیسر صاحب کو ان ائمہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ فقہ کے تمام ابواب انہی بزرگوں کے عہد میں مرتب ہو گئے تھے، تو وہ ہرگز ایسا دعویٰ نہ کرتے۔

البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض مسائل میں رومن لا اور فقہ اسلامی متحد کیوں ہیں، لیکن اس میں

فقہ اسلام کی کوئی تخصیص نہیں، جن دو قانونوں کا گو وہ کتنے ہی بے تعلق ہوں، آپس میں مقابلہ کیا جاوے بہت سے مسائل مشترک ثابت ہوں گے، اور قدرتاً ایسا ہونا ضرور ہے، جب تمام دنیا کے آدمیوں کی ذاتی، تمدنی ملکی ضرورتیں اکثر متحد اور یکساں ہیں تو ان ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کیے جاویں گے، انکے مسائل کا مشترک ہونا کون سی تعجب کی بات ہے، شعر

دو راہ رو کہ بیک رہ روند دریک سمت
عجب نباشد اگر او فتند پے در پے

[سیرۃ النعمان حصہ دوم ص ۲۱۸ تا ۲۴۴
حاشیہ میں - ۵ ار دسمبر ۱۸۹۲ء]

فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ

پہلے حصہ میں تم فتوحات کی تفصیل پڑھ آئے ہو، تمہارے دل پر اس عہد کے مسلمانوں کے جوش، ہمت، عزم و استقلال کا قوی اثر پیدا ہوا ہوگا، لیکن اسلاف کی داستان سننے میں تم نے اس کی پروا نہ کی ہوگی کہ واقعات کو فلسفہ تاریخ کی نظر سے دیکھا جائے۔

لیکن ایک نکتہ سنج مورخ کے دل میں فوراً یہ سوالات پیدا ہوں گے، کہ چند صحرانشینوں نے کیونکر فارس و روم کا دفتر الٹ دیا؟ کیا یہ تاریخ اسلام کا کوئی مستثنیٰ واقعہ ہے؟ آخر اس کے اسباب کیا تھے؟ کیا ان واقعات کو سکندر و چنگیز کی فتوحات سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی؟ جو کچھ ہوا اس میں فرمانروائے خلافت کا کتنا حصہ تھا؟ ہم اس موقع پر انہی سوالات کا جواب دینا چاہتے ہیں، لیکن نہایت اجمال کے ساتھ پہلے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ فتوحات فاروقی کی وسعت اور اس کے حدود اربعہ کیا تھے؟

فتوحات فاروقی کی وسعت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقبوضہ ممالک کا کل رقبہ ۲۲۵۱۰۳۰ میل مربع، یعنی مکہ معظمہ سے شمال کی جانب ۱۰۳۶ - مشرق کی جانب ۱۰۸۷ - جنوب کی جانب ۴۸۳ میل تھا، مغرب کی جانب چونکہ جدہ تک حد تھی اس لیے وہ قابل ذکر نہیں۔

اس میں شام، مصر، عراق، جزیرہ، خوزستان، عراق عجم، آرمینیہ، آذربائیجان، فارس، کرمان، خراسان، اور مکران جس میں بلوچستان کا بھی کچھ حصہ آ جاتا ہے، شامل تھا، ایشیائے کوچک پر جس کو اہل عرب روم کہتے ہیں سنہ [illegible] ہجری میں حملہ ہوا تھا، لیکن وہ فتوحات کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل نہیں، یہ تمام فتوحات خاص حضرت عمرؓ کی فتوحات ہیں، اور ان کی تمام مدت دس برس سے کچھ ہی زیادہ ہے،

فتح کے اسباب یورپین مورخوں کی رائے کے موافق

پہلے سوال کا جواب یورپین مورخوں نے یہ دیا ہے کہ اس وقت فارس وروم دونوں سلطنتیں اوج اقبال سے گر چکی تھیں، فارس میں خسرو پرویز کے بعد نظام سلطنت بالکل درہم برہم ہو گیا تھا، کیونکہ کوئی لائق شخص جو حکومت کو سنبھال سکتا، موجود نہ تھا، دربار کے عمائد وارکان میں سازشیں شروع ہو گئی تھیں، اور انہی سازشوں کی بدولت تخت نشینوں میں ادل بدل ہوتا رہتا تھا، چنانچہ تین ہی چار برس کے عرصہ میں عنان حکومت چھ سات فرمانرواؤں کے ہاتھ میں آئی، اور نکل گئی، ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ نوشیروان سے کچھ پہلے مزدکیہ فرقہ کا بہت زور ہو گیا تھا جو الحاد وزندقہ کی طرف مائل تھا، نوشیروان نے گو تلوار کے ذریعہ سے اس مذہب کو دبا دیا، لیکن بالکل مٹا نہ سکا، اسلام کا قدم جب فارس میں پہنچا تو اس فرقے کے لوگوں نے مسلمانوں کو اس حیثیت سے اپنا پشت پناہ سمجھا کہ وہ کسی کے مذہب اور عقائد سے تعرض نہیں کرتے تھے، عیسائیوں میں نسطورین فرقہ جس کو اور کسی حکومت میں پناہ نہیں ملتی تھی، وہ بھی اسلام کے سایہ میں آکر مخالفوں کے ظلم وستم سے بچ گیا، اس طرح مسلمانوں کو دو بڑے فرقہ کی ہمدردی اور اعانت مفت میں ہاتھ آگئی،

روم کی سلطنت خود کمزور ہو چکی تھی، اس کے ساتھ عیسائیت کے باہمی اختلافات ان دنوں زوروں پر تھے، اور چونکہ اس وقت تک مذہب کو نظام حکومت میں دخل تھا، اس لیے اس اختلاف کا اثر مذہبی خیالات تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کی وجہ سے خود سلطنت کمزور ہوتی جاتی تھی،

یورپین مورخین کی رائے کی غلطی

یہ جواب گو واقعیت سے خالی نہیں، لیکن جس قدر واقعیت ہے، اس سے زیادہ طرز استدلال کی ملمع سازی ہے، جو یورپ کا خاص انداز ہے، بے شبہ اس وقت فارس وروم کی سلطنتیں اصلی عروج پر نہیں رہی تھیں، لیکن اس کا صرف اس قدر نتیجہ ہو سکتا تھا، کہ وہ پرزور قومی سلطنت کا مقابلہ نہ کر سکتیں نہ یہ کہ عرب جیسی بے سروسامان قوم سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہو جاتیں، روم وفارس گو کسی حالت میں تھے، تاہم فنون جنگ میں ماہر تھے، یونان میں خاص قواعد حرب پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں، اور جو اب تک موجود ہیں، رومیوں میں ایک مدت تک ان کا عملی رواج رہا، اس کے ساتھ رسد کی فراوانی، سروسامان کی بہتات، آلات جنگ کے تنوع، فوجوں کی کثرت میں کمی نہیں آئی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی ملک پر چڑھ کر جانا نہ تھا، بلکہ اپنے ملک میں، اپنے قلعوں میں، اپنے مورچوں میں رہ کر اپنے ملک کی حفاظت کرنی

تھی، مسلمانوں کے حملے سے ذرا ہی پہلے خسرو پرویز کے عہد میں جو ایران کی شوکت و شان کا عین شباب تھا، قیصر روم نے ایران پر حملہ کیا اور ہر ہر قدم پر فتوحات حاصل کرتا ہوا اصفہان تک پہنچ گیا، شام کے صوبے جو ایرانیوں نے چھین لیے تھے، واپس لے لیے اور نئے سرے سے نظم و نسق قائم کیا،

[illegible] پرویز تک تو عموماً مسلم ہے کہ سلطنت کو نہایت جاہ و جلال حاصل تھا، خسرو پرویز کی وفات سے اسلام کے حملے تک صرف تین چار برس کی مدت ہے، اتنے تھوڑے سے عرصے میں ایسی قوی اور قدیم سلطنت کہاں تک کمزور ہو سکتی تھی، البتہ تخت نشینوں کے ادل بدل سے نظام میں فرق آ گیا تھا لیکن چونکہ سلطنت کے اجزا یعنی خزانہ، فوج اور محاصل میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، اس لیے جب یزدگرد تخت نشین ہوا، اور درباریوں نے اصلاح کی طرف توجہ کی، تو فوراً نئے سرے سے وہی ٹھاٹھ قائم ہو گئے، مزدکیہ فرقہ گو ایران میں موجود تھا، لیکن ہم کو تمام تاریخ میں ان سے کسی قسم کی مدد ملنے کا حال معلوم نہیں ہوتا، اسی طرح فرقہ نسطورین کی کوئی اعانت ہم کو معلوم نہیں، عیسائیت کے اختلاف مذہب کا اثر بھی کسی واقعہ میں خود یورپین مورخوں نے کہیں نہیں بتایا،

اب عرب کی حالت دیکھو! تمام فوجیں جو مصر و ایران و روم کی جنگ میں مصروف تھیں، ان کی مجموعی تعداد کبھی ایک لاکھ تک بھی نہ پہنچی، فنون جنگ سے واقفیت کا یہ حال کہ یرموک پہلا معرکہ ہے جس میں عرب نے تعبیہ کے طرز پر صف آرائی کی، خود، زرہ، چلتہ، جوشن، بکتر، چار آئینہ، آہنی دستانے، جھلم، موزے، جو ہر ایرانی سپاہی کا لازمی ملبوس جنگ[۱] تھا، اس میں سے عربوں کے پاس صرف زرہ تھی، اور وہ بھی اکثر چمڑے کی ہوتی تھی، رکاب لوہے کے بجائے لکڑی کی تھی، آلات جنگ میں سے گرز و کمند سے عرب بالکل آشنا نہ تھے، تیر تھے لیکن ایسے چھوٹے اور کم حیثیت کہ قادسیہ کے معرکہ میں ایرانیوں نے جب پہلی پہل ان کو دیکھا تو سمجھا کہ تکلے ہیں،

فتوحات کے اصلی اسباب

ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بانی اسلام کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہو گئی تھی، اور جس کو حضرت عمرؓ نے

[۱] ابن قتیبہ نے اخبار الطوال میں لکھا ہے کہ یہ چیزیں ہر سپاہی کو استعمال کرنی پڑتی تھی،

اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا، روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں، البتہ اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں جنہوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام حکومت میں مدد دی اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راستبازی اور دیانتداری تھی، جو ملک فتح ہو جاتا تھا، وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راستبازی کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے، یرموک کے معرکے میں مسلمان جب شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا نے پکارا کہ "خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے" اور یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ "ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آسکتا"

رومیوں کی حکومت جو شام و مصر وغیرہ میں تھی، وہ بالکل جابرانہ تھی، اس لیے رومیوں نے مسلمانوں کا جو مقابلہ کیا، وہ سلطنت اور فوج کے زور سے کیا، رعایا ان کے ساتھ نہ تھی، مسلمانوں نے جب سلطنت کا زور توڑ دیا، تو آگے مطلع صاف تھا، یعنی رعایا کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی، البتہ ایران کی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں سلطنت کے نیچے بہت سے بڑے بڑے رئیس تھے، جو بڑے بڑے اضلاع اور صوبوں کے مالک تھے، وہ سلطنت کے لیے نہیں، بلکہ خود اپنی ذاتی حکومت کی حفاظت کے لیے لڑتے تھے، یہی وجہ تھی کہ پایۂ تخت کے فتح کر لینے پر بھی فارس میں ہر قدم پر مسلمانوں کو مزاحمتیں پیش آئیں، لیکن عام رعایا وہاں بھی مسلمانوں کی گرویدہ ہوتی جاتی تھی، اور اس لیے فتح کے بعد بقائے حکومت میں ان سے بہت مدد ملتی تھی،

ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کا اول اول حملہ شام و عراق پر ہوا، ان دونوں مقامات میں کثرت سے عرب آباد تھے، شام میں دمشق کا حاکم غسانی خاندان تھا، جو برائے نام قیصر کا محکوم تھا، عراق میں لخمی خاندان والے دراصل ملک کے مالک تھے، گو کسریٰ کو خراج کے طور پر کچھ دیتے تھے، ان عربوں نے اگرچہ اس وجہ سے کہ عیسائی ہو گئے تھے، اول اول مسلمانوں کا مقابلہ کیا، لیکن قومی اتحاد کا جذبہ رائگاں نہیں جا سکتا تھا، عراق کے بڑے بڑے رئیس بہت جلد مسلمان ہو گئے، اور مسلمان ہو جانے پر وہ مسلمان کے دست و بازو بن گئے، شام میں بھی آخر عربوں نے اسلام قبول کر لیا،

آگے چل کر ایک موقع پر ہم نے ان کے نام بھی تفصیل سے لکھے ہیں،

اور رومیوں کی حکومت سے آزاد ہوگئے،

سکندر اور چنگیز وغیرہ کا نام لینا یہاں بالکل بے موقع ہے۔ بے شبہ ان دونوں نے بڑی بڑی فتوحات

حاصل کیں، لیکن کیونکر؟ قہر، ظلم اور قتل عام کی بدولت چنگیز کا حال تو سب کو معلوم ہے، سکندر کی یہ

کیفیت ہے کہ جب اس نے شام کی طرف شہر سور کو فتح کیا، تو چونکہ وہاں کے لوگ دیر تک جم کر لڑے تھے، سکندر وغیرہ کی فتوحات کا موازنہ

اس لیے قتل عام کا حکم دیا، اور ایک ہزار شہریوں کے سر شہر پناہ کی دیوار پر لٹکا دیئے، اس کے ساتھ تیس

ہزار باشندوں کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ جو لوگ قدیم باشندے اور آزادی پسند تھے، ان میں ایک

شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا، اسی طرح فارس میں جب اسطخر کو فتح کیا، تو تمام مردوں کو قتل کرا دیا، اسی طرح

کی اور بھی بے رحمیاں اس کے کارناموں میں مذکور ہیں،

عام طور پر مشہور ہے کہ ظلم اور ستم سے سلطنت برباد ہو جاتی ہے، یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ظلم

کو بقا نہیں، چنانچہ سکندر اور چنگیز کی سلطنتیں بھی دیرپا نہ ہوئیں، لیکن فوری فتوحات کے لیے

اس قسم کی سفاکیاں کارگر ثابت ہوئیں، ان کی وجہ سے ملک کا ملک مرعوب ہو جاتا ہے، اور چونکہ رعایا

کا بڑا گروہ ہلاک ہو جاتا ہے، اس لیے بغاوت و فساد کا اندیشہ باقی نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ چنگیز،

بخت نصر، تیمور، نادر جتنے بڑے بڑے فاتح گذرے ہیں، سب کے سب سفاک بھی تھے،

لیکن حضرت عمرؓ کی فتوحات میں کبھی سرِمو قانون انصاف سے تجاوز نہیں ہو سکتا تھا، آدمیوں

کا قتل عام ایک طرف، درختوں کے کاٹنے کی اجازت نہ تھی، بچوں اور بوڑھوں سے بالکل تعرض نہیں

کیا جا سکتا تھا، بجز عین معرکۂ کارزار کے کوئی شخص قتل نہیں کیا جا سکتا تھا، دشمن سے کبھی کسی موقع

پہ بدعہدی یا فریب دہی نہیں کی جا سکتی تھی، افسروں کو تاکیدی احکام جاتے تھے کہ فان قاتلو کم

فلا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا[1]، یعنی دشمن، تم سے لڑائی کریں، تو ان سے فریب

نہ کرو، کسی کی ناک کان نہ کاٹو، کسی بچے کو قتل نہ کرو،

جو لوگ مطیع ہو کر باغی ہو جاتے تھے ان سے دوبارہ اقرار کر درگذر کی جاتی تھی، یہاں تک کہ

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۲۱،

جب عربسوس والے تین تین دفعہ متواتر اقرار کرکے پھر گئے، تو صرف اس قدر کیا کہ ان کو وہاں سے جلا وطن کر دیا لیکن ان کے ساتھ ان کی کل جائداد مقبوضہ کی قیمت ادا کر دی، خیبر کے یہودیوں کو سازش اور بغاوت کے جرم میں نکالا، تو ان کی مقبوضہ اراضیات کا معاوضہ دے دیا، اور اضلاع کے حکام کو احکام بھیج دیئے، کہ جدھر سے ان لوگوں کا گذر ہو ان کو ہر طرح کی اعانت دی جائے، اور جب یہ کسی شہر میں قیام اختیار کریں، تو ایک سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے،

جو لوگ فتوحات فاروقی کی حیرت انگیزی کا یہ جواب دیتے ہیں، کہ دنیا میں اور بھی ایسے فاتح گزرے ہیں، ان کو یہ دکھانا چاہیے کہ اس احتیاط، اس قید، اس پابندی، اس درگذر کے ساتھ دنیا میں کس حکمران نے ایک چپہ بھر زمین بھی فتح کی ہے،

اس کے علاوہ سکندر اور چنگیز وغیرہ خود ہر موقع اور ہر جنگ میں شریک رہتے تھے، اور خود سپہ سالار بن کر فوج کو لڑاتے تھے اس کی وجہ سے علاوہ اس کے کہ فوج کو ایک ماہر سپہ سالار ہاتھ آتا تھا، فوج کے دل قوی رہتے تھے، اور ان میں بالطبع اپنے آقا پر فدا ہو جانے کا جوش پیدا ہوتا تھا

حضرت عمرؓ تمام مدت خلافت میں ایک دفعہ بھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، فوجیں ہر جگہ کام کر رہی تھیں، البتہ ان کی باگ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں رہتی تھی،

ایک اور صریح فرق یہ ہے کہ سکندر وغیرہ کی فتوحات، گذرنے والے بادل کی طرح تھیں، کہ ایک دفعہ زور سے آیا اور نکل گیا، ان لوگوں نے جو ممالک فتح کیے، وہاں کوئی نظم حکومت نہیں قائم کیا، برخلاف اس کے فتوحات فاروقی میں یہ استواری تھی، کہ جو ممالک اس وقت فتح ہوئے، تیرہ سو[۱۳۰۰] برس گذرنے پر آج بھی اسلام کے قبضہ میں ہیں، اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہر قسم کے ملکی انتظامات وہاں قائم ہو گئے تھے،

فتوحات میں حضرت عمرؓ کا اختصاص

اخیر سوال کا جواب، عام رائے کے موافق یہ ہے کہ فتوحات میں خلیفۂ وقت کی چنداں تخصیص نہ تھی، اس وقت کے جوش اور عزم کی جو حالت تھی، وہ خود تمام فتوحات کی کفیل تھی، لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی تو آخر وہی مسلمان تھے، لیکن کیا نتیجہ ہوا؟ جوش اور

اثر بے شبہ بڑی قوت ہیں، لیکن یہ قوت اسی وقت کام دے سکتی ہیں، جب کام لینے والا بھی اسی زور و قوت کا ہو، قیاس اور استدلال کی ضرورت نہیں، واقعات اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں، فتوحات کے تفصیلی حالات پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے، کہ تمام فوج پتلی کی طرح حضرت عمرؓ کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی، اور فوج کا جو نظم و نسق تھا، وہ خاص ان کی سیاست و تدبیر کی بدولت تھا، اسی کتاب میں آگے چل کر جب تم مفصّل طور پر پڑھو گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوج کی ترتیب، فوجی مشقیں، بارکوں کی تعمیر، گھوڑوں کی پرداخت، قلعوں کی حفاظت، جاڑے اور گرمی کے لحاظ سے حملوں کی تعیین، فوج کی نقل و حرکت، پرچہ نویسی کا انتظام، افسران فوج کا انتخاب، قلعہ شکن آلات کا استعمال، یہ اور اس قسم کے امور کے متعلق کیا کیا انتظام خود ایجاد کیے، اور ان کو کس عجیب و غریب زور و قوت کے ساتھ قائم رکھا، تو تم خود فیصلہ کرو گے کہ حضرت عمرؓ کے بغیر یہ کل مطلق کام نہیں دے سکتی تھی،

عراق کی فتوحات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درحقیقت تو د سپہ سالاری کا کام کیا تھا، فوج جب مدینے سے روانہ ہوئی، تو ایک ایک منزل بلکہ راستہ تک متعین کر دیا تھا، اور اس کے موافق تحریری احکام بھیجتے رہتے تھے، فوج قادسیہ کے قریب پہنچی تو موقع کا نقشہ منگوا بھیجا، اور اس کے لحاظ سے فوج کی ترتیب اور صف آرائی کے متعلق ہدایتیں بھیجیں، جس قدر افسر جن کاموں پر مامور ہوئے تھے، اُنکے خاص حکم کے موافق مامور ہوئے تھے،

تاریخ طبری میں عراق کے واقعات کو تفصیل سے دیکھو، تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک بڑا سپہ سالار دور سے تمام فوجوں کو لڑا رہا ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، اس کے اشاروں سے ہوتا ہے،

ان تمام لڑائیوں میں جو دس برس کی مدت میں پیش آئیں، سب سے زیادہ خطرناک دو موقعے تھے، ایک نہاوند کا معرکہ جب ایرانیوں نے فارس کے صوبجات میں ہر جگہ نقیب دوڑا کر تمام ملک میں آگ لگا دی تھی، اور لاکھوں فوج مہیا کر کے مسلمانوں کی طرف بڑھ رہے تھے،

دوسرے جب قیصر روم نے جزیرہ والوں کی اعانت سے دوبارہ حمص پر چڑھائی کی تھی، ان دونوں معرکوں میں صرف حضرت عمرؓ کی حسن تدبیر تھی، جس نے ایک طرف اٹھتے ہوئے طوفان

کو دبا دیا، اور دوسری طرف ایک کوہِ گراں کے پرخچے اڑا دیے، چنانچہ ہم ان واقعات کی تفصیل پہلے حصّہ میں لکھ آئے ہیں،

ان تمام واقعات کی تفصیل کے بعد یہ دعوے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، آج تک کوئی شخص فاروق اعظمؓ کے برابر فاتح اور کشورستاں نہیں گذرا،

(سنہ ۱۸۹۹ء)

یورپ

اور

قرآن کے عدیم الصحت ہونے کا دعویٰ

لندن ٹائمز کے ایک آرٹیکل مورخہ ۲۵ را پریل ۱۹۴۱ء میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے چند ایسے نہایت قدیم اجزاء ہاتھ آگئے ہیں جو موجودہ قرآن شریف سے مختلف العبارۃ ہیں، اور جن کی صحت پر موجودہ قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو سب سے بڑا طعنہ دیا تھا، وہ اس کا شیوۂ تحریف تھا جس کی بدولت توراۃ اور انجیل ہمیشہ تغیر و تبدل کے مختلف قالب بدلتی رہیں، اور جس کی بدولت آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ یہ آسمانی صحائف صحت کے لحاظ سے زمینی کتابوں کے ساتھ بھی برابری کا دعویٰ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

دشمن کے لیے جواب کا سب سے آسان طریقہ برابر کا جواب ہے، لیکن باوجود اس کے کہ عیسائیوں نے قرآن مجید پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، یہاں تک کہ یورپ کے بہت سے مستشرقین کو قرآن مجید کے کمال بلاغت سے بھی انکار ہے، تاہم آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ موجودہ قرآن مجید کے سوا قرآن مجید کا کوئی اور بھی نسخہ ہے، جو اس قرآن سے مختلف ہے،

مذکورالصدر آرٹیکل پر ابھی کچھ لکھنا قبل از وقت ہے، اس لیے کہ اس آرٹیکل میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی پریس چند روز میں یہ مسودات شایع کرے گا، اس لیے جب تک وہ مسودات شایع نہ ہوجائیں تفصیلی طور سے اس کے متعلق بحث نہیں ہوسکتی، شایع ہونے کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ ہوسکیگا

کہ وہ مسودات کس زمانہ کے ہیں، اور ان کی صحت پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ اور اعتبار کے کیا وجوہ ہیں؟ قدامت کی کیا کیا شہادتیں ہیں؟ کس قسم کے اختلافات ہیں، ان مسودات پر عیسائیوں کا دست تصرف کہاں تک پہونچا ہے؟

تاہم جس قدر اس آرٹیکل کے متعلق ابھی سے بحث کی جاسکتی ہے، اس کے لیے سب سے پہلے اس کے مندرجہ بیانات کا خلاصہ لکھ دینا چاہیے، اور وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) جو حصص قرآن مجید کے دستیاب ہوتے ہیں، ان پر علاوہ قرآن کے اور تحریریں بھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جب سامان نوشت وخواند کمیاب تھے، تو اکثر پرانی قلمی کتابوں پر جو بے کار سمجھ لی جاتی تھیں، دوسری ضروری تحریروں کا اندراج ہو جایا کرتا تھا، اور اس طور پر ایک ہی ورق میں مختلف کتابیں موجود ہوتی تھیں، ٹائمز کی عبارت اگرچہ صاف نہیں ہے، لیکن اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کیمبرج کے مذکورہ اوراق میں تین مختلف کتابیں مختلف زمانہ کی لکھی ہوئی موجود ہیں، ان میں سب سے قدیم تحریر جیسا کہ ٹائمز سے مستنبط ہوتا ہے، پرونی وینجیلیم اور ٹرنی ریئس میری کی عبارات ہیں، جو سریانی زبان میں ہیں، دوسری عبارت جو دراصل مذکورہ بالا تحریر کے بعد اور اس کے اوپر لکھی گئی ہے، قرآن شریف کی عبارت ہے تیسری تحریر جو اس کے بعد کی ہے وہ عیسائی مقدسین کی بعض تحریروں کا اقتباس ہے، اور یہ عبارت بھی عربی زبان میں ہے، اس طور پر گویا ایک سطح پر تلے اوپر تین مختلف تحریریں موجود ہیں، جو ایک دوسرے کو کسی قدر ڈھکے ہوئے ہیں، اور اس طرح اوپر کی تحریر کی وجہ سے نیچے کی عبارت دھندلی پڑ گئی ہے،

(۲) ان مسودات کو ٹائمز ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کی ابتدا کا بتاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریر یعنی سریانی زبان کی دو کتابیں اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں،

(۳) تیسری تحریر یعنی عیسائی مقدسین کی عربی عبارت کے طرز تحریر کے متعلق عیسائی برٹش میوزیم کے ماہرین کی رائے ہے کہ وہ نویں صدی کی لکھی ہوئی ہے،

(۴) ڈاکٹر منگانا نے ثابت کیا ہے کہ اوراق مذکورہ تین یا زائد ماخذوں سے حاصل کیے گیے ہیں، جن میں سے بعض ماخذ اس وقت سے پہلے کے ہیں، جب حضرت زید بن ثابتؓ نے مروجہ نسخۂ قرآن کو ترتیب دیا تھا

۵- ڈاکٹر منگانا نے ۳۵ صفحے مطالعہ کیے ہیں، اوران میں کم از کم موجودہ قرآن سے پینتیس اختلافات پایے ہیں، اور چار ایسی آیتیں ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں، لیکن ان صفحات میں ہیں۔

۶- ڈاکٹر منگانا کے نزدیک ان صفحات کا بیشتر حصہ حضرت زیدؓ کے مرتب کردہ قرآن سے ترقی یافتہ ہے، مثلاً قرآن میں جو آیت ہے (بَارَكْنَا حَوْلَهُ) اس کے بہ جایے ان صفحات میں جو الفاظ ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے ''جب کہ حرم کے گرد ہم جھکے''۔

بیانات مذکورہ بالا میں چند امور قابل لحاظ ہیں:

۱- جن لوگوں نے یورپ کے پچھلے زمانہ کی تاریخ پڑھی ہے، اور عیسائیوں کی حیرت انگیز تصنیفات کے واقعات مطالعہ کیے ہیں، جن کی تفصیلات پروفیسر ہنری دی کاستری (فرنچ مصنف) کی کتاب میں موجود ہیں، جس کا ترجمہ عربی زبان میں مصر سے شایع ہو چکا ہے، وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی مذہبی کتاب عیسائیوں کے ہاتھ میں آ کر ہر قسم کی ناجائز کوششوں سے کہاں تک محفوظ رہ سکتی ہے، ہم نے وہ تحریریں دیکھی ہیں جن کی نسبت یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے عیسائیوں کے لیے لکھی ہیں، اور وہ بعینہٖ محفوظ ہیں، ان تحریروں کے فوٹو شایع کیے گیے ہیں، اور ان کا اصلی مخرج عیسائیوں کی قدیم خانقاہیں یا گرجا بیان کیے گیے ہیں، ان میں سے ایک تحریر بھی اصلی اور واقعی نہیں ہے، اور فن حدیث کا معمولی صاحبِ مذاق بھی ان کے جعلی ہونے کو بہ یک نظر معلوم کر سکتا ہے، تاہم یورپ کے مستشرقین ان کو صحیح اور اصلی نوشتہ خیال کرتے ہیں۔

۲- جو آیت اختلاف کے ثبوت میں پیش کی ہے، افسوس ہے کہ اصلی عبارت نقل نہیں کی ہے، بلکہ اس کا ترجمہ لکھا ہے، یعنی ''جب کہ حرم کے گرد ہم جھکے'' قرآن مجید میں جو الفاظ ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے ''جس کو ہم نے برکت دی'' اس بنا پر ڈاکٹر منگانا یہ دعوا کرتے ہیں کہ مفروضہ قرآن موجودہ قرآن سے مختلف ہے، ڈاکٹر صاحب اگر اصلی عربی عبارت نقل کرتے تو ہم آسانی سے اس کی نسبت کوئی رائے قایم کر سکتے تھے، تاہم یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید میں (بارکنا) کا جو لفظ ہے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے، قرآن مجید کے رسم خط میں (بَارَكْنَا) کا لفظ بغیر الف کے لکھا جاتا ہے، یعنی (بـرکنا) قدیم زمانہ میں قرآن مجید پر زیر و زبر مد وغیرہ نہیں ہوتے تھے، زیر و زبر کا لکھنا حجاج بن یوسف کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، اس لیے ممکن ہے

کہ کسی قدیم نسخے میں "بارکنا" کا لفظ اس طرح پر لکھا ہو کہ اس پر الف ممدودہ نہ ہو، اور اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس کو "برکنا" پڑھا ہو، جس کے معنی بیٹھنے اور لیٹنے اور جھکنے کے ہو سکتے ہیں، اور اس بنا پر بجائے برکت کے اس کا ترجمہ جھکنا کر دیا،

(۳) جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت زید بن ثابتؓ کے زمانہ سے پہلے کا ہے وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہے؟ کیا ان اوراق پر کتابت کی تاریخ لکھی ہے؟ کیا کاغذ کی کہنگی یا خط کی شان سے کتابت کا ٹھیک زمانہ متعین ہو سکتا ہے؟ کیا ڈاکٹر منگانا یا اور کوئی صاحب ان اصول ثقاہت کے معیار سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے پر آمادہ ہیں؟ ان تمام امور کو معلوم کرنے کے لیے ہمیں اوراق مذکور کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے،

قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت

اس موقع پر ہم مختصر اور سادہ طور پر قرآن کے مرتب و مدوّن ہونے کے واقعات درج کرتے ہیں جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکتی ہے کہ ڈاکٹر منگانا کی تحقیق کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے،

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا، تمام عرب میں اشعار و خطبات کی زبانی محفوظ رکھنے کا عام رواج تھا آج شعرائے جاہلیت کے بیسیوں دیوان موجود ہیں، جو بنو امیہ کے ابتدائی عہد تک مطلق قلمبند نہیں ہوئے تھے، مثلاً دیوان امرء القیس، دیوان سموئل بن عادیا، دیوان زہیر بن ابی سلمٰی، دیوان نابغہ ذبیانی، دیو علقمہ الفحل، دیوان حاتم طائی وغیرہ، یہ تمام دیوان اسلام سے پہلے کے ہیں، اور اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک درج تحریر نہیں ہوئے، لیکن سیکڑوں ہزاروں اشخاص ان کو زبانی محفوظ رکھتے تھے، اور جب قلمبند ہوئے تو اس صحت کے ساتھ قلمبند ہوئے کہ بجز شاذ مثالوں کے اختلاف نسخ کی نوبت بھی نہیں آئی، جو قومیں لکھی پڑھی نہیں ہوتیں، ان کے حافظے عموماً نہایت قوی ہوتے ہیں، عرب اس خصوصیت میں تمام قوموں سے اور بھی زیادہ ممتاز تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا، تو پہلے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں اتریں، جو لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوتے تھے، ان کا پہلا کام قرآن مجید کی نازل شدہ آیتوں اور سورتوں کا محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ کثرت سے ایسے صحابہ تھے جن کو پورا قرآن محفوظ تھا، جنگ یمامہ میں جو صحابہ شہید ہوئے ان میں ستر ایسے تھے جن کو پورا قرآن مجید یاد تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے ستر سورتیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھیں

قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا سب سے بڑھ کر ثواب کا کام ہے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں وہ شخص رتبہ میں سب سے بڑھ کر ہے جو قرآن سیکھے یا سکھلائے"، اس بنا پر ہر مسلمان نہایت اہتمام اور شوق سے قرآن مجید سیکھتا اور سکھلاتا تھا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دس برس کی عمر میں سورۂ حجرات سے لے کر اخیر قرآن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یاد کر لیا تھا،

ایک غریب شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی آپ نے دریافت فرمایا، تمہارے پاس مہر میں دینے کے لیے کیا ہے؟ انہوں نے کہا کچھ نہیں، فرمایا تم کو کچھ قرآن زبانی یاد ہے، بولے، ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا، تو یہی سورتیں بجائے مہر کے ہیں، اور میں اسی پر تمہارا نکاح پڑھائے دیتا ہوں، (صحیح بخاری میں یہ واقعہ بتفصیل مذکور ہے)

غرض عرب کی قوت حافظہ، قرآن مجید کے یاد رکھنے کی فضیلت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب وتاکید، قرآن مجید کی عبارت کی دلآویزی، تعلیم قرآن کا اہتمام، یہ سب اسباب ایسے تھے جن کی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں پورا قرآن مجید یا اس کا بڑا حصہ سیکڑوں اشخاص کو یاد تھا،

تحریر وکتابت

باایں ہمہ صرف زبانی حفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ جب قرآن مجید نازل ہوتا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو حکم دیتے تھے، اور وہ قلمبند کر لیتے تھے، کہ معظمہ میں گو لکھنے کا رواج اس وقت تک کم تھا، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے خاص مکہ میں سترہ ۱۷ شخص اس فن کے ماہر تھے، ان میں چار خلفائے راشدین بھی تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ چلے آئے اور جنگ بدر میں قریش کے چند لکھے پڑھے آدمی (جو اس وقت تک کافر تھے) گرفتار ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ مدینہ میں لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اور یہی ان کا زرِ فدیہ ہوگا، یعنی اس کے بعد رہا کر دیئے جائیں گے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو مشہور کاتب وحی تھے اسی

طریقہ سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا،

بہر حال مدینہ منورہ میں لکھنا پڑھنا عام طور پر رائج ہو گیا، یہاں تک کہ حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے عبرانی اور لاطینی زبان بھی سیکھ لی۔

اب تحریر کا اس قدر رواج ہو گیا تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ بعض صحابہ (حضرت عبداللہ بن عمروؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی قلمبند کر لیا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ تمام صحابہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایۃ ہیں لیکن بخاری میں ان کا قول مذکور ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ مجھ سے بھی زیادہ کثیر الروایہ ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ میں لکھتا نہ تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے اسی وقت لکھ بھی لیا کرتے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پورا قرآن مجید قلمبند ہو چکا تھا، البتہ کسی ایک مجموعہ میں جمع نہیں ہوا تھا، اور سورتوں میں باہم کوئی ترتیب قرار نہیں پائی تھی، لیکن ہر سورت کی تمام آیتیں مرتب قلمبند ہو چکی تھیں۔ قرآن مجید کے مدون اور مرتب ہونے کی تاریخ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب غزوۂ یمامہ میں اکثر حفاظ قرآن نے شہادت پائی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ قرآن جمع کرا دیجئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کتابت وحی کا کام کیا کرتے تھے، بلا کر یہ خدمت سپرد کی، حضرت زیدؓ نے نہایت اہتمام سے اس کام کو انجام دیا، جہاں جہاں تحریری اجزاء تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا کیے، یہاں تک کہ ہڈیوں، پتھر کے ٹکڑوں اور کھجور کے تختوں پر لکھے ہوئے اجزاء بہم پہونچائے یہ التزام کیا کہ تحریر کے ساتھ زبانی شہادت بھی لیتے تھے، یعنی وہ تحریری عبارت زبانی بھی یاد ہے یا نہیں؟ اس طرح پورا قرآن مجید مرتب ہوا، سورتوں کی ترتیب، ان کے نازل ہونے کے زمانہ کے لحاظ سے نہیں رکھی، بلکہ زیادہ تر سورتوں کے طول و مختصر ہونے کا لحاظ رکھا، یعنی بڑی پہلے رکھی گئیں، متوسط ان کے بعد، اور مختصر سب سے اخیر۔ یہ نسخہ حضرت حفصہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کے گھر میں رکھوا دیا گیا،

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قرآن مجید کی کثرت سے نقلیں شایع ہونے لگیں، تو اختلاف نسخ پیدا ہوا، اس بنا پر حضرت حفصہؓ کے مکان سے وہ نسخہ منگوا کر متعدد نقلیں کرائیں، اور اسلام کے بڑے بڑے صوبوں میں بھجوا دیں کہ تمام نسخے ان کے مطابق نقل کیے جائیں، حضرت عثمانؓ نے یہ بھی حکم دیا، جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ

جو نسخے اس نسخے کے مطابق نہ ہوں، وہ ضایع کردیے جائیں، صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق (صحیح بخاری باب جمع القرآن)

اور جو نسخے تیار ہوئے، وہ ہر افق (صدر مقامات) میں بھجوا دیے اور حکم دیا کہ ان کے سوا کسی صحیفے میں جو ملے وہ جلا دیا جائے۔

واقعاتِ مذکورہ سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

۱-قرآن مجید خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو زبانی یاد تھا۔

۲-قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہیں رہا، جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قلم بند نہ کرلیا گیا ہو۔

۳-حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کرایا وہ تحریری نوشتوں سے مرتب ہوا تھا، جس کی تصدیق ان لوگوں سے بھی کرائی جاتی تھی جو قرآن مجید کے کلاً یا جزواً حافظ تھے۔

۴-آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تمام سورتیں مرتب ہوچکی تھیں اور ان کے الگ الگ نام قایم ہوچکے تھے، البتہ سورتوں میں باہم تقدیم وتاخیر کے لحاظ سے ترتیب نہیں دی گئی تھی، یہ ترتیب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قایم کی۔

۵-جو نسخے ایسے تھے جن میں کاتبوں کی غلطی سے تغیر ہوگیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سب کو جلوا دیا۔

نتائج مذکورہ کے بعد اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منگانا جن ماخذوں کو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے کا بتاتے ہیں، ان کی صحت کے کیا دلائل پیش کرسکتے ہیں؟ جب یہ ثابت ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انتہائے تفحص، اہتمام وتلاش اور تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی متفقہ کوشش سے مدون کیا تھا، جب یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ تمام مصاحف ضائع کردیے۔ جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نسخوں کے مطابق نہ تھے۔

جب کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف ابتدا سے آج تک متواتر محفوظ چلا آیا، تو کیا ایک ڈاکٹر سنگانا کا بلادلیل استنباط تمام عظیم الشان شہادتوں کے مقابلہ میں ایک ذرہ بھی وقعت رکھتا ہے؟

ہم نے اس مضمون کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے، جب کیمبرج پریس اپنے کاغذات شایع کریگا اس وقت ہم اس کو بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا۔

(مقالات شبلی جلد اول)

مستشرقین اور سیرت نبویؐ

سیرت نبوی پر کتاب لکھنے کا ایک اہم سبب

"یورپ کے مؤرخین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کر جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی، تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہوں،

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا،" (مقدمہ سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۵)

سیرت پر یورپین تصنیفات

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی، جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو سنہ ۱۱۳۹ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوء ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جا بجا ان تصنیفات سے کام

لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑا ہے،

یورپ ایک مدت تک اسلام سے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

"عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کرسکی، اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں، منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کوئی شیو کی گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔"[1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا، اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون، یا ماقومیڈ (یعنی محامد) اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد، دعوائے الوہیت پر قائم کی، اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمد جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا،

اسپین میں جب عیسائی، مسلمانوں پر غالب آئے، اور ان کو سرقسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ کر آئے، اور اپنے بتوں کو انھوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

---

[1] محمد اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ صاحب ایم۔ اے ص ۶۳

"اپین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے، اور اس کو نہایت سخت سست کہا، اور اس کو گالیاں دیں، اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی، اور اس کو پاؤں سے روندا، اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے، اور ماہوم کو دجوان کا دوسرا دیوتا تھا، ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سوّر اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی، اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی، اور از سر نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا، تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا، کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے، اور لوہوں کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا" ایک دوسرا شاعر ریچر خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے" اس کے بعد وہ امرار کو جنگ صلیبی کے لیے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے" اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو، اور ان کو آگ میں ڈال دو، اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو"[1]

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے، (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی سترہویں صدی کے سنین وسطیٰ یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جد و جہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوتے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آ گیا، کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح

---

[1] ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بزبان عربی مطبوعہ مصر از ص ۸ تا ۱۰،

کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا ،

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی ، اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے ، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں ، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں ، وہ آج ہمارے سامنے ہیں ،

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا ، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس ( ) ، مارگولیوس ( ) ، ایڈورڈ پوکاک ( ) اور ہاٹینجر ( ) ذکر کے قابل ہیں ، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا ، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں ، جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے ، یعنی سعید بن بطریق ، اوتیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا ، اور ابو الفرج ابن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول ،

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے ، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا ، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شایع کیا ، جو ابتداے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے ، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں ،

اخیر اٹھارہویں صدی یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی ، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی ، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے ، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں ، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں ، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے ، اورنٹیل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا ، سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرق میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی ، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد

ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا، اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتبخانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا،

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت ومغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند، اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں، اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، سب سے پہلے رسک (   ) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفدا مع ترجمۂ لاطینی وحواشی پانچ جلدوں میں شایع کی، ۱۸۰۹ء میں کپتان اے متھوس (   ) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (   ) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی گوٹنگن (   ) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (   ) نے ابن ہشام کا جرمن میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمۂ فرانسیسی پروفیسر ڈی منبارڈ نے شایع کی، والہوسن (   ) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد بہ مدینہ" برلن سے شایع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن ہاوٹسما (   ) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی، ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ[۱۴] برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (   ) اور نولدکی (   ) وغیرہ نے شایع کی، اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (   ) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کرکے لیڈن سے شایع ہوتی رہی،

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی، اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام

اور سوانح نگاران پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"محمدؐ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے"[1]

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں، یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں،

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی، بی، ر (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	سنہ ۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وائٹ واعظ اوکسفورڈ	"	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر	اوائل سنہ ۱۸۰۰ء
۳	گاڈفری ہگنس ایم آر، اے، ایس	"	اپالوجی	سنہ ۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے، مولر	جرمنی	اسلام ازم	سنہ ۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی	فرانس	اسلام و قرآن	از سنہ ۱۸۳۱ء تا سنہ ۱۸۶۴ء
۶	اڈورڈ لین	انگلستان	انتخابات القرآن	سنہ ۱۸۴۳ء

[1] مارگولیتھ محمدؐ دیباچہ ص ۱۔

زمانۂ تصنیف	نام تصنیف یا مضمون	وطن	نام مصنف	نمبر
۱۸۴۵ء	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام	جرمن	ڈاکٹر ویل	۷
۱۸۴۶ء	و کتاب محمدؐ پیغمبر			
۱۸۴۶ء	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	انگلستان	کارلائل	۸
			کوسن ڈی پرسیوال	۹
۱۸۴۷ء	تاریخ عرب	فرانس		
۱۸۴۹ء	سیرت محمدؐ	انگلستان	واشنگٹن ارونگ	۱۰
۱۸۵۱ء	سیرت محمدؐ	جرمن	ڈاکٹر اسپرنگر	۱۱
۱۸۵۶ء	ترجمہ و تحشیہ واقدی	"	وان کریمر	۱۲
۱۸۵۸ء	مضمون "محمدؐ"	انگلستان	مضمون نگار نیشنل ریویو	۱۳
۱۸۶۱ء	تاریخ اسلام	ہولینڈ	ڈوزی	۱۴
۱۸۶۱ء	بزرگ ترین عرب	انگلستان	مضمون نگار نیشنل ریویو	۱۵
۱۸۶۱ء	سیرت محمد		ڈی لین	۱۶
۱۸۶۱ء	سیرت محمد	انگلستان	میور	۱۷
			برتھالمی سینٹ ہلیر	۱۸
۱۸۶۵ء	محمدؐ و قرآن	فرانس		
۱۸۶۹ء	مضامین قرآن و اسلام	جرمن	نولدکی	۱۹
"	اسلام	انگلستان	دوشیف، مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	۲۰
۱۸۶۲ء	محمدؐ	"	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	۲۱

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۲۲	جولیس چارس			
		فرانس	تاریخ بانی اسلام	سنہ ۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	سنہ ۱۸۷۵ء
۲۴	باسورتھ اسمتھ			
		″	″	″
۲۵	سیدیو	فرانس	تاریخ عرب	سنہ ۱۸۷۷ء
۲۶	دلھوس	جرمن	تبصرہ بر واقدی	سنہ ۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کرال	جرمنی	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزیہر	″	مطالعۂ اسلام	سنہ ۱۸۹۰ء
۲۹	رینان	فرانس	تاریخ مذاہب	سنہ ۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ گریم	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری			
		فرانس	اسلام پر خیالات	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بول	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۹۰۳ء
۳۳	واسٹن			
		انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	سنہ ۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیوتھ			
		″	محمدؐ	سنہ ۱۹۰۵ء
۳۵	کوئل	″	محمدؐ اور اسلام	سنہ ۱۸۹۴ء

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۳۶	پرنس کیٹانی	اٹالیہ	تاریخ جغرافیہ محمد یہ اسلام و سلاطین اسلام	جاری ہے
۳۷	میجر لیونارڈ	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ، تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں،

(۱) جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھاتے ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صاحب طرز اور انصاف پرست ہیں، کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں لیکن قلیل ما ہم،

(۲) عربی زبان اور مسلم ادب و تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ جی چاہتا ہے لکھ جاتے ہیں،

مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شایع کی ہے، اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، ہر شک سے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ گیا ہے، جس کو پڑھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جابجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز نہاں کی

نگی پردہ دری کرتا ہے،

۳، وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب، مارگولیس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں،

مارگولیوس نے مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے، اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں، ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ، اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے،

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پروفیسر رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی، جو ہماری نظر سے گذری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب تین جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے،[۱]

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں، جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں،

۱، سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت وتاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی، واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا، تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک

---

[۱] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا لیکن اس کے اقوال اکثر مصنفین نے نقل کیے ہیں، اور وہ ہماری نظر سے گذرے ہیں،

بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے غیر معتبر ہو، چنانچہ اس کی بحث گذر چکی، مصنفین سیرت سے قطع نظر سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے [illegible] ہیں، مثلاً سیف، سدی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں اس لئے عام اور معمولی واقعات [illegible] شہادت کافی ہو سکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لیے [illegible] ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیوس) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے،

۲- دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے، اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے نہ ضروری، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے، یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق، واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی،

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پرواہ نہیں کرتے، کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا، تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو، اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائے گی،

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہل یورپ، واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے،

جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، موجود ہوتی ہیں،

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں تین سو برس سے زیادہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعے سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین، اس سے معذور ہیں،

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لیے ضرور ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ خود بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے،

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ

یورپین مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ میں جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتہ پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے، اور اسکے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں،

(۲) کثرت ازدواج اور میل الی النساء، (۳) مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے،

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل، (۵) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی،

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ چینی پر نظر رکھنی چاہیے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں؟ یا نہیں؟

(سیرت النبیؐ حصہ اول ص ۶۲ تا ۶۷)

کعبہ معظمہ کی قدامت

متعصب عیسائی مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص اختراع ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا۱؎، اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں:

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي — پہلا گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا

بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (سورۂ آل عمران ع ۱۰) — وہ بکہ میں تھا۔

کتاب زبور ۸۴ آیت ۶

"وہ بکہ کی وادی میں گذرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے، برکتوں سے مورہ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے جاتے ہیں"

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بکا ہے۔ چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لیے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادیٔ بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤد نے مکہ معظمہ، اور مروہ اور قربانگاہ اسمٰعیل کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے: (حضرت

۱؎ مرگیولس اپنی کتاب میں لکھتا ہے "اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم ابتدا قرار دیا ہے لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی"، مرگیولس نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے، اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے،

داؤد خدا سے کہتے ہیں) "اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے ہوتا، اے خدا! تیرے قربان گاہ، میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہیں وہ ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں، اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں"

اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤد جس مقام کے پہونچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے، جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں،

(۱) قربان گاہ ہو،

(۲) حضرت داؤد کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کرکے جائیں،

(۳) وہ وادی بکہ کہلاتا ہو،

(۴) وہاں مقام مورۃ بھی ہو،

ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ، اور مورۃ وہی مروہ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں، یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ،

ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" میں وادی بکا پر جو آرٹکل لکھا ہے، اسکا خلاصہ یہ ہے:

"اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہوسکتی ہے:

۱۔ ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں،

۲۔ وادی افور ہے، جو یشوعا باب ۷ آیات ۲۴، ۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے،

۳۔ وادی رفائیں ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸، ۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے،

۴۔ کوہ سینا کی ایک وادی ہے،

۵۔ بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے،

(دیکھو رینان کی کتاب "حیات عیسیٰ" باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے، ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا،

ع ہماں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کی لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ میں فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے،

جدید "انسائیکلوپیڈیا" میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون ہے، وہ مرگیولس کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے،

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) میں وادی بکہ کا لفظ ہے،

لیکن مرگیولس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں،

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی داں عالم ہے، وہ لکھتا ہے[1]:

"بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ داں ماکروبہ لکھتے ہیں"

لیکن مارگیولس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں،

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھا ہے کہ:

"رومن مورخ سلیس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ "وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے، اور یہ ولادت مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے"،

اگر کعبہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا، کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے، اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے،

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بطلیموس[2] کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے:

"طول ۷۸ درجہ، عرض ۲۳ درجہ"

---

[1] جلد ۹، ص ۲۹۹، ارزاں ایڈیشن، [2] انسائیکلوپیڈیا طبع اخیر جلد ۹، ص ۲۹۹، ارزاں ایڈیشن [3] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں،

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے، تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے،

مارگیولیس نے جس بنا پر کہ مکہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ "اصابہ" میں تصریح ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی، وہ سعید یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی" لیکن مارگیولیس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین عرب نے جابجا یہ بھی تصریح کی ہے، کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارت بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لیے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔"

(سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۱۱۰ تا ۱۱۱ طبع اول)

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندان اسمٰعیل سے نہ تھے؟

"سر ولیم میور صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل کے خاندان سے نہ تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں، یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبرؐ کو اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ثابت کیا جائے، اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیل کی نسل میں سے ثابت کیے جائیں، ان کی حین حیات میں پیدا ہوتے تھے، اور اس طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامے کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے، اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے" لیکن ایک طرف سر ولیم میور کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں، دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)

(سیرۃ النبیؐ حصہ اول (حاشیہ) ص ۱۱۷)

خاندانِ رسول کو مبتذل ثابت کرنیکی کوشش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ اباً عن جدٍ معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، اس پر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس واقعہ کا شاہد ہے، لیکن مارگیولوس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو مبتذل ثابت کیا جائے۔

ان کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ایک غریب، ور ذلیل خاندان سے تھے۔"

اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کیے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں ہے، کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا،

(۲) پیغمبر کے عروج کے زمانے میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے،

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا، تو آپؐ نے اس لقب سے انکار کیا،

(۴) فتح مکہ کے دن آپؐ نے فرمایا کہ آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہوگیا، قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں: وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ وطائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا،" عظیم اور شریف دو الگ الگ لفظ ہیں قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں، بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔ دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات

کو صحیح ماننا چاہیے، کفار نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادوزدہ، شاعر سب کچھ کہا، انمیں سے کون سی بات صحیح ہے؟ بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سیّد کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو۔ مولیٰ اور سیّد خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ خیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبّارین و متکبرین مکہ ہیں، مارگولیس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کیے ہیں، جو مشہور جرمنی مستشرق ہے،

ع

یں خانہ تمام آفتاب است،

(سیرۃ النبیؐ حصہ اوّل حاشیہ ۱۸۱)

عبدالمطلب کا آنحضرتؐ کو عزیز رکھنا

"عبدالمطلب کا آنحضرتؐ کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے، لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں" یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی"، اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا" (لائف آف محمد از مارگولیوس ص ۴۵ تا ۴۶)

حضرت حمزہ کے جس قول سے استدلال کیا ہے، مارگیولس خود تسلیم کرتے ہیں، کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری میں ہے، یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے باربرداری کے لیے اونٹ خریدے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گذرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہ کے پاس گیے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہ سخت مخمور تھے، اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے

نکلے تھے۔ کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

(سیرۃ النبی حصہ اول حاشیہ ص ۱۲۷، طبع اول)

ابوطالب کی کفالت اور برتاؤ

عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب ہی کی آغوش تربیت میں دیا۔ ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے، کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے، اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے، غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک مورخ نے لکھا ہے کہ:

"ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے، اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے۔ خود قرآن مجید میں ہے، وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانۂ رسالت میں آپ اس سادہ اور پرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ (طبقات ابن سعد ص ۸۰ جلد اول)

(سیرۃ النبی حصہ اول ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

بحیرا کا مشہور واقعہ

"ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، ابوطالب اسی دستور کے تحت شام کا ارادہ کیا۔ سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابوطالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے۔ ابوطالب نے آپ کی دل شکنی گوارہ نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابوطالب بصریٰ میں پہنچے، تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا، "یہ سید المرسلین ہیں" لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیونکر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے، سب سجدے کے لیے جھک گئے،

یہ روایت مختلف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مرگیولس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں،

(حاشیہ میں) ڈریپر صاحب معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی،...... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا،...... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا، سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی، اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینے میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔

"عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اسی طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تخصیص کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا"

(اس کے بعد مصنف نے بحث چھیڑی ہے۔ (سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ طبع اول)

بحری سفر کے متعلق قیاس آرائی

"نبوت کے بعد جس سال آپ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے کہا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں!! آپ نے فرمایا "میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے" (مسند امام احمد بن حنبل ص ۲۰۶)

مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اوجاب کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے"۔ (مارگیولیس ص ۵)

درمورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈیسی (بحر بیت) کا بھی معاینہ کیا تھا لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے۔" (سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۱۳۸)

بت پرستی کا الزام

"یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی کر دی تھی، اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے،

(حاشیہ) "مسٹر مارگیولوس نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے، اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کر لیا کرتے تھے، جس کا نام عزیٰ تھا، مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام احمد بن حنبل کی روایت (جلد ۴ ص ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخدیجۃ بنت خویلد انہ	مجھ سے خدیجہؓ بنت خویلد کے ایک ہمسایہ
سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول	نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبرؐ صاحب کو حضرت
لخدیجۃ، ای خدیجۃ! واللہ لا اعبد	خدیجہ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہؓ بخدا
اللات والعزّیٰ واللہ لا اعبد	میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کرونگا
ابداً قال فتقول خدیجۃ خل	خدیجہ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے عزیٰ
اللات خل العزّیٰ، قال کانت	کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے)
صنمھم التی کانوا یعبدون	اس نے کہا کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے،
ثم یضطجعون،	جس کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر
	کر لیا کرتے تھے۔"

ایک معمولی عربی داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت انکار کرنا مذکور ہے،

مارگیولوس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا، بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے، (دیکھو مارگیولوس کی کتاب ص ۶۹ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے، لیکن (اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے"

(سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۱۴۰ تا ۱۴۱)

زمانۂ جاہلیت سے منسوب اشعار و خطبات سے استدلال

"بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعراء اور فصحاء سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے، اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعراء اور خطباء کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ محمد بن اسحاق بن یسار اس رتبہ کے شخص کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر ص ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے، کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دیدیتے تھے، کہ ان کے بارے میں اشعار کہدو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابوبکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سیکڑوں اشعار نقل کیے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے،....

..... ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگیولوس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں " قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے" ص ۷، ۲ تا ص ۴۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر نہ تھے، بلکہ جاہلیت کے خطباء، اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے، اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی"

(سیرۃ النبیؐ حصہ اوّل ص ۴۲ تا ۴۳۱ - حاشیہ)

ہجرت حبش کی وجہ

مارگیولوس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دور از نظر وجہ تلاش کرکے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ " جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے، اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لیے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا، وہ حبش ہی کا تھا، اس لیے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کرکے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کرکے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا، پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہوجائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے" یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اوّلاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف سمجھ سکتے تھے" کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں، ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے جیسا کہ

ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے۔ (بخاری باب بدء الوحی)
(سیرۃ النبیؐ حصہ اوّل ص ۱۷۵)

سفر طائف

دعوت اسلام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے، وہاں کے امراء اور ارباب اثر نے طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپ کی ہنسی اڑائیں۔ شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا۔ جب آپ ادھر سے گذرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ آپ کی جوتیاں خون میں بھر گئیں، جب آپ زخموں سے چور ہوکر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے۔ جب آپ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے، اور تالیاں بجاتے جاتے۔"

اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے، مرگیولوس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوء تدبیر میں داخل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا، اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے، جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لیے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے، تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہوسکتی تھی، لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں گیے، اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا۔

ع والفضل ما شھدت بہ الاعداء"

(حاشیہ سیرت النبیؐ حصہ اوّل صفحہ ۱۸۳)

بنو قریظہ کی جنگ احزاب میں شرکت

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی، اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"سرولیم میور صاحب ارباب سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا، ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے، وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔" لیکن قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں: وانزل الذین ظاهروهم من اهل الكتاب مظاہر سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے۔" (حاشیہ سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۳۱۹)

غزوۂ تبوک

"غزوۂ تبوک کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، سوء اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا، مارگیولس صاحب فرماتے ہیں کہ "چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے اس لیے وہ بیدل ہو گئے تھے، کہ ہم کیا لڑیں، جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے،" لیکن تا مارگیولس کا حسن ظن ہے، جب قرآن نے خود سبب بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے۔" (سیرۃ النبیؐ حصہ اول ص ۴۰۹، حاشیہ)

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

"اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجیں بھیجیں جو رات کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچکر حملہ کرتی تھیں، اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں، اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں، اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم

کیا ہے، کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر مارگولیوس نے یہ سد کیا ہے کہ" چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا، کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال اور اسباب لوٹ لایا کرتے تھے، لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرار اور کدوکاوش سے تمام واقعات بہم پہونچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا تھا جنکی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چلے گئے

(سیرۃ النبی حصہ اول ص ۴۳۵) (مطبوعہ ۱۹۱۸ء)

مذہبی انتظامات

"ایک مشہور مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ" مدینہ میں آکر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا، اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے، یہ رہ گیے تھے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکومت تسلیم کی جائے"۔ (دیکھو ولہاوسن صاحب کا آرٹیکل اسلام پر انسائیکلو پیڈیا)

اسلام کا مقصد وہ تھا، جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا	وہ لوگ جن کو ہم نے زمین میں اگر طاقت دیں
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا	تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ	حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں،

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعی مذہب بھی اور راہبر شریعت بھی،

(سیرۃ النبی حصہ دوم ص ۷۰) (مطبوعہ ۱۹۱۸ء)
